زندگی کے ساتھ ساتھ

ماہنامہ

چہارسو

راولپنڈی

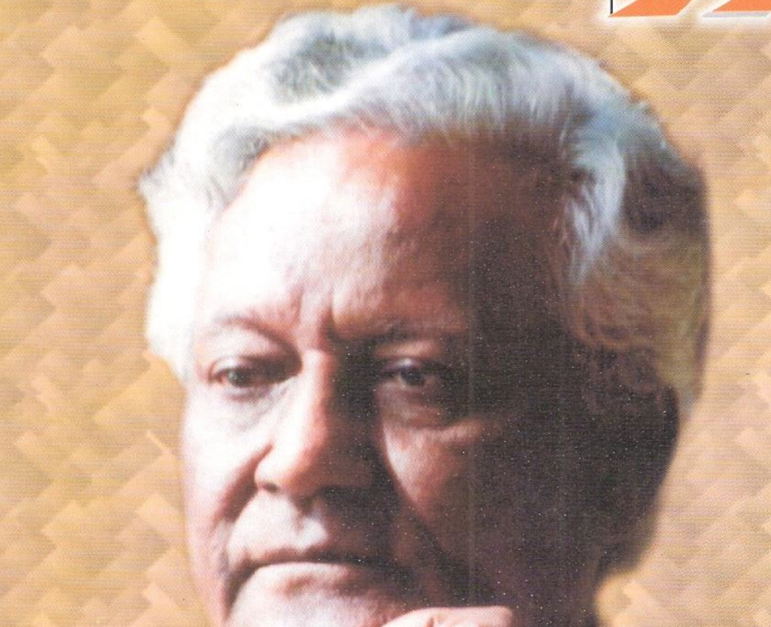

زندگی کے ساتھ ساتھ

ماہنامہ

چہارسو

راولپنڈی

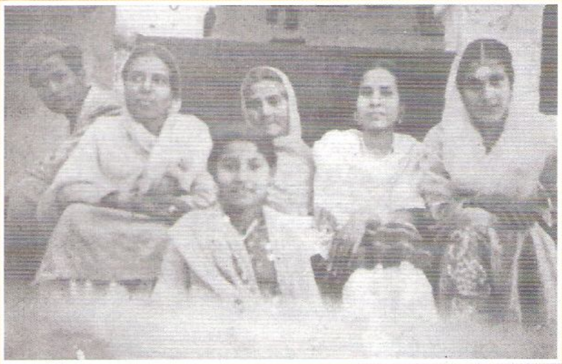

"مبین مرزا اور ناقابلِ یقین"

اردو ادب کے سبھی حلقوں میں جناب مبین مرزا کی شناخت ایک تازہ دم اور تازہ کار افسانہ نگار کے طور پر بہت مضبوط اور مستحکم ہے۔ جناب مرزا کی ادارت میں نکلنے والے جریدے "مکالمے" کی نسبت بھی اہلِ علم و ادب کے دل میں ہمیشہ اشتیاق رہا ہے مگر سال ۲۰۰۹ میں "مکالمہ" کے توسط سے جناب مبین مرزا نے ایک ایک ہزار صفحات پر مشتمل "مکالمہ" کی دو جلدوں میں اردو افسانے کی تاریخ کو جس حُسن اور سلیقگی سے مرتب و مدون کیا ہے اس کی مثال مستقبل قریب میں تلاش کرنا بہت دشوار ہے۔ "مکالمہ" کی ان دو جلدوں میں ماضی اور حال کے تمام معتبر افسانہ نگار اور جید ناقدین کے رشحاتِ قلم افسانے کی تاریخ کے امانت دار بن کر آئندہ نسلوں تک قارئین و ناقدین اور محققین کی طلب و تسکین کا سامان مہیا کرتے رہیں گے زیادہ تفصیل اور تبصرہ ہر طرح سے وقت کا ضیاع تصور کیا جائے گا۔ آپ کے اشتیاق اور جستجو کی منزل! کتاب مارکیٹ دفتر نمبر ۱۷ گلی نمبر ۳ اردو بازار کراچی ہے۔

"ساز و مضراب"

آج کے پُرآشوب اور پُرہنگام دور میں زیست کی سات دہائیاں بڑا کارنامہ تصور کیا جاتا ہے چہ جائیکہ کسی مردِ درویش کا فنی سفر اس قدر طویل عرصے پر محیط ہو اور اس کے ہاں دور دور تک تھکن کے آثار دکھلائی نہ دیتے ہوں جو آج بھی اس نوع کا شعر کہہ کر ہمارے دل و دماغ اور ضمیر کو جھنجھوڑ رہا ہو۔

سمیٹ کر سب کا درد دل میں وطن کی آواز بن گیا ہوں کبھی سمندر کا ہوں تلاطم کبھی میں امن و اماں کا ساحل

مکتبۂ سیماب کے ہونہار و ہوش مند نمائندہ جناب پی۔ ایس جین جوہر کا تازہ شعری نسخہ معہ ہندی ترجمے چار سو صفحات مجلد پر مشتمل ایسا شعری سرمایہ ہے جس میں قدیم و جدید کا سنگم بھی ہے مطالعے اور مشاہدے کا نچوڑ بھی ہے اور وقت کی بے ثباتی کی صدا بھی قاری کو کچھ اس طور اپنی جانب متوجہ کرتی ہے کہ قاری جین صاحب کے ہم آواز ہو کر پکار اٹھتا ہے۔

کون کہتا ہے کہ اشعار لکھے جاتے ہیں گنگناتے ہوئے ہو جاتے ہیں موزوں الفاظ

قیمت: دو صد پچاس روپے دستیابی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت لال کنواں دہلی بھارت۔

"کانپتی شاخیں"

جذبے کی سچائی اور فکر کی ریاضت ایک نہ ایک دن ہر بڑے فنکار کو تعارف، تعریف اور تحسین سے بے نیاز ضرور کیا کرتی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ خوش نصیبی ہمارے کم وقت اور کم عمری میں جمیل احمد عدیل کا دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے۔ ہمارے دعویٰ کی تصدیق ہمارے ہی عصر کے بلند قامت افسانہ نگار منشا یاد ان الفاظ میں کر رہے ہیں۔ "عنقا کہانی" جادوئی اسلوب کی ایک ایسی عجیب و غریب اور شاہکار کہانی ہے جس نے مجھے لطف و انبساط کے ایسے گہرے تاثر سے شرابور کیا کہ مجھے کنارے پر آنے کے لئے بہت دیر تک ہاتھ پاؤں مارنا پڑے۔ یقیناً یہ کہانی اکیلے جمیل احمد عدیل نے نہیں لکھی کوئی ایک شخص خواہ کتنا بڑا افسانہ نگار کیوں نہ ہو یہ کہانی اکیلا لکھ ہی نہیں سکتا۔ یہ کہانی ایک شاعر، ایک فلسفی، ایک سائیکاٹرسٹ اور کم از کم دو انشا پردازوں کی خدمات سے مستعار ہے" اندازہ کیجیے صرف ایک کہانی کی نسبت منشا صاحب اس قدر مشفق و مہربان نظر آ رہے ہیں اگر ہم جمیل احمد عدیل کے تازہ افسانوی مجموعے "کانپتی شاخیں" کی مکمل سات کہانیاں پڑھیں گے تو کون کون سے نئے جہاں اور زمانوں سے ہمیں سابقہ پڑے گا۔ یہ گفتگو یہاں پر ختم نہیں ہوتی، اس کا سرا ہم اور آپ مل کر ایک بار پھر سے جوڑیں گے مگر اس سے پیشتر ہمیں مبلغ دو صد پاکستانی روپے علم و عرفان پبلشرز الحمد مارکیٹ ۴۰۔ اردو بازار لاہور کی نذر کرتے ہوئے "کانپتی شاخیں" کا ایک نسخہ حاصل کرنا ہوگا۔

چہارسو

جلد ۱۸ شمارہ: نومبر دسمبر ۲۰۰۹ء

مجلسِ مشاورت

قارئینِ چہارسو

زرِ سالانہ

دلِ مضطرب کا شکریانہ

بانی مدیر اعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مدیر مسؤل

گلزار جاوید

مدیر معاونین

بینا جاوید

حافظ اشفاق الحق

"خانۂ ہستی"

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

زندہ ہوں مگر زیست کی لذت نہیں باقی
ہر چند کہ ہوں ہوش میں ہشیار نہیں ہوں

اس خانۂ ہستی سے گزر جاؤں گا بے لوث
سایہ ہوں فقط نقش بہ دیوار نہیں ہوں

افسردہ ہوں عادت سے دوا کی نہیں حاجت
غم کا مجھے یہ ضعف ہے بیمار نہیں ہوں

وہ گل ہوں خزاں نے جسے برباد کیا ہے
الجھوں کسی دامن سے میں وہ خار نہیں ہے

یا رب مجھے محفوظ رکھ اس بت کے ستم سے
میں اس کی عنایت کا طلب گار نہیں ہوں

افسردگی و جور کی کچھ حد نہیں اکبر
کافر کے مقابل میں بھی دیندار نہیں ہوں

۔ اکبر الٰہ آبادی۔

رابطہ: 537 ویسٹرج-III راولپنڈی فون: 92-51-5462495 فیکس: 5490181 ای میل: chaharsu@gmail.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسُو

سرورق کے پس ورق ـــــــ شعیب حیدر زیدی
تزئین ـــــــ عظمیٰ رشید
کمپوزنگ ـــــــ تنویر الحق

قرطاسِ اعزاز

صداقت کے علمبردار ـــــــ نور حسین انجم ۳
چراغِ حرم ـــــــ مظفر حنفی ۴
تھوڑی سی روشنی ـــــــ ڈاکٹر صبا تسنیم ۵
حساب کی لَو ـــــــ مظفر حنفی ۱۰
براہِ راست ـــــــ گلزار جاوید ۱۴
معرکۂ تنقید ـــــــ مظفر حنفی ۲۰
رقص کرتا ہے قلم ـــــــ پرویز مظفر ۲۳
سمندر کو آداب ـــــــ آلِ احمد سرور ۲۷
[illegible] اُجالا ـــــــ وزیر آغا ۲۹
بول کیسا یہ بازار ہے ـــــــ امین اشرف ۳۲
ہمارے عہد کا بادشاہ ـــــــ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی ۳۶
حصارِ جسم سے ـــــــ حنیف فوق ۳۸
مرا ہے تو بے جہت ـــــــ عدنان نعمانی ۴۰
ہر انسان پہ یہ ہے ـــــــ خوشحال زیدی ۴۲
بے دست و پا ـــــــ صفوت علی صفوت ۴۵

افسانے

دل کی آنچ میں ـــــــ مظفر حنفی ۵۰
محبت کے حق میں دعا کیجیے ـــــــ فیصل مظفر ۵۴

نقشِ شیشہ گراں

محمود الحسن، کرشن کمار، مشکور حسین یاد، جمیل یوسف، جیمن جوہری، ۶۱
ترو ابادی، عبدالاحد، عفرت زیدی، اسلم راہی، فیصل عظیم۔

انشائیے

برف باری کا ایک دن ـــــــ اختر جمال ۶۶
تیرگی کے سیلاب میں ـــــــ سلطانہ مہر ۶۹

ستون کا حُسن ـــــــ یقین احمد ۷۲
کھیل کھیل میں ـــــــ انجم جاوید ۷۵
داد رسیاں ـــــــ عراق مرزا ۷۸
کہانی خون چاہتی ہے ـــــــ گلزار جاوید ۸۲

بیاضِ نکتہ داں

ڈاکٹر خالد رحیم، غالب عرفان، ثمن راحت چغتائی، آصف ۸۴
ثاقب، کاوش پرتاپ گڑھی، خیال آفاقی، پرت پال سنگھ
بیتاب، غلام مرتضیٰ راہی، غضنفر قمر بھوپالی۔

انشائیے

جوتوں کا کورنش ـــــــ نصیر الاعظم ۸۹
کسوٹی ۲۰۰۸ ـــــــ شکیل رفیق ۹۱

[illegible]

گلفتہ ناز، رؤف خیر، عقیل شاکر، نادر جابلی، حنیف انجم مظہر ۹۲
بخاری، جواز جعفری، ملک زادہ جاوید، زیب النساء زیبی،
علی آذر، فخر رضا علی، ماہر تقیری، کرشن پرویز، ازعر ...،
قصور اقبال۔

[illegible]

تکمیلِ کم گشتہ ـــــــ طاہرہ اقبال ۹۷

نشاناتِ راہ

داغ داغ اجالا ـــــــ فیروز عالم ۱۰۲

آئینۂ فن

شاہ ولی کا چولہا ـــــــ ہارون ایمن ۱۰۹

[illegible]

ستیا پال آنند، ہارون ایمن، عبدالعزیز خالد، یوگیندر بہل، ۱۱۱
نذیر کیانی، پروین شیر، حمیرہ نوری، صابر عظیم آبادی

[illegible]

جستجو ترتیب و تدوین ـــــــ گلزار جاوید ۱۱۷

☆

صداقت کے علمبردار

انور حسین انجم

(کولکتہ، بھارت)

(ڈاکٹر مظفر حنفی سابق پروفیسر اقبال چیئر کلکتہ یونیورسٹی کے ریٹائر ہونے پر)

صبا شعر وادب کے گلستانوں میں پکار آئی
مظفر حنفی کلکتہ جب آئے تو بہار آئی

ہوئے گلزار روشن اور ہوائے مشک بار آئی
جو زنگ آلود خنجر تھے ادب کے اُن پہ دھار آئی

پڑی جب اُوس ادب پر آ گئی گلزار میں زینت
غزل الفاظ میں ڈھلنے لگے محبوب کی صورت

جو کی تنقید تو تنقید میں بھی معتبر نکلے
ہوئے کچھ نقص ظاہر اور کچھ اُس میں ہنر نکلے

جو علمی گفتگو کی اس میں پوشیدہ گہر نکلے
جنہیں تھا زعم اُنکے شعر میں بھی خار و شر نکلے

مظفر حنفی نے شعر وادب کو یوں سنوارا ہے
زمین فکر و فن پر چاند سورج کو اتارا ہے

بھری محفل میں سچی بات منہ پر بول دیتے ہیں
دیانت سے ہر اک عقدہ مظفر کھول دیتے ہیں

وہ باتوں باتوں میں ہی علمی گوہر رول دیتے ہیں
وہ میزانِ نظر پر اصل جوہر تول دیتے ہیں

صداقت کے علمبردار ہیں اُردو پہ مرتے ہیں
مظفر خود مؤدب ہیں ادب پر کام کرتے ہیں

ہوئے ستر کے لیکن لکھی ہیں اتنی کتاب اب تک
جو کی ہے خدمتِ اُردو نہیں اُسکا جواب اب تک

ضعیفی میں امنگیں ہیں نظر میں ہے شباب اب تک
تصور میں ابھرتا ہے وہی بچپن کا خواب اب تک

مظفر کی حسیں تحریر میں کتنی روانی ہے
کہیں کاغذ کی کشتی ہے کہیں بارش کا پانی ہے

غرور آتا ہے خود پر جب مظفر ساتھ ہوتے ہیں
الگ ہوتے ہیں وہ اشکوں سے ہم دامن بھگوتے ہیں

مظفر کے لئے دانشورانِ شہر روتے ہیں
کہیں کیا الوداع اُن کو کہ منہ اشکوں سے دھوتے ہیں

مظفر لائے تھے فن کی بہار انور حسین انجم
فضائے شعر بھی کیا خوش گوار انور حسین انجم

○

''چراغِ حرم''

پروفیسر مظفر حنفی

حمد

چراغِ حرم کے اجالے میں تو
برہمن کے اونچے شوالے میں تو

اِدھر قمریوں کے دلوں میں نہاں
اُدھر چاند کے گرد ہالے میں تو

امیروں کے ہر لقمۂ تر کے ساتھ
غریبوں کے سوکھے نوالے میں تو

ترا ہی غضب قحط سالی میں ہے
لگاتار ساون کے جھالے میں تو

نگاہِ تمنا میں تیری جھلک
جڑا ہے حسینوں کے بالے میں تو

تری سختیاں تودۂ سنگ میں
جوانمرد ہاتھوں کے چھالے میں تو

وہاں بے زبانوں کی آواز ہے
یہاں فلسفی کے مقالے میں تو

اِدھر خوفِ جاں بن کے بزدل کے پاس
اُدھر سر بکف ہے جیالے میں تو

○

نعت

غنچے غنچے کھلا محمد
خوشبو سا پھیلتا ہے محمد

سینے سینے مہک رہا ہے
چاند کرن موتیا محمد

کیسی اٹھلاتی پھرتی ہے
تتلی پہ لکھ دیا محمد

ریشہ ریشہ دھوپ کے نیزے
سر پہ کالی گھٹا محمد

دم گھٹنے کی کیفیت میں
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا محمد

یومِ ازل سے روزِ ابد تک
رحمت کا سلسلہ محمد

سر تا پا عصیاں پیکر ہوں
مجھ کو بھی دیکھنا محمد

مرنے کے لاکھوں حیلے ہیں
جینے کا آسرا محمد

○

''تھوڑی سی روشنی''

ڈاکٹر صبا تسنیم

(دہلی بھارت)

اصل نام:	محمد ابو المظفر	قلمی نام:	مظفر حنفی
والد:	عبدالقدوس صدیقی	والدہ:	سیدہ خاتون فاطمہ
دادا:	عبدالشکور صدیقی	دادی:	زیب النساء
نانا:	میر ولایت حسین	نانی:	سیدہ نثار فاطمہ

۱۹۳۶ء (یکم اپریل) کھنڈوا (مدھیہ پردیش) میں جنم لیا جہاں ان کے والد میونسپل اسکول میں بحیثیت استاد ملازمت تھے۔ مکان بدھوارا بازار میں تھا۔ ان سے بڑی دو بہنوں کے نام ہیں عزیزہ فاطمہ اور شفیق فاطمہ جن کی وفات ہو چکی ہے۔ چھوٹی بہن کا نام انیس فاطمہ ہے (جو کانپور میں سید بشارت حسین کو بیاہی گئی ہیں)۔

۱۹۴۰ء میں اردو اسکول کھنڈوا میں پہلی کلاس میں داخلہ۔ استاد احمد خان تھے اس زمانے کے دوستوں میں حیات خان اور اختری بیگم کے نام یاد آتے ہیں۔

۱۹۴۱ء والدہ اور تینوں بہنوں کے ساتھ ہریاں (ضلع فتح پور) منتقل ہو گئے جو ان کا ننھیال ہے۔ وہاں تیسری اور چوتھی جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ پھر گھر میں واپس آئے۔ اسکول میں استاد زوار حسین تھے تقی میاں نے کلام پاک کے چند پارے پڑھائے۔ دوستوں میں ایک نام منظر عید کا یاد رہ گیا ہے۔

۱۹۴۳ء اسوہ (فتح پور۔ یوپی) کے آبائی مکان میں خاندان کے ساتھ سکونت اختیار کی وہاں کے مڈل اسکول کی پانچویں جماعت میں داخلہ لیا۔ اساتذہ میں مولوی شبراتی اور پنڈت ستیا دان شامل تھے اور دوستوں میں معین الدین چھنو، محمود حسن، شریف الحسن، عرفان علی اور کیول سنگھ کے نام قابل ذکر ہیں۔

۱۹۴۶ء وہاں کے مڈل اسکول کی ساتویں جماعت اول درجے میں پاس کی اور بورڈ کی میرٹ لسٹ میں جگہ پائی جو اس زمانے کا اہم تعلیمی اعزاز تھا۔ بعد ازاں پھر کھنڈوا لے جائے گئے جہاں عبدالشکور ہیڈ ماسٹر نے اردو اسکول میں انھیں ابتدائی انگریزی کے درس دیے۔ قیام تایازاد بھائی سید مظہر الدین کے ہاں رہا۔

۱۹۴۷ء ایم ایم اینگلو مڈل اسکول کھنڈوا میں ساتویں کلاس میں داخلہ لیا۔ ڈیبیٹنگ سوسائٹی کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ استادوں میں احسان الحمید نے بہت ہمت افزائی کی۔ دوستوں میں حکیم قریشی، محمود فاروقی اور سلطان خاص تھے۔

۱۹۴۸ء اینگلو مڈل اسکول کا امتحان (آٹھویں کلاس) درجہ اول میں پاس کیا اور ضلع کے تمام اردو، ہندی، مراٹھی مڈل اسکولوں میں پہلی پوزیشن پائی۔ کلکٹر نائیڈو کے ہاتھوں بی پی سونی پرائز حاصل کیا اس برس سے بچوں کے لئے چھوٹے چھوٹے چٹکلوں پر مشتمل کہانیاں لکھنی شروع کیں۔

۱۹۴۹ء سبھاش ہائی اسکول کھنڈوا میں نویں جماعت میں داخلہ لیا اردو تعلیم کا سلسلہ یکسر منقطع ہو گیا لیکن اردو کتابیں پڑھنے کا شوق انتہا کو پہنچ گیا۔ نویں سے گیارہویں کلاس تک بہترین دوستوں میں رام کرشن جوشی، مدن لال سیٹھی، رضا حسن وغیرہ شامل تھے اساتذہ میں سکر گاڑے صاحب اور سودی صاحب سے زیادہ متاثر ہوئے۔

۱۹۵۲ء سکنڈری ایجوکیشن بورڈ (ناگپور) سے ہائر سکنڈری سرٹیفکیٹ امتحان سکنڈ ڈویژن میں پاس کیا مضامین تھے ہندی، انگریزی، ریاضی، جغرافیہ اور سائنس۔ ذریعہ تعلیم سراسر ہندی رہا جس سے پہلی بار سابقہ پڑا تھا اس دوران تایازاد بھائی مسلسل ان کی تعلیم کے خلاف رہے وہ انھیں اپنے بڑے کاروبار میں شریک کرنا چاہتے تھے اسی سال مظفر حنفی جامعہ اردو (علی گڑھ) کے امتحان ادیب ماہر میں درجہ اول سے کامیاب ہوئے۔

۱۹۵۳ء چونکہ مظہر الدین کا شدید اصرار تھا کہ وہ تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیں اور کاروبار سنبھالیں اس لئے مظفر حنفی کو ان کے والد صاحب نے اسوہ بلا لیا اور وہ فتح پور گورنمنٹ کالج میں انٹر سائنس میں داخل ہو گئے اسی سال ان کا پہلا افسانہ شائع ہوا۔ سال کے آخر میں انھیں ایئر فورس کے ایک مقابلہ جاتی امتحان میں شرکت کے لئے کانپور طلب کیا گیا۔ امتحان میں نمایاں کامیابی کے باوجود انھیں میڈیکل ٹسٹ میں روک لیا گیا۔ بچوں کی کتاب ''بندروں کا مشاعرہ'' چھپی۔

۱۹۵۴ء کانپور میں مقیم رہ کر ٹیوشن کرتے اور ملازمت کی تلاش میں رہے سخت تنگ دستی میں بسر ہوئی۔ شیخ اختر، امر و، خورشید احمد پرویز دوستوں میں تھے۔ ہندو پاک کے رسالوں میں زیادہ تر افسانے اور کبھی کبھار غزلیں شائع ہوتی رہیں۔ نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے ان کا پہلا ناول چھپا جو انگریزی سے ماخوذ تھا۔

۱۹۵۵ء اواخر فروری میں بھوپال چلے گئے جہاں پہنچتے ہی ان کا تمام اثاثہ چوری ہو گیا۔ اپریل میں ریاست بھوپال کے محکمہ تعلیمات میں ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ تقرر راؤ کھیڑی (ضلع سیہور) کے مڈل اسکول میں ہوا۔ قیام اپنے والد کے دوست سید باسط حسین رنج قمر کے ساتھ رہا۔ دوستوں میں بخشش عباس، بھیروں سنگھ چانک، قاضی محمود علی، آنند کرشن وغیرہ شامل تھے۔

۱۹۵۷ء جامعہ اردو کے امتحان ادیب کامل میں درجہ اول میں

کامیابی حاصل کی۔

۱۹۵۸ء: لاڈکوئی سے پلپاخاص تبادلہ کردیا گیا۔ یہ ریاست بھوپال کے رائسین ضلع کا ایک کوردہ مقام تھا۔ چند ماہ بعد جی مظہر بھائی نے انھیں باصرار کھنڈوا بلالیا۔ وہاں کاروبار میں بہت نقصان ہو رہا تھا۔ کھنڈوا میں حسن رضا، حسن بشیر، قاضی فضل علی، احمد قریشی، منشی جلیس، ناصر حسین اور دیگر احباب کے تعاون سے انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم کی اور جیتل لائبریری جاری کی۔

۱۹۵۹ء: ماہنامہ 'نئے چراغ' (کھنڈوا) جاری کیا۔ مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے اس کے چودہ شمارے منظر عام پر لائے۔ حسن بشیر اور حسن رضا وغیرہ معاون مدیر تھے۔ اس سلسلے میں دیگر اہل قلم کے ساتھ شاد عارفی سے بھی مراسلت کا سلسلہ قائم ہوا۔ اس وقت تک خود کو مظفر حنفی سہسوانی لکھتے تھے۔ ۹ نومبر ۱۹۵۹ء کو ان کی شادی کڑہ (فرآباد) کے سید محمد احمد کاظمی کی اکلوتی بیٹی عاصمہ خاتون سے ہوئی۔ خوشدامن کا نام سیدہ حشمت النساء تھا۔ اکلوتے برادر نسبتی ظہور احمد کاظمی ریٹائر ہو کر کراچی میں مقیم ہیں۔ اسی سال کھنڈوا میں اردو ہائر اسکول کے قیام کی کامیاب تحریک چلائی۔

۱۹۶۰ء: اپریل میں محکمہ جنگلات مدھیہ پردیش میں ملازمت کرلی۔ ایل ڈی او کے عہدے پر تقرر ہوا۔ سیہور میں ہیڈکوارٹر تھا۔ نیا دور تھا۔ گھنے جنگلوں میں دورے پر رہنا پڑتا تھا۔

۱۹۶۱ء: اہلیہ، والدہ، چھوٹی بہن اور بہنوئی (محمد یعقوب مرحوم) کو سیہور بلالیا۔ سیہور کے دوستوں میں نجیب رامش، ایم سی گپتا، یعقوب تسلیم قابل ذکر ہیں۔

۱۹۶۲ء: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بطور پرائیویٹ امیدوار بی اے کا امتحان پاس کیا۔ شاعری میں شاد عارفی کی شاگردی اختیار کی۔ ان کے مشورے پر نام کے ساتھ عارفی کا لاحقہ بھی شامل کیا لیکن استاد کو بعد میں دو دو اضافتیں اچھی نہیں لگیں اور ان کے مشورے پر دوبارہ صرف مظفر حنفی لکھنے لگے۔ ہسوہ کا آبائی مکان از سر نو تعمیر کرایا۔ ۵ مئی کو پہلا بیٹا فیروز پیدا ہوا۔

۱۹۶۳ء: ہسوہ سے چھوٹی بہن انجم فاطمہ کی فتح پور کے سید بشارت حسین کے ساتھ شادی کا بندوبست کیا۔ اسی برس سیہور سے ان کا تبادلہ بھوپال ہوگیا جہاں ۳ تہ خانہ اسٹریٹ میں بڑی بہن، بھانجے اشفاق، اہلیہ، خوشدامن اور فیروز کے ساتھ قیام رہا۔ اس اثنا میں کوثر چاندپوری، ختنا گوالیاری، واحد پریمی، عشرت قادری، فضل تابش، رفعت اکسٹی، تاج بھوپالی، کیف بھوپالی، شعری بھوپالی، وکیل بھوپالی وغیرہ سے مراسم اور دوستیاں بڑھیں۔

۱۹۶۴ء: ۸ فروری کو رام پور میں کسمپرسی کے عالم میں شاد عارفی کا انتقال ہوگیا جس کا بہت گہرا اثر لیا اور موصوف کے سلسلے میں تنقیدی مضامین کے مجموعے نیز ان کے کلام کی اشاعت پر کمربستہ ہوئے۔ ۵ مئی کو دوسرے بیٹے پرویز کی ولادت ہوئی۔

۱۹۶۵ء: تبادلے پر پھر سیہور گئے۔ ۲ جون کو ہسوہ میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا اور اس کے چند دن بعد سہارن پور میں خوشدامن چل بسیں۔ اسی سال ۱۳ دسمبر کو ان کا تیسرا بیٹا سہیل تولد ہوا۔ ریڈیو بھوپال پر پہلا پروگرام ملا۔ ڈاکٹر حمید شاہین، امتیاز حسین، مجیب دیوان، وجے سنگھ رنا وغیرہ سے نزدیکی تعلقات رہے۔

۱۹۶۶ء: ۲۸ مارچ کو سیہور میں ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ اس دوران بھوپالی پھاٹک پر کرایے کے مکان میں مقیم رہے۔ سال کے آخر میں یہ مکان تبدیل کرکے وزیرانی نظامت کے قریب سیوانی پورہ میں ایک بڑے مکان میں منتقل ہوگئے۔ جہاں اپنے کنبے کے ساتھ لگ بھگ ۸ برس تک مقیم رہے۔ اس اثناء میں مشتاق اقبال، منصور حسن، ڈاکٹر عبدالودود، عباس علوی اور محمود عمر کے خاندانوں سے گھریلو مراسم ہوگئے۔ میاں سلطان محمد خان سے بھی قربت رہی۔ انجمن ترقی اردو کی مقامی شاخ کے صدر اور ضلع ساہتیہ کمیٹی میں اردو کے نمائندے منتخب ہوئے۔

۱۹۶۷ء: ۲۷ جون کو چوتھے بیٹے فضیل کی ولادت ہوئی۔ شاد عارفی کے مضامین اور شعری نگارشات رسالوں سے یکجا کرکے نثر و غزلدہ مرتب اور شائع کیا۔ مختلف ادیبوں سے گذشتہ تین برسوں میں شاد مرحوم پر جو مضامین لکھوائے تھے انھیں مرتب کرکے مکتبہ شاد کے ساتھ "ایک تھا شاعر" کے نام سے نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے منظر عام پر لائے۔ شب خون کتاب گھر نے الہ آباد سے ان کی نئی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ "پانی کی زبان" شائع کیا جو ہندوستان میں جدید غزل کا پہلا مطبوعہ مجموعہ تھا۔ مرکز ادب بھوپال نے ان کے افسانوں کا مجموعہ "اینٹ کا جواب" چھاپا۔

۱۹۶۸ء: سیہور سے نزدیک تل کھیرا میں کاشت کاری کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کے ابتدائی کلام کا مجموعہ 'تیکھی غزلیں' نقش کدہ سیہور نے شائع کیا اور طویل نظم 'عکس ریز' کتاب پبلشرز لکھنؤ نے چھاپی۔

۱۹۶۹ء: اس دوران دوبارہ ان کا تبادلہ کیا گیا لیکن انھوں نے ترقی پاکر باہر جانے سے انکار کردیا۔ اب انھوں نے جنگلات کی ملازمت ترک کرنے کا ارادہ کرلیا۔ گورنمنٹ کالج سیہور میں ایل ایل بی اور حمیدیہ کالج بھوپال میں ایم اے اردو میں داخلہ۔ افسانوں کا مجموعہ "دو غنڈے" نصرت پبلشرز لکھنؤ نے شائع کیا۔ یوپی اردو اکاڈمی نے اس پر انعام دیا۔

۱۹۷۰ء: اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے ترقی۔ نقش کدہ سیہور سے ان کے افسانوں کا مجموعہ 'دیدۂ حیران' منظر عام پر آیا۔

۱۹۷۱ء: ایم اے (اردو) میں فرسٹ ڈویژن سے کامیاب۔ برکت اللہ بھوپالی یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن۔ ۳۱ اگست کو پانچویں بیٹے عرفان کی

پیدائش، رسائل سے تلاش کر کے ان کا مرتب کردہ شاد عارفی کی نظموں کا مجموعہ "شوخیٔ تحریر" نسیم بک ڈپو لکھنؤ کے وسیلے سے منظر عام پر آیا۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی نگرانی میں بھوپال یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کے لئے شاد عارفی کے فن اور شخصیت پر تحقیق کے لئے بعد کدوکاوش کے بعد رجسٹریشن ہوا۔

۱۹۷۲ء: گورنمنٹ کالج سیہور کے پچاس سے زائد امیدواروں میں تنہا مظفر حنفی ایل ایل بی فائنل کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔

۱۹۷۳ء: سال بھر میں تحقیقی مقالہ مکمل کر کے خصوصی اجازت سے یونیورسٹی میں داخل کیا۔ شاد عارفی کے رنگ میں کہی گئی غزلوں کا مجموعہ "سرِ خامہ" شائع ہوا جسے مدھیہ پردیش کی اردو اکادمی سے انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔

۱۹۷۴ء: برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی اس یونیورسٹی سے پہلی ڈاکٹریٹ۔ نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ دہلی میں اسسٹنٹ پروڈکشن افسر (اردو) کی حیثیت سے تقرر۔ ۲۲ اگست کو چھوٹا بیٹا رومی تولد ہوا اور ۲۰ دن بعد رحلت کر گیا۔ قیام کونسل کے فلیٹ (۵۱ ایم ایم آئی جی کالونی، مالویہ نگر) میں رہا۔ شعری مجموعہ "دیپک راگ" (یوپی اردو اکادمی سے انعام یافتہ) اور شاد عارفی کی غزلیں زیورِ طبع سے آراستہ۔ مجتبیٰ حسین، عبداللہ کمال، عبدالوحید، کوثر نسوی، محمود سعیدی اور ظہار وغیرہ سے قربت رہی۔

۱۹۷۵ء: حکومتِ ہند کی مالی اعانت سے ان کا مرتب کردہ کلیاتِ شاد عارفی اشاعت پذیر ہوا۔ نیشنل اکادمی نیان کے ترجمہ کردہ "گلاگ مجمع الجزائر" (انگریزی دو قسمیں) کی جلد اول شائع کی۔ NCERT کی اردو مطبوعات کی قیمتیں بہت زیادہ تھیں ان کی انتھک جدوجہد کے نتیجے میں اردو ہندی انگریزی کی کتابوں کو یکساں قیمت پر شائع کرنے کا فیصلہ ہوا۔

۱۹۷۶ء: ۱۳ فروری کو بحیثیت لکچرر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے شعبۂ اردو میں تقرر۔ علاوہ ازیں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی ڈسوی ایٹ شپ کے لئے کلیاتِ میر پر تحقیقی کام کرنے کو منتخب کیا گیا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ساتھ "وضاحتی کتابیات" پروجیکٹ کا آغاز ان کی متر جمہ کتاب "معروف نے کہا" ہوئی مالویہ نگر سے منتقل ہو کر (۳۲ ڈی ظلہ ہاؤس) جامعہ نگر میں سکونت اختیار کی۔

۱۹۷۷ء: نیشنل بک ٹرسٹ نے ان کے ترجمہ کردہ "گجراتی کے یکبابی ڈرامے" شائع کیے۔ جامعہ کی فیکلٹی آف ہیومن منٹر کے ممبر منتخب ہوئے۔ بھوپال اور مسوہ فتح پور کے کھیت اور مکان فروخت کر کے بٹلہ ہاؤس میں (مکان نمبر ۲۵۸ جوہر D-40) خریدا۔

۱۹۷۸ء: ذاتی مکان کا قبضہ ملنے پر اس میں منتقل ملنے پر اس میں منتقل ہو گئے۔ مکتبہ جامعہ نے ان کا تحقیقی مقالہ "شاد عارفی: شخصیت اور فن" شائع کیا جسے یوپی اردو اکادمی سے انعام ملا۔ مکتبہ خضر راہ کانپور سے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "نقد ریزے" منظر عام پر آیا۔ "گلاگ مجمع الجزائر" (دوسری جلد) کا ترجمہ نیشنل اکادمی نے چھاپا۔ ٹیلی ویژن پر پہلا پروگرام شہریار اور نارنگ نے انٹرویو لیا۔

۱۹۷۹ء: انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی نے کلام کا انتخاب "یم بہ یم" اپنے مخصوص اشاعتی پروگرام کے تحت چھاپا۔ اسے یوپی اور آندھرا پردیش اردو اکادمی سے انعام ملے۔

۱۹۸۰ء: وضاحتی کتابیات (با شتراک پروفیسر نارنگ) کی پہلی جلد ترقی اردو بیورو سے منظر عام پر آئی۔ بہار اردو اکادمی سے انعام حاصل کیا۔ شعری مجموعہ "طلسم حرف" الہ آباد سے شب خون کتاب گھر نے شائع کیا اسے مغربی بنگال اردو اکادمی نے انعام کا مستحق قرار دیا۔ نیشنل بک ٹرسٹ دہلی نے "اڑیا افسانے" (ترجمہ) زیورِ طبع سے آراستہ کیے۔

۱۹۸۱ء: مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی مالی معاونت سے غزلوں کا مجموعہ "عکس ریز" جامِ جم شائع ہوا جسے یوپی اردو اکادمی، بہار اردو اکادمی (گیا) اور کل ہند میر اکادمی (لکھنؤ) نے انعامات سے نوازا۔ "بیداری" (ترجمہ ناول) نیشنل بک ٹرسٹ (دہلی) نے چھاپا اور مغربی بنگال اردو اکادمی نے اس پر انعام دیا۔ "گلاگ مجمع الجزائر" (جلد سوم) شائع ہوئی اور اس نے بہار اردو اکادمی سے انعام پایا۔

۱۹۸۲ء: تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ "جہات و جستجو" شائع ہوا جسے مغربی بنگال اردو اکادمی نے اس پر انعام دیا۔ "گلاگ مجمع الجزائر" (جلد سوم) شائع ہوئی اور اس نے بہار اردو اکادمی سے انعام پایا۔

۱۹۸۲ء: تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ "جہات و جستجو" شائع ہوا جسے مغربی بنگال اردو اکادمی سے انعام دیا گیا۔ ۱۰ مئی کو ان کے ہاں پہلی بچی (صبا تسنیم) تولد ہوئی۔

۱۹۸۳ء: مکتبہ جامعہ نے ان کی قلم بند کردہ بچوں کی کہانیوں کا مجموعہ "بندر کا ہیرا" شائع کیا (بعد ازاں اس کے متعدد ایڈیشن چھپے) دہلی، بہار اور یوپی کی اردو اکادمیوں نے انعامات دیئے۔

۱۹۸۴ء: فروری میں شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ریڈر ہو گئے۔ "وضاحتی کتابیات" (جلد دوم) ترقی اردو بیورو سے شائع ہوئی اور مغربی بنگال اردو اکادمی سے انعام حاصل کیا۔ ساہتیہ اکادمی دہلی نے بھارتیندو ہریش چندر کا ترجمہ چھاپا۔ مجیب رضوی کو "مظفر حنفی: حیات، شخصیت اور کارنامے" (تحقیقی مقالے) پر آگرہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔

۱۹۸۵ء: ان کے اور دیگر اہلِ قلم کے تبصروں پر مشتمل ان ہی کا مرتب کردہ مجموعہ "جائزے" مکتبہ جامعہ اردو دہلی نے چھاپا اور "جدیدیت: تجزیہ و تفہیم" (مرتبہ) نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کی۔ نیشنل کونسل آف چائلڈ ایجوکیشن

دہلی نے اردو ملی تعلیم میں سے انھیں قومی ایوارڈ کا مستحق قرار دیا۔

۱۹۸۶ء: مکتبہ جامعہ سے پروہ سخن کا (مجموعہ کلام) کی اشاعت
یوپی اور دہلی اردو اکادمی سے اس پر سال کی بہترین کتاب کا انعام ۱۲ اگست کو
منجھلے بہنوئی (محمد یعقوب) کا انتقال۔

۱۹۸۷ء: دہلی اردو اکادمی کی اعانت سے مجموعہ مضامین "تنقیدی
ابعاد" کی اشاعت۔

۱۹۸۸ء: بڑے بیٹے فیروز کی شادی چھوٹی بہن کی بیٹی صدف گلزار
کے ساتھ ۹ جون کو ہوئی۔ ساہتیہ اکادمی (دہلی) سے منظم چندر چٹر جی (ترجمہ)
اشاعت پذیر۔ جامعہ اسلامیہ نے ان کی نگرانی میں قلم بند کردہ تحقیقی مقالوں پر شخ
فیروز زیدی اور خوش حال زیدی کو ڈاکٹریت تفویض کی۔ (آگے چل کر اسی
یونیورسٹی سے خالد محمود اور ممتاز الحق نے ان کی رہنمائی میں تحقیقی مقالے لکھے اور
پی ایچ ڈی کی اسناد حاصل کیں) جامعہ ملیہ میں ملازمت کے دوران گوپی چند
نارنگ، حنوان چشتی، شمیم حنفی، مظفر مہدی وغیرہ کے ساتھ قریبی تعلقات۔ مغربی
بنگال اردو اکادمی نے مجموعی خدمات کے اعتراف میں کل ہند پرویز شاہدی
ایوارڈ سے نوازا۔

۱۹۸۹ء: جون میں کلکتہ یونیورسٹی کی پیش کش پر ستمبر میں اقبال چیئر
پر بحیثیت پروفیسر تقرر قبول کر کے کلکتہ منتقل ہو گئے۔ ماصرہ، مظفر، صبا اور فضیل
ساتھ آئے۔ یونیورسٹی کے کا نگرا کا جی میں واقع فلیٹ میں سکونت، کلکتہ یونیورسٹی
کی فیکلٹی آف آرٹس اینڈ کامرس کے ممبر اور کل ہند انجمن اساتذہ اردو جامعات
ہند کے پریسیڈیم کے رکن مقرر ہوئے۔ کلکتہ دوردرشن سے (سورما کا لیا ہوا)
انٹرویو ٹیلی کاسٹ ہوا۔ "انشا" (کلکتہ) میں گوشۂ مظفر حنفی چھپا۔

۱۹۹۰ء: دہلی اردو اکادمی سے "آزادی کے بعد اردو طنز و مزاح
(مرتبہ) منظر عام پر آئی۔ مغربی بنگال اردو اکادمی سے انعام ملا۔ نیشنل بک
ٹرسٹ انڈیا نے حسرت موہانی پر مونوگراف چھاپا جس نے دہلی اردو اکادمی
سے پہلا انعام حاصل کیا۔ (کئی زبانوں میں ترجمہ)

۱۹۹۱ء: اردو اکادمی (دہلی) نے غزلیات میر حسن۔ انتخاب
ومقدمہ" شائع کیا۔ مغربی بنگال اردو اکادمی کی جنرل کونسل اور گورننگ باڈی کے
رکن کی حیثیت سے نامزدگی۔ موڈرن پبلشنگ ہاؤس (دہلی) سے "شاد عارفی:
ایک مطالعہ" منظر عام پر آئی۔

۱۹۹۲ء: فخرالدین علی احمد کمیٹی کی مالی اعانت سے "ادبی فیچر اور
تقریریں" کی اشاعت۔ ۲۴ ستمبر کو بڑی بہن شفیق فاطمہ کی رحلت۔ دوردرشن
سری نگر سے سوانح اور فن پر خصوصی فیچر۔

۱۹۹۳ء: فروری میں پرویز مظفر بغرض ملازمت برطانیہ چلا گیا۔
انجمن روح ادب (الہ آباد) کی فرمائش پر ۱۹۳ شعراء کے کلام پر مشتمل اردو غزل
کا پچاس سالہ انتخاب "روحِ غزل" مرتب کیا۔ شعبۂ اردو کلکتہ یونیورسٹی کے صدر
مقرر ہوئے۔

۱۹۹۴ء: فخرالدین علی احمد کمیٹی کے تعاون سے مجموعۂ مضامین
"باتیں ادب کی" شائع کیا۔ بہار اردو اکادمی سے انعام پایا۔ ۲۸ جون کو فضیل کی
شادی بڑی بہن کی بیٹی زرین کے ساتھ کی۔ پی ایچ ڈی کمیٹی (اردو) کے کنوینر
مقرر ہوئے۔

۱۹۹۵ء: بڑی بہن عزیزہ فاطمہ ۲۷ جون کو بھوپال میں وفات
پا گئیں۔ اوراق (لاہور) میں فن اور سوانح حیات پر خصوصی گوشہ چھپا۔ جاوید
ورشد نے ان کی نگرانی میں تیار کردہ مقالے پر کلکتہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریت
حاصل کی۔ کلکتہ ریڈیو اسٹیشن کی پروگرام ایڈوائزری کمیٹی کے رکن نامزد ہوئے۔

۱۹۹۶ء: یکم اپریل کو رٹائرمنٹ کے بعد کلکتہ یونیورسٹی سے
مزید پانچ برس کے لئے ملازمت میں توسیع (Re-employment)
انٹرنیشنل فرینڈ شپ اینڈ فریٹرنٹی ایوارڈ، قومی کونسل برائے فروغ اردو دہلی نے
وضاحتی کتابیات (جلد سوم) شائع کی۔ یوپی اردو اکادمی سے انعام ملا، ساہتیہ
اکادمی دہلی نے محمد حسین آزاد (مونوگراف) چھاپا۔ مغربی بنگال اردو اکادمی
سے انعام پایا۔

۱۹۹۷ء: دسویں شعری مجموعہ "یا اخی" شائع ہوا۔ صبا اور ماصرہ کے
ساتھ انگلینڈ گئے۔ ۲۱ جون کو پرویز کی شادی برمنگھم میں نسرین اختر کے ساتھ کی۔
لندن یونیورسٹی میں اعزاز۔ بی بی سی سے انٹرویو نشر ہوا۔ صدا نے ماہر اقبالیات (لوح
طلائی) پیش کی۔ ہندوستان آ کر فضیل کی شادی سیہور (بھوپال) میں بڑی بہت دوتی
شہوار کے ساتھ کی۔ آزادی کی پچاس سالہ تقریبات کے دوران لاوڈ وے ماہ پرویم
لمیٹیڈ کے خصوصی انعام سے سرفراز۔ دہلی دوردرشن سے سوانح اور انٹرویو ٹیلی
کاسٹ ا کاش وانی دہلی کے ایکسٹرنل ڈویژن سے انٹرویو نشر ہوا۔

۱۹۹۸ء: "چل چنبیلی باغ میں" (سفرنامہ برطانیہ) اور کلیات ساغر
نظامی (تین جلدیں) منظر عام پر آئیں۔ کلکتہ میں سالک لکھنوی، سورما، اعزاز
افضل، خواجہ یوسف، حسین رشید، علقمہ شبلی، ناظم سلطان پوری، شہود عالم آفاقی، انجم
عظیم آبادی وغیرہ سے مراسم جوش ملیح آبادی ایوارڈ لندن میں ملا۔

۱۹۹۹ء: مغربی بنگال اردو اکادمی نے "چل چنبیلی باغ میں" پر انعام
دیا۔ "مظفر حنفی۔ ایک مطالعہ" کتاب شائع ہوئی۔ ایم پی اردو اکادمی نے سراج
میر خاں سحر صوبائی اعزاز دیا۔ (سہ ماہی "ترسیل" بمبئی) میں گوشۂ مظفر حنفی شائع ہوا۔

۲۰۰۰ء: این بی ٹی سے حسرت موہانی کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔
وضاحتی کتابیات کی تمام جلدیں تیار کر کے NCPUL کے حوالے کیں
"شاد عارفی اور فن اور فن کار" شائع ہوئی۔

۲۰۰۱ء: ۱۰ ستمبر کو کلکتہ سے دہلی منتقلی۔ تمام کتابیں اور رسائل اردو

اکاڈمی مغربی بنگال اور دیگر اداروں کو دیے۔ دہلی میں مکان کی توسیع اور دھوج (ہریانہ) میں مرغی فارم شروع کیا۔ ''ہاتھ اوپر کیے'' ''کاک پیٹ کے کبوتر'' اور ''پرچم گرد باد'' شائع ہوئے۔ دہلی اردو اکاڈمی کا شاد عارفی۔فن اور فنکار پر انعام بہار اردو اکاڈمی نے محمد حسین آزاد پر انعام دیا۔

۲۰۰۲ء وضاحتی کلیات کے ۸ دفتر شائع ہوئے۔ ان کی نگرانی میں کام کرنے والے ریسرچ اسکالروں شکیل اختر، شکیل احمد خان، نصرت جہاں، رخسانہ سرور، اقبال عاقل، وہاب پردیسی اور نعیم عالم کو کلکتہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں تفویض ہوئیں۔ ہندی اکاڈمی دہلی کی اعانت سے ہندی میں منظر کی غزلیں شائع ہوئیں۔ عرفان منظر (چھوٹے بیٹے) کی خورشید عالم کے ساتھ شادی ہوئی۔

۲۰۰۳ء دہلی اردو اکاڈمی کا شعری خدمات پر ریاستی انعام۔ حیدرآباد، کلکتہ اور ناگپور کے مشاعروں اور سیمیناروں میں شرکت کی۔ اقبال ادبی مرکز بھوپال میں خطبہ دیا۔ این بی ٹی سے حسرت موہانی کا انگریزی ایڈیشن شائع ہوا۔

۲۰۰۴ء جولائی۔اگست میں پاکستان کا سفر کیا۔ کراچی اور لاہور میں تقریباً ۲۲ استقبالیہ جلسے ہوئے۔ ڈھائی ماہ قیام کرنے کے بعد واپسی ہوئی۔ وہاں کی یونیورسٹیوں، انجمن ترقی اردو، کراچی پریس کلب، انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں تقریریں۔ بارہ معروف اخبارات و رسائل میں انٹرویو چھپے۔ NCPUL سے وضاحتی کلیات کے ۵ مزید دفتر شائع ہوئے۔ جموں کشمیر اکاڈمی کے مشاعرے میں صدارت کی۔ ای ٹی وی اردو لکھنؤ کے مشاعرے کے صدارت کی۔ لکھنؤ، ناگپور، بھوپال، کلکتہ کے مشاعرے اور سیمیناروں کی صدارت، دہلی اردو اکاڈمی کے جلسے کی صدارت۔ اجین میں مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی کے سیمینار میں خطبہ صدارت۔ ایم پی اردو اکاڈمی بھوپال نے ''آگ معروف'' ہے شعری مجموعہ شائع کیا۔

۲۰۰۵ء بچوں کی شاعری کا مجموعہ ''کھیل کھیل میں'' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (دہلی) کی مالی اعانت سے شائع ہوا۔ میرٹھ یونیورسٹی میں امتیاز علی عرشی سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ پیش کیا اور اعجاز علی عرشی کے شعری مجموعے کی رسم اجرا انجام دی۔ ہریانہ اردو اکاڈمی (چنڈی گڑھ) کے ساحر لدھیانوی سیمینار کے افتتاحی اجلاس اور مشاعرے کے صدارت کی۔ بھارت بھون (بھوپال) میں اردو شاعروں کی نمائندگی۔ ہندوستانی سفارت خانہ کی دعوت پر جدہ، مدینہ منورہ اور ریاض میں مشاعروں اور سیمینار میں شرکت۔ دوبارہ عمرے کی سعادت نصیب ہوئی۔ دسمبر میں بیٹی صبا تسنیم کی شادی نجیب آباد کے ڈاکٹر خالد احمد سے ہوئی (جو دہلی میں ہی پریکٹس کرتے ہیں)۔

۲۰۰۶ء عالمی مشاعرہ کراچی، حیدرآباد، سندھ اور پاکستان میں دس بارہ دوسرے بڑے مشاعروں میں شرکت۔ گورنر سندھ، وزیر اعلیٰ حکومت سندھ اور ناظم اعلیٰ کراچی وغیرہ نے اعزازات تفویض کیے۔ برلن (جرمنی) میں ہر شگاں کے منظر حنفی نمبر کی رسم اجرا، فروغ اردو میں توسیعی خطبہ پیش کیا اور بین الاقوامی مشاعرے کی صدارت کی۔ انجمن فروغ اردو لندن (برطانیہ) کے عالمی مشاعرے کی صدارت کی۔ لیور پول (برطانیہ) لاؤن (یوکے) برمنگھم وغیرہ کے مشاعروں میں صدارت۔ برمنگھم کی کانفرنس میں مشاعرے کی صدارت اور سیمینار میں پرچہ پڑھا اور مشاعرے میں ہندو پیجابیت سے متعلق شاعری۔ بچوں کی نظموں کے مجموعے ''کھیل کھیل میں'' کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ جبیل دمام (سعودی عرب) کے مشاعروں کے صدارت کی۔ وضاحتی کلیات، اور ''آگ معروف ہے'' پر اکاڈمیوں کے انعام۔

۲۰۰۷ء ماڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی نے انٹرویوز کا مجموعہ ''منظر حنفی: سوالوں کے حصار میں'' اور مجموعہ مضامین ''ہندوستان اردو میں'' شائع کیے۔ دوحہ (قطر) میں مجلس اردو کے بین الاقوامی مشاعرے کی صدارت کی۔ دوبئی (متحدہ عرب امارات) میں بزم انجمن اردو، اردو آئیڈیا لٹ کامور انٹرنیشنل ریڈرس فورم کے مشاعروں میں صدارت اور توسیعی خطبات۔ ''کھیل کھیل میں'' اور ''آگ معروف ہے'' پر مغربی بنگال اور بہار اردو اکاڈمی کے انعام۔ عبداللہ ویمن کالج علی گڑھ کے صد سالہ جشن پر منعقدہ مشاعرے کی صدارت۔ گورنمنٹ کالج مالیر کوٹلہ میں قرۃ العین حیدر پر توسیعی خطبہ اور پنجابی ویلفیئر سوسائٹی مالیر کوٹلہ کے مشاعرے کی صدارت۔ چنڈی گڑھ میں ہند و پاک سارک ادبی تقریبات میں مشاعرے میں شرکت۔ ہندوستانی بھاشا سمیتی کے بین لسانی مشاعرے میں اردو کی نمائندگی۔ جل گاؤں کی مجروح میموریل سوسائٹی کے مشاعرے میں مہمان خصوصی۔ بچوں کی کتابیں 'نیلا امبر'، 'بندروں کا مشاعرہ' 'تخت' سے عمری کے گیت شائع ہوئیں۔

۲۰۰۸ء پٹیالہ یونیورسٹی کے سیمینار کے سیشن کی صدارت اور خطبہ۔ مشاعرے میں شرکت۔ ایم اے ٹیلی ویژن برطانیہ کے روبرو پروگرام میں فیضان عارف نے فون پر انٹرویو لیا۔ اقبال کلب شولا پور کے کل ہند اردو کانفرنس کے سیمینار میں اجلاس کی صدارت، خطبہ اور مشاعرے میں شرکت۔ مولانا آزاد کالج کلکتہ کے میر تقی سیمینار میں اجلاس کی صدارت اور خطبہ، یادِ وحشت مشاعرے کی صدارت۔ اردو اکاڈمی دہلی کے سیمینار میں پیروڈی سیشن کی صدارت اور منظوم خطبہ۔ اردو اکاڈمی یوپی کا 'نیلا امبر' پر انعام، بنگال اکاڈمی کا انعام 'کلیات شاد عارفی' کلیات ساغر نظامی اور کلیات منظر حنفی کی اشاعت۔ اردو تحریک (لندن) کے مشاعرے میں شرکت کی دعوت۔ اعظم کیمپس پونے کے مشاعرے میں مہمان خصوصی، انجمن ترقی اردو لکھنؤ نے وقار ادب ایوارڈ سے سرفراز کیا۔

"عتاب کی نگاہ"

پروفیسر مظفر حنفی

شاد عارفی کو عموماً طنز نگار کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے لیکن انھوں نے بے حد منفرد انداز کی عشقیہ غزلیں بھی کہی ہیں۔ انھیں دیار عشق کا کامیاب تجربہ ہوا۔ ان معاشقوں کا ردعمل شاد عارفی کے اشعار میں اس طرح نظر آتا ہے

میرے ہاں وہ اور گلی میں اس کے گھر
اک قدم پھولوں پہ، اک تلوار پر

بھرا گھر جس کی شوخی و طرحداری کا قائل ہے
مجھے دیکھا کہ اس پر ہو گئی سنجیدگی طاری

لائے ہیں تشریف گیسوؤں پہ دلائی ڈال کر
حسن اور اس درجہ بے خوف و خطر میرے لیے

راتیں گزر گئی ہیں مجھے جاگتے ہوئے
تکیوں سے اب تو اس کے پسینے کی بو نہ آئے

مسکرا دیں گے مرا نام کوئی لے دیکھے
وہ کسی فکر میں بیٹھے ہوں، کسی کام میں ہوں

کھنچے رہیے تو سو طرح کھکارے لگائیں گے
بتوں سے آپ کو بھی واسطہ اکثر رہا ہوگا

کبھی پڑوس، نہ در تک، نہ بام پر جائیں
جو ہم پہ ہوں یہی پابندیاں تو مر جائیں

آپ یا میں، سوچیے، الفت جتاتا کون ہے
انجمن میں آنکھ ملتے ہی لجاتا کون ہے

جذبۂ محبت کو تیر بے خطا پایا
میں نے جب اسے دیکھا، دیکھتا ہوا پایا

"حسین ہو تم"، "آپ کی بلا سے"، "بری ہو تم"، "آپ کی دعا سے"
جواب ملتا ہے سخت لہجے میں، ان سے جو بات پوچھتا ہوں

بھیجا ہے اس لحاظ سے شاد اس کو آئینہ
کیا حال ہو گیا ہے محبت چھپا کے دیکھ

ان شعروں کی تخلیق آج سے اسی نوے سال قبل کی گئی تھی۔ عہد حاضر کے قاری اور اس زمانے کے پڑھنے والوں کے مزاج کے فرق کو ملحوظ رکھا جائے تو واضح ہوگا کہ ممکن ہے آج اس قسم کے اشعار کہنے والا غزل کا باغی نہ سمجھا جائے لیکن اس عہد میں اساتذہ نے شاد عارفی کو ضرور باغی شاعر قرار دیا ہوگا۔ اس زمانے میں اس نہج کی جدت اور اس کی اہمیت کا کیا مفہوم تھا، اس کا صحیح اندازہ آج بمشکل ہی کیا جا سکتا ہے۔ ان اشعار کی روشنی میں شاد عارفی کا یہ دعویٰ کچھ بیجا یا غلط بھی نظر نہیں آتا کہ انھوں نے خوبصورتی کے ساتھ واقعیت کو مصور کرنے کی کوشش کی ہے۔ صاف دکھائی پڑتا ہے کہ غزل میں ان کی محبوبہ متوسط طبقے کی ایک ہندوستانی لڑکی ہے جو ذہین اور طرحدار بھی ہے، الھڑ اور معصوم بھی۔ یہ محبت یکطرفہ نہیں ہے۔ شاد کی محبوبہ ان کی خاطر بال سکھانے کے حیلے سے آنگن میں آتی ہے۔ وہ درد محبت سے بے چین ہو کر روتی ہے اور اسے چھپانے کے لیے دوسری کی آڑ لیتی ہے۔ وہ محفل میں جہاں شاد ہوتے ہیں، وہ برق سر وقد بھی ٹھہر جاتی ہے۔ انھیں رجھانے کے لیے مسلسل انگڑائیاں لیتی ہے۔ صرف شاد ہی اس کے گھر نہیں جاتے وہ بھی سماجی پابندیوں کی تلوار پر چل کر ان کے گھر آتی ہے۔ وہ روایتی غزل کے فرضی محبوب کی طرح تجریدی یا موہوم نہیں، اس جیتی جاگتی دنیا کی ایک کشیدہ قامت سانولی رنگت کی حقیقی لڑکی ہے۔ عام طور پر شوخ و طرار لیکن شاد کو دیکھتے ہی وہ مصنوعی سنجیدگی اختیار کر لیتی ہے۔ گیسوؤں پر دلائی ڈال کر گھر سے بے خوف و خطر ان سے ملاقات کرنے آجاتی ہے۔ شاد کے تکیے اس کے پسینے کی بو سے رچ بس گئے ہیں۔ وہ ان کے لیے چھپ چھپ کر دعائیں مانگتی ہے اور کتنی ہی فکر مند یا مصروف ہو شاد کا نام سن کر مسکرا دیتی ہے۔ شاد کھنچے کھنچے رہتے ہیں تو سو طرح کھکارے لگا کر انھیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس پر بھی پابندیاں عائد ہیں کہ پڑوس، دریچہ یا بام پر نہ جائے۔ وہ شاد سے آنکھ ملتے ہی لجا کر الفت کا اظہار کرتی ہے۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ شاد سے خفا ہو کر پیار کی باتوں کے جواب میں، آپ کی بلا سے، اور آپ کی دعا سے، قسم کا بظاہر سخت لیکن بہ باطن پیار بھرا لہجہ اپناتی ہے۔ پھر بھی شاد جب اسے دیکھتے ہیں، وہ اپنی طرف دیکھتے ہوئے پاتے ہیں۔ اس کے سامنے پہنچ کر وہ واپس جانے کا تصور بھی نہیں کر پاتے۔ ان کی محبوبہ تاب ہجر نہ لا کر اس حالت کو پہنچ جاتی ہے کہ شاد کو بطور ہمدردی اسے آئینہ بھیجنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی حالت سدھار سکے۔

سادہ سادہ سے واقعات ہیں لیکن زندگی، حسن اور حرارت سے کتنے بھرپور۔ شاد عارفی کے علاوہ پوری اردو کی شاعری میں غزل اس حد تک سچ بولتی ہوئی صرف حسرت کے ہاں نظر آتی ہے۔ حسرت اردو غزل کے امام کہے جاتے ہیں۔ انھوں نے تجدید غزل کا سامان کیا۔ امام کے لیے مقتدی ضروری ہوتے ہیں لیکن ذرا غور سے حسرت کے فوراً بعد آنے والی نسل کا جائزہ لیجیے تو پتہ چلتا ہے کہ کلام حسرت نے اس حد تک اگلی نسل کو متاثر نہیں کیا جتنا کہ شاد عارفی کی

شاعری نے نئی نسل پر اپنا اثر قائم کیا ہے شاد کا کہنا ہے

شریک راہِ محبت ہے طبعِ موزوں شاد
ہر ایک شعر مرا حسبِ حال ہوتا ہے

دوسروں کے واقعاتِ عشق اپناتے ہیں وہ
جن کو سخن سازوں کی اپنی داستاں کوئی نہیں
ان کے پاس دوسرا عاشقوں کے ٹھوس اور حقیقی تجربات ہیں۔ وہ حسرت کی طرح مسکین طبع نہیں، رام پوری پٹھان ہیں۔ ان کی محبوبہ بھی گھریلو عورت ہونے کے باوجود ایک زندہ دل، حاضر دماغ، ذی فہم، باشعور، چنچل اور ذہین دوشیزہ ہے پھر شاد کی محبت اداسونے پر سہاگے کا کام نہیں کرتی چنانچہ۔

تغافل تجاہل سے آتا ہے عاجز
مرا کچھ نہ کہنا بھی حسنِ طلب ہے

تو وہ انداز جیسے میرا گھر پڑتا ہو رستے میں
پئے اظہارِ ہمدردی وہ جب تشریف لائے ہیں

ارے توبہ! کہ شرارت سے نہیں پاؤں زمیں پر
تھوڑی سی عنایت بھی کسی خاک نشیں پر

گڑگڑائے نہ بنے، ہاتھ لگائے نہ بنے
بن کے لیٹی ہو جوانی تو اٹھائے نہ بنے

مری بے بسی ہو کہ بیکسی تری بے رخی ہو کہ دلبری
کوئی کہہ رہا تھا کہ بیٹھے بھی تری بزم سے میں جہاں اٹھا

مجھ پہ اس جا تو کی ہر نظر دوری ہے
پھر بھی مدعا کا قائل، پھر بھی بات پوری ہے

بھولی سی ہم کتب کوئی، کوئی چنچل خانہ زاد
ان کے ہاتھوں خط بھجواتے میں ڈرتا ہوں لیکن وہ

حجاب کی نگاہ سے جھلک رہی ہیں شوخیاں
کسی بھی فن میں ہو مگر کمال بھی تو چاہیے

نقاب کی یہ جنبشیں، حجاب کے یہ زاویے
جو اس سے چاہتا ہوں میں اسے سمجھا رہا ہوں وہ

آپ اس کو اتفاقی بات کہتے ہیں مگر
سامنے آجائے وہ دیوانہ وار آساں نہیں

آپ نے دیکھا کہ شاد کے یہ عشقیہ اشعار ہماری عام اردو غزل کے عاشقانہ اشعار سے بشمول حسرت کتنے ہٹے ہوئے ہیں۔ ان کے عاشق نے محبوب کے آگے سرِ تسلیم اس لیے نہیں خم کر رکھا ہے کہ بے زبانی روایتی شاعری کے عاشق کا شیوہ ہے اس کی خاموشی دراصل حسنِ طلب ہے کیونکہ وہ صنفِ نازک کی اس فطرت سے واقف ہے کہ اس کے تغافل کا جواب تجاہل سے مطلق خود کھنچتی ہے عاشق محبوب کی ایک ایک ادا کا مزاج داں ہے چنانچہ اظہارِ ہمدردی کے لیے تشریف لانے والی محبوبہ کی اس علامت کو بھانپ لیتا ہے جو ظاہر کرنا چاہتی ہے کہ راستے گزرتے ہوئے وہ یوں ہی عاشق کے گھر بھی آنکلی ہے ادھر شوخ اور چنچل محبوبہ ہے کہ اس کے پاؤں شرارت سے زمین پر نہیں پڑتے، بن بن کر لیٹ جاتی ہے کہ تہذیب عاشق کو نہ گڑگڑانے دیتی ہے نہ ہاتھ لگانے کی ہمت پڑتی ہے۔ شاعر کو محبت یاد سے فضا ہے لیکن طبیعت نہیں چاہتی وہ تجربہ نہیں کر پاتا کہ اسے اپنی بے بسی اور بیکسی سے تعبیر کرے یا محبوب کی بے رخی یا دلبری کو اس کا سبب سمجھے محبوبہ ضرورت سے زیادہ محتاط ہے اور عاشق کا مشورہ ہے کہ بہر حال اسے دیکھ کر مسکرا دینے میں فشائے راز کا احتمال نہیں ہے۔ حیا تو محبوبہ اسے نگاہ بھر کر نہیں دیکھتی لیکن عاشق اس کے مدعا کو پا لیتا ہے کیونکہ وہ محبوبہ کی محتاط طبیعت اور زمانے کی نکتہ گیری اور بہتان تراشی کو پہچانتا ہے۔ وہ محبوبہ کی ذرا ذرا سی بے احتیاطیوں پر اسے متنبہ کرتا ہے کہیں کسی خاص خانہ زاد چنچل کے ذریعے اور کبھی کسی بھولی بھالی ہم مکتب سے نامہ بر کا کام لیا جاتا ہے تو وہ محبوبہ کی رسوائی کے ڈر سے کانپ کانپ جاتا ہے۔ محبوبہ محبت کو عاشق سے بھی چھپاتی ہے اور جوابًا اسے آئینہ سمجھا جاتا ہے کہ دیکھ خود تیرا سراپا محبت کی منہ بولتی تصویر ہے محبوبہ کے نقاب کی ایک ایک جنبش اور حجاب کا ایک ایک زاویہ عاشق کے لیے سوچتیں فراہم کرتا ہے۔ وہ دیوانہ وار عاشق کے سامنے بھی آتی ہے تو اتنی ذہانت کے ساتھ کہ لوگ اسے ایک اتفاقی بات سمجھیں لیکن حقیقت عاشق پر روشن ہے کہ روشن کے گملوں کی آڑ سے چھپ چھپ کر اس طرح نظارہ کر لیا جاتا ہے کہ محبوبہ کو پتہ نہ چل پائے دوسری طرف سے روماں پر شاد کا کاڑھ کر بھیجے جاتے ہیں۔ یہ اور ایسے ہزاروں معاملات شاد عارفی کی عشقیہ غزل میں بھرپور شاعرانہ کیفیات کے ساتھ نظر آتے ہیں بیسویں صدی کے ہندوستانی مسلم متوسط طبقے کے عاشق و معشوق کی ان باریک نفسیاتی کیفیتوں پر اردو کے کسی شاعر کی نگاہ اس طرح نہیں پہنچی کہ جس طرح کہ شاد ان کے غماز ہیں یہاں نہ محبوب کے عہد کا ہے نہ عاشق قرونِ وسطیٰ سے تعلق رکھتا ہے۔ شاد عارفی کی شاعری جس طرح ان کی شخصیت کے لیے نقاب نہیں بلکہ آئینے کا کام دیتی ہے بالکل وہی فریضہ ان کی عشقیہ غزل ان کے محبوب کے لیے انجام دیتی ہے اور یہ فریضہ ہماری شاعری میں کم کم ہی ادا کیا گیا ہے۔
یہی وجہ ہے کہ شاد عارفی کی غزل پر کہیں کہیں آتش کی طرح شوخ

لہجے کے ساتھ احساس کی گرمی، محبوب کے جسم کی آنچ، حسن کی چلتی پھرتی تصویر اور عشق کی حقیقی کیفیت کی عکاسی ملتی ہے لیکن آتش کی پوری شاعری اس پائے کی نہیں ہے اور بیشتر مقامات پر وہ بری طرح لکھنوی رنگ کا شکار ہو گئی ہے جبکہ شاد کی تقریباً تمام مختصر غزلیں ان خصوصیات کی حامل ہیں اور ان کے ہاں یہ رنگ کافی نکھر کر ابھر آیا ہے۔ ان کے اشعار میں عاشق و محبوب کی انسانی فطرت اور نفسیات کے ایسے متحرک عکس نظر آتے ہیں جو پڑھنے والے کو دیرپا مسرت سے ہمکنار کرتے ہیں احساساتی شاعری اور حسیت کی اتنی اچھی اور دلکش مثالیں جن کے لیے انگریزی ادب میں کیٹس مشہور ہے اردو میں شاد عارفی کے ہاں بکثرت ملتی ہیں۔ ثبوت میں کچھ شعر ملاحظہ فرمایئے:-

انگلیاں اس کی مرے ہاتھ میں ہیں جام کے ساتھ
ہاتھ کھینچے نہ بنے، جام گرائے نہ بنے

دیکھ پاتے ہیں جو ہم کو دریاں کوٹے وقت
کنکھیوں سے بھول جاتے ہیں ستاں کوٹے وقت

وہ زبانِ بے زبانی سے ابھی واقف نہیں
ہاتھ رکھنا پڑ رہا ہے اپنا دل پر مجھے

ابھی ہنگامہ آرا دل میں ہے اک عشرتِ رفتہ
ابھی تک تیری خوشبو آ رہی ہے میرے بستر سے

شاد عارفی نئی بات کہتے ہیں یا عام سی بات کو اس زاویے سے کہتے ہیں کہ وہ نئی ہو جاتی ہے انھوں نے پرانے لفظوں کو نئی فضا اور معنویت بخشی یہی نہیں کہ ان کی مختصر غزلوں میں محاکات، معاملہ بندی اور واقعہ نگاری ایک ایسے انوکھے انداز سے کی گئی ہے جو ان سے قبل ناپید تھا بلکہ وہ عشق کے تاثرات اور واردات قلب کو بھی اسی جدت ادا کے ساتھ بیان کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے موضوعات کو ادراک و احساس کا لمس بھی دیا۔ شاد کی مختصر غزل میں بڑی حلاوت اور جذباتی آسودگی پائی جاتی ہے اس ضمن میں چند اشعار دیکھیے:

سوتے ہی اپنے بستر پر
میں ہوتا ہوں اس کے گھر پر

ذرا خاموش رہنے دے کہ ذہنی طور پر ہمدم
ابھی واپس نہیں آیا ہوں میں اس کے شبستاں سے

لرز رہا تھا میں کہیں کھٹک نہ جائے انجمن
وہ انجمن میں آج اس قدر بچا بچا رہا

حیرتِ جلوۂ محبوب بتاؤں
ڈر رہا تھا کہ کہیں جاگ نہ جاؤں

چارہ گر الفت کی نفسیات سے واقف نہیں
لے کے نام اس کا کوئی دیکھے مرے چہرے کا رنگ

حسن ہر حال میں ڈرتا ہے ہوسناکوں سے
پھول کھلتا ہے تو ہر سو نگراں ہوتا ہے

شاد صاحب جو بیٹھے پڑے ہیں ہر بات میں آپ
آج وہ ہوش ربا آپ کا مہماں تو نہیں

مخاطب ہے وہ ایسے زاویے سے
جسے دیکھو مرا منہ تک رہا ہے

دلنوازی جو بھرے گھر میں نہیں بن پڑتی
رخِ محبوب پہ گیسو ہی بکھر پڑتا ہے

ڈاک سے بھیجی خوشبو والے خط پر خط آئے تو اک دن
پوچھے گا خط لانے والا بابو جی! یہ خط کس کا ہے

شاد عارفی کی مختصر غزلوں میں فطری سادگی، شوخی اور لہجے کا انوکھا پن ہے ان میں جوانی کی تازگی، متوسط طبقے کے نوجوان کو پیش آنے والے واقعات کی سرشاری اور زندگی کی حرارت ہے جس میں محاکاتی پہلوؤں کے ساتھ ایک خوشگوار گھریلو پن، واقعیت، خلوص اور بے جھجک قسم کا مکالماتی طرز (جسے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ حقیقی شاعری کا جزو اعظم قرار دیتا ہے) طرفہ کاری، تنوع، انکشاف، ظرافت اور بلوغ کا براہ راست انداز ہے ہر چند کہ اس میں گہرے تجربات کا عکس اور فلسفیانہ تفکر نہیں ہے (جسے حقیقی عشق کے بیان میں ہونا بھی نہ چاہیے) لیکن اپنے جدید اسلوب اور مخصوص رنگ و آہنگ کے لحاظ سے اس غزل کی ایک جداگانہ اور منفرد حیثیت ہے۔ در اصل شاد عارفی نے روایتی غزل کے مروجہ علائم و رموز سے روگردانی کرتے ہوئے غزل کی مخصوص رمزیت اور اشاریت سے شعوری پہلوتہی برتی اور موضوع کی براہ راست ترجمانی کا فن اختیار کیا اس طرح وہ بڑی فراخدلی کے ساتھ غزل کی مروجہ علامتوں، تمثیلوں، کنایوں اور ان کے ساتھ وابستہ ذہنی تحفظات اور تصوراتی لوازمات سے دست بردار ہو گئے۔ نتیجے کے طور پر ان کی غزل کسی حد تک ان لوازمات کی پیدا کردہ پہلوداری اور اس پس منظر کے ایک حصے سے محروم بھی ہو گئی جو غزل کی روایت عام اشعار کو فراہم کرتی ہے نیز وہ شے بھی ان کے ہاں کم نظر آتی ہے جسے اساتذہ خاص تغزل کا نام دیتے ہیں۔

ان غزلوں کے گہرے مطالعے سے اس حیرت ناک حقیقت کا

انکشاف بھی ہوتا ہے کہ اس کھلے کاروبارِ عاشقی میں کہیں جنسی کثافت کی کھوٹ نہیں ہے۔ شاد جیسا کھل کر کہنے والا شاعر کہیں محبوب یا تصورِ محبوب کے ساتھ کھل نہیں کھیلتا، نازک سے نازک تر مقام پر بھی انھوں نے احترامِ حسن کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ وہ بیباک عورت پرست تو تھے لیکن ان کے دل و دماغ پر مذہب کا جو اثر قائم ہو چکا تھا اس نے عام زندگی میں بھی انھیں پاکیزگیِ احساس سے مالا مال کیا اور انھیں دوسری جرأت ہونے سے بچایا ورنہ ان کا مزاج حقیقت کو نقاب پہنا کر سامنے لانے کا عادی نہ تھا۔ اس سلسلے میں ان کے خیالات کا اندازہ ان اشعار سے ہو سکتا ہے۔

عشق بانہیں مروڑنے میں نہیں
شاعری پھول توڑنے میں نہیں

ساتھ کھیلے کی محبت بڑھ کے بن جاتی ہے عشق
اس سے زائد عشق کا اے شاد میں قائل نہیں

احترامِ جلوہ چینی یہ بھی کچھ تھوڑا نہیں
آنکھ نے جس پھول کو دیکھا اسے توڑا نہیں

خوشنما پھولوں کو چھپا کر تھا میرے لیے
گل گرا سکتا تھا ورنہ بارہا ہلا دے دوست

ذکرِ قربِ وصل ہی میرے لیے کافی ہے شاد
جب کہ احبابِ غزل کہتے وہ ہم آغوش تھا

حسرت جیسے مہذب انسان اور پاکباز شاعر کے ہاں بھی کافی اشعار میں وصل و صبحِ وصل وہ کیفیت مل جاتی ہے جسے خود انھوں نے، فاسقانہ شاعری، کا نام دیا ہے لیکن شاد کی غزلوں میں تلاشِ بسیار کے بعد بمشکل دو تین اشعار اس قسم کے ملیں گے۔

چھالیہ کتروانے کو کان دے دیتا ہوں ہاتھ میں ہاتھ
موقع پا کر دہن میں چٹکی بھر لیتا ہوں، لیکن وہ

اک بھینی بے نام سی خوشبو
شامل ہے ہونٹوں کے رس میں

یہ گدگدا، یہ بوسۂ لب اس کا ردِ عمل مجھے
ابھی جو ارشاد ہو رہا تھا کہ ہم سے کیوں کوئی بولتا ہے

اپنی شاعری کی حیثیت اور وضعیت کے باوجود وہ عشق اور ہوسناکی کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ علاوہ حرماں نصیب شاعر ہونے کے باوجود حرماں نصیبی کی فضا، چند اشعار کے استثناء کے ساتھ شاد کی عشقیہ غزلوں میں نہیں پائی جاتی۔ انھیں خود بھی اعتراف ہے کہ:

"میرے ہاں غمِ جاناں کا ذکر بہت کم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ میں محبت میں خودداری کو ہاتھ سے دینے کا قائل نہیں ہوں"

ان کی پوری عشقیہ شاعری دیکھ جائیے بہت کم اشعار اس روایتی انداز میں ملیں گے جس میں ہمارے غزل گو محبوب کو ستم پیشہ اور غارت گر قرار دے کر اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے ملتے ہیں اور شمشیرِ یار کے نیچے جبیں پر کر نہ گزرنے کا اعلان فرماتے ہیں۔ غالب کی طرح شاد بھی اس معاملے میں بے حد غیور اور خوددار عاشق ہیں محبوب کو جی جان سے چاہتے ہیں لیکن اس کے ہاتھوں اپنی عزت نیلام نہیں کرتے۔

محبت میں خودی کی بات بھی دیکھی نہ جائے گی
اگر میں بارِ خاطر ہوں تو اٹھ جاؤں ترے در سے

جھٹک کے ہاتھ سے دامن کو جانے والے بس
ترے خیال کا دامن بھی چھوڑتا ہوں میں

کس طرف روئے سخن ہے نام اس کا لیجیے
بن بلائے آپ کی محفل میں آتا کون ہے

یہ تو مت محسوس ہونے دیجیے
بھی ہیں آپ کی محفل میں ہم

اردو غزل میں امتحانِ وفا محض عاشق دیتا آیا ہے۔ شاد کی غزل محبوب کا امتحان بھی لیتی ہے۔

دل سے پہنچے پہ بحث تو ہوئی لیکن
اس کی بے قراری کو حسبِ مدعا پایا

اسی لیے شاد جو محبوب کا شکوہ بہت کم کرتے ہیں

شاد غیر ممکن ہے شکوۂ بتاں مجھ سے
میں نے جس سے الفت کی اس کو باوفا پایا

ان کی شاعری میں بڑی پاکیزگی اور وقار وضعیت ہے۔ عام بول چال کی زبان میں اس ندرتِ ادا کے ساتھ جو صرف انھیں سے مخصوص ہے حقیقت پر مبنی واقعاتِ عشق کو جیسے غزلوں میں منعکس کر کے شاد عارفی نے عشقیہ شاعری میں گراں قدر اضافہ کیا ہے ان کی عشقیہ غزلیں غیر ضروری آرائش کے عناصر سے بالکل پاک ہیں اسی لیے تغزل پسند طبیعتیں غزل کے مروجہ معیار کی روشنی میں ان کی غزلوں کی صحیح قدر نہیں کر پائیں۔

☆

براہ راست

اب دل پر ہاتھ رکھیئے یا تھامیئے جگر کو، حقیقت یہ بھی جگہ اٹل ہے کہ تیسری دنیا بلکہ کرۂ ارض کے کونے کونے میں لکھی، پڑھی، بولی جانے والی اردو زبان کا شمار کسی طور بھی ترقی یافتہ زبانوں میں نہیں کیا جاتا، وگرنہ یہ کیونکر ممکن تھا کہ جس زبان نے میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ جیسے نادر و نایاب نگینے تلاشے اور تراشے آج وہی زبان اپنے جواہر پاروں کو پڑھوانے اور منوانے کو ترس رہی ہو!

پروفیسر مظفر حنفی اپنے دور کے میرؔ ہیں نہ غالبؔ اور نہ پروفیسر صاحب کو اقبالؔ کی ہمسری کا دعویٰ ہے، دعویٰ اگر ہے تو اپنے دور کے انسان اور اس پر گزرنے والی الم ناکی کے بیان کا ہے جس کا انداز اچھوتا بھی ہے، انوکھا بھی ہے اور نرالا بھی، سوال پھر اس قدر اچھوتے، انوکھے اور نرالے ادب پاروں کی ترویج و ابلاغ کا ہمارے سامنے آ کھڑا ہے۔ کیا اردو ادب سے وابستہ انگلیوں پر شمار کردہ لوگ اس قدر علمی، ادبی اور شعری سرمائے کی امانت و دیانت کا بار اٹھانے کے متحمل ہو سکیں گے اور کب تک ہو سکیں گے!!

کچھ دیر کو مستقبل کے خدشات سے قطع تعلق کرتے ہوئے آج کی مہلت کو غنیمت جانیئے اور پروفیسر مظفر حنفی سے کچھ اس طور پر ہمکلام ہو جایئے کہ ساٹھ دہائیوں کی فنی ریاضت کا ثمر حق بہ حق دار پہنچے اور کچھ دیر کے لئے ہمارے دل، دماغ اور اعصاب تازگی، تراوٹ اور توانائی سے فیض یاب ہو سکیں، اس کی ضرورت ہمیں جس قدر آج ہے شاید اس سے پہلے کبھی نہ تھی!!!

گلزار جاوید

☆ بچپن، لڑکپن اور نوجوانی کے اُن ایام کی تھوڑی سی جھلک دکھلایئے جن کے زیرِ اثر کھولتا ہوا لاوا سینے سے اُبل اُبل کر باہر آیا کرتا تھا؟

☆☆ میاں میرا بچپن، لڑکپن اور جوانی بھی معاشرتی جبر اور سماجی بے انصافیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے گزرے ہیں اُن کی تفصیل آپ کے بہت سے صفحات گھیر لے گی۔ اجمالاً عرض ہے کہ پرائمری اور مڈل اسکول کا زمانہ انتہائی عسرت میں بسر ہوا۔ والد صاحب کھنڈوا میں پرائمری اسکول کے ٹیچر تھے۔ والدہ تین بیٹیوں اور ایک بیٹے کے ساتھ آبائی وطن ہسوہ (فتح پور) میں رہنے پر مصر تھیں۔ کھنڈوہ سے دس روپے کا منی آرڈر ہر مہینے آتا تھا جس میں ہم پانچ نفر مہینے بھر تنگی ترشی میں بسر کرتے تھے۔ اس فلاس زدگی کے عالم میں مڈل اسکول بورڈ کے امتحان میں ضلع کے پچیس ممتاز طلبہ کی لسٹ میں میرا نام بھی تیسرے مقام پر تھا۔ اس دوران میں مفلسی اپنی جگہ تھی اور رحمت میں جگہ دے والد صاحب ملازمت سے ریٹائر ہو گئے۔ تایا زاد بھائی کا کھنڈوا میں بہت بڑا کاروبار تھا۔ مزید تعلیم دلانے کے بہانے موصوف نے مجھے اپنے ساتھ رکھ لیا اور پھر کم سنی میں ہی مجھے اپنے کاروبار کے کولہو میں جوت دیا۔ پڑھنے لکھنے اور اسکول کا کام کرنے کے لیے وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ یہ سلسلہ چھ برسوں تک چلا۔ بمشکل ہائر سیکنڈری اسکول کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا اور ۱۹۵۴ء میں کانپور چلا آیا جہاں بہت تکلیفیں جھیل کر دو برس تک ملازمت کی تلاش میں بھٹکنے اور ناکام رہنے کے بعد کہیں بھوپال میں مڈل اسکول ٹیچر کی حیثیت سے تقرر ملا۔ پوسٹنگ بیحد دور جنگلی اور دلدلی علاقوں میں ہوئی۔ متعصب اور تنگ نظر افسروں کی زیادتیوں کے خلاف احتجاجاً تین برس بعد میں نے استعفا دے دیا۔ کھنڈوا میں تایا زاد بھائی فضول خرچی اور جہالت کے سبب لاکھوں کے مقروض ہو گئے تھے، خوشامد کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ سخت محنت اور جانفشانی سے اُن کا کاروبار دوبارہ مستحکم کیا، پھر میری شادی ہو گئی اور والدین کی خواہش کے مطابق دوبارہ ملازمت کی۔ چودہ برس تک محکمہ جنگلات میں کلرک رہ کر ایم اے، ایل ایل بی اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ قلیل تنخواہ میں والدین، بیوہ بہن اور اُن کے بچے نیز چھوٹی بہن کی کفالت کے ساتھ اپنے بیوی بچوں کی پرورش مزید برآں منجھلی بہن کی فلاس زدہ حالت میں اعانت پھر چھوٹی بہن کی شادی، خوشدامن کے کینسر کا علاج وغیرہ خاصے پاپڑ بیلنے پڑے تب کہیں ۱۹۷۴ء میں جا کر بہتر ملازمت نصیب ہوئی تو چین کی سانس لی۔ ان حالات میں سینے سے کھولتے ہوئے لاوے کا ابلنا فطری تقاضا ہوا کرتا تھا۔

☆ حافظے پر زور دیتے ہوئے اُن اسباب کی بابت کچھ بتلایئے جن کے تحت آپ نے ابتداءً بچوں کے ادب سے کی۔ مثلاً کیا لکھا، کہاں چھپا اور کس قسم کا ردِعمل ہوا؟

☆☆ کہانیاں، داستانیں پڑھنے کا شوق لڑکپن سے ہی جنون کی حد تک

پہنچ گیا تھا۔ بارہ تیرہ برس کی عمر میں مڈل امتحان کے زمانے میں والد مرحوم نے
طلسم ہوشربا، پڑھتے ہوئے پکڑ لیا۔ خاصی سرزنش کی اور یہ بھی کہا کہ ایسا ہی شوق
ہے تو پڑھ لکھ کر اس لائق ہو کر تم لکھو اور دوسرے پڑھیں۔ چنانچہ اسی وقت سے قلم
میرے خامہ، بسم اللہ۔ دہلی سے بچوں کا رسالہ کھلونا، نیا نیا جاری ہوا تھا، بچوں
کے لیے میرے تحریر کردہ لطیفے، کہانیاں، نظمیں وغیرہ اسی پرچے میں
چھپیں بجز پھلواری (دہلی) کاقی (ملیگاؤں) کلیاں (لکھنؤ) دوست (کراچی) اور
ہندوپاک کے دوسرے بچوں کے رسالوں کے لیے خوب خوب لکھا۔ لڑکپن
میں ہی معروف ہو جانے کی وجہ سے جب ۱۹۵۲ء کے آس پاس بڑوں کے لیے
افسانے، غزلیں وغیرہ لکھنے کی ابتدا کی تو معیاری رسالوں میں کسی دشواری کے بغیر
شائع ہونے لگا۔ ناقدین تو ادب اطفال کو آج بھی اہمیت نہیں دیتے لیکن مقام
شکر ہے کہ حکومت ہند کی مطبوعہ درسی کتب سے لے کر دیگر کئی صوبوں کی درسی
کتابوں میں میری تخلیقات شامل ہیں۔ ادب اطفال پر میرے متعدد تنقیدی اور
تحقیقی مضامین کو حوالہ جاتی اہمیت حاصل ہے۔ اپنی نگرانی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ
سے بچوں کے ادب پر ایک ضخیم تحقیقی مقالہ بھی مکمل کرا چکا ہوں اور اب بھی بچوں
کے لیے نظمیں وغیرہ لکھتا رہتا ہوں۔

☆ کھنڈوا میں اردو اسکول کی تحریک چلانے کے محرکات کیا تھے؟

☆☆ ۱۹۴۷ء میں میں کھنڈوا کے موتی والا نمبر ۲ مڈل اسکول کے اردو سیکشن
میں پڑھتا تھا۔ آٹھویں کے امتحان میں تمام شہر کے مڈل اسکولوں کے اردو،
انگریزی، ہندی، مراٹھی میڈیم سے آٹھویں پاس کرنے والے طلبہ میں اول
پوزیشن حاصل کی اور سونے کا تمغہ وصول کیا لیکن تقسیم ہند کے بعد نویں جماعت میں
اردو میڈیم سے پڑھنے کا سلسلہ بند ہو گیا۔ مجبوراً ہندی سیکشن میں داخلہ لیا اور
ہائر سیکنڈری بمشکل سیکنڈ ڈویژن میں پاس کر سکا۔ میرے بہت سے ساتھیوں کی
تعلیم کا سلسلہ ہی منقطع ہو گیا۔ اس تلخ تجربے کی یاد میرے سینے میں لاوے کی
طرح جوش کھا رہی تھی اس لیے ۱۹۵۸ء میں جب دوبارہ کھنڈوا پہنچا تو اپنے زخم
خوردہ کچھ ساتھیوں کی مدد سے وہاں اردو کے لیے بڑے پیمانے پر تحریک چلائی
اور بڑی جدوجہد کے بعد اردو ہائر سیکنڈری اسکول قائم کرنے میں کامیاب
ہوا۔ آگے چل کر وہاں میرے انہیں ساتھیوں میں سے قاضی حسن رضا نے
جواہر لال اردو ہائی اسکول بھی قائم کیا۔

☆ "نئے چراغ" کا اجرا کس تحریک اور تعاون پر ہوا اور اس کا انجام
کیا ہوا؟

☆☆ اردو تحریک کو طاقت ور بنانے کے لیے ہم لوگوں نے کھنڈوا میں
نیشنل اردو لائبریری قائم کی اور رسالہ "نئے چراغ" کا اجرا عمل میں آیا۔ یہ
ہندوستان میں ("شب خون" سے آٹھ برس پہلے) صحت مند جدیدیت کا
ترجمان تھا۔ یہ محض ڈیڑھ دو برس جاری رہا اور شادی کے بعد میرے کھنڈوا سے
چلے آنے کی وجہ سے بند ہو گیا۔

☆ انجمن ترقی اردو (ہند) کی شاخ کھولنے کا خیال کیونکر آیا اور اس
تجربے میں کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے؟

☆☆ انجمن ترقی اردو (ہند) کی کھنڈوا میں شاخ کھولنے کا سبب بھی اردو
تحریک تھی۔ اس پلیٹ فارم سے میں نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے عوام میں اتنا
جوش بھر دیا کہ کھنڈوا کے قرب و جوار میں کئی ان پڑھ کسانوں نے اردو اسکول
کھولنے کے لیے اپنی زمینیں وقف کر دیں اور ہم لوگ وہاں دیہاتوں میں درجنوں
اردو پرائمری اسکول اور چند مڈل اسکول کھولنے میں کامیاب ہوئے۔ البتہ یہ ضرور
ہوا کہ ہمارے نوجوان ساتھیوں میں سے اکثر کی سائیکلیں، گھڑیاں اور دوسرا قیمتی
سامان اردو تحریک کو جاری رکھنے کے لیے بکتا رہا۔

☆ اردو ادب کی تمام اصناف پر حاوی شخص کاشت کاری اور پولٹری
فارمنگ کی جانب کیونکر رجوع ہوتا ہے اور اس کا انجام کیا ہوتا ہے؟

☆☆ میاں گھر اور ابتدائی زندگی پریشانیوں اور بڑی بھاری ذمہ داریوں کا
حال آپ پر روشن ہو چکا ہے۔ اسی مالی پریشانی کو کم کرنے کے لیے میں نے
تقریباً چالیس ایکڑ بنجر زمین کو آباد کرنے کی کوشش کی اور کئی سال تک جانفشانی
کے بعد نقصان اٹھا کر وہ زمین فروخت کرنی پڑی۔ پولٹری فارمنگ تو گلبرگہ
یونیورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد وقت گزاری کے لیے شروع کی تھی لیکن
فرصت سے زیادہ جوش ہونے کے باعث کام بڑے پیمانے پر شروع کیا اور
تقریباً پچاس ہزار چوزے بیک وقت فارم میں ڈال لیے۔ نتیجتاً تجربہ کاری کے
سلسلے میں معتبر رہا۔ اسی شام میں برڈ فلو کی آفت نازل ہوئی، کئی لاکھ کا نقصان اٹھایا
لیکن زمین کی قیمت میں اضافے کی وجہ سے اس کی بھرپائی ہو گئی۔ البتہ اور بیچے
کی کاشتکاری اور پولٹری فارمنگ کرتے ہوئے جن تجربات سے گزرا انہوں نے
میری تخلیقی صلاحیتوں کو بڑی تقویت پہنچائی۔

☆ آپ خود کو پانچواں درویش کن معنوں میں مانتے ہیں؟

☆☆ جواب میں دو شعر ملاحظہ ہوں:

پانچواں درویش ہوں، مجھ سے سنو — اک نیا افسانۂ باغ و بہار
اور پھر پانچویں درویش کی باری آئی — باغ افسانہ میں جدت کی سواری آئی

سو اس نئے افسانۂ باغ و بہار کی تلاش اور تخلیقی جدت کی جستجو نے
پانچواں درویش بنا دیا۔ آپ جانتے ہیں روایتی چار درویش تو قدیم داستانیں ہی
سنا سکتے تھے۔

☆ ڈاکٹر صاحب! آپ کی پوری زندگی کام ہی کام سے عبارت ہے
اس کے باوجود آپ کے تجربات کا بڑا چرچا ہوا کرتا ہے۔ کب، کہاں، کیسے ان
تجربات کا موقع میسر آیا؟ آپ کی شادی بھی کم عمری میں ہو گئی تھی؟

☆☆ بے مبالغہ سمجھیے میرے لیے تخلیقی کام کے بغیر زندگی گزارنا

دشوار ہے بقول کسے اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے۔ شعر کہنا میرے تئیں سانس لینے کی طرح جاگزیں ہے۔ جب صورتحال یہ ہو تو وقت کی تنگی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اکثر یوں ہوا کہ رات کو سوتے سے چونک پڑے اور ڈھلے ڈھلائے شعر برآمد ہونے لگے چنانچہ تخلیقی تجربات کے لیے پوری زندگی دستیاب تھی۔ شادی کے وقت میں تو پھر بھی تقریباً چوبیس برس کا تھا بیگم محض پندرہ سال کی تھیں۔ یہ بھی ایک پُرلطف تجربہ تھا۔

☆ غالباً ۱۹۵۳ء میں آپ نے پہلا افسانہ تحریر کیا تھا اس کی تحریک اور افسانے کے بقیہ سفر کی مختصر روداد کیا ہے نیز کرشن چندر جیسے ثقہ افسانہ نگار کی حوصلہ افزائی کے باوجود آپ اس سفر کو جاری کیوں نہ رکھ سکے؟

☆☆ جی، ادب اطفال کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری ۱۹۵۸ء میں شروع کی۔ قیام کانپور میں تھا وہاں پروفیسر احمد اختر کشفی مرحوم کے خاندانی بزرگ دادا میاں کے مزار پر عرس ہوتا تھا۔ ملازمت کی تلاش کے دوران تلخ تجربے ہوئے تو دادا میاں کے مزار سے متعلق ایک افسانہ محنت کی چادریں بیساختہ وجود میں آیا جو اس وقت کے برصغیر کے سب سے زیادہ کثیر الاشاعت رسالے "شمع" (دہلی) میں چھپا جس کے مدیر "کھلونا" کے مالک تھے جس میں میں بچوں کے لیے تین چار برس سے لکھ رہا تھا اس لیے پہلے افسانے کی اشاعت میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ۱۹۶۰ء تک تقریباً ڈیڑھ سو افسانے تخلیق کیے جو ہندو پاک کے تقریباً سبھی معیاری رسائل میں شائع ہوئے ان کے تین مجموعے بھی منظرِ عام پر آئے جن پر توصیفی دیباچے فراق گورکھپوری، کرشن چندر اور کنھیا لال کپور نے لکھے تھے۔ ۱۹۶۰ء کے آس پاس جدیدیت کی رو چلی اور افسانے میں بھی پلاٹ اور کردار وغیرہ کو درکنار کرتے ہوئے تجریدیت، علامت اور رمزیت نے زور پکڑا میں ان مطالبات کو غیر فطری سمجھتا تھا اس لیے غزل پر زیادہ توجہ صرف کرنے لگا جہاں رمزیت اور علامت پسندی سے حُسن و خوبی پیدا ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ افسانہ نگاری سے بالکل دستبردار ہو گیا۔

☆ شاعری کی ابتداء اور شاد عارفی مرحوم سے تعارف و تعلق کے مراحل کب اور کیسے طے ہوئے نیز استادی شاگردی کا یہ سلسلہ کتنے عرصے پر محیط ہے اور اس عرصے میں آپ عارفی صاحب سے کیا کچھ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے؟

☆☆ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں شاعری کی ابتدا تو لڑکپن سے ہی ہو گئی تھی لیکن زیادہ توجہ افسانہ نگاری پر تھی ویسے شاد عارفی کی طنزیہ نظمیں اور غزلیں مجھے بہت پہلے سے بھلی لگتی تھیں۔ اُن سے خط و کتابت کا سلسلہ "چراغ" کی ادارت کے زمانے میں شروع ہوا۔ وہ ہمارے پرچے کے مستقل لکھنے والوں میں سے تھے۔ کچھ آگے چل کر جب میں نے افسانہ نگاری کے بجائے شاعری کو اپنا مرکزِ توجہ بنایا تو شاد عارفی کی باقاعدہ شاگردی اختیار کی اور نومبر ۱۹۶۲ء سے فروری ۱۹۶۴ء تک تقریباً چودہ مہینے اُن سے اپنی تقریباً ڈیڑھ سو غزلوں پر اصلاح لی۔ یہ سب ڈاک کے ذریعے سے ہو رہا تھا۔ فروری ۱۹۶۴ء میں وہ وفات پا گئے لیکن اُن کی تحریروں سے آج تک سیکھتا رہتا ہوں۔ جو کچھ ہوں اُن کی جوتیوں کے طفیل ہوں۔

ہے شاد عارفی سے مظفر کا سلسلہ
اشعار سان چڑھ کے بہت تیز ہو گئے

تا حال سلسلۂ شادیات کی نو کتابیں شائع کر چکا ہوں اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔

☆ آپ کے ہاں تلخی کا عنصر بہت نمایاں ہے جس کے باعث آپ کے کلام میں تو کیلا، کڑوا بلکہ مرچ مصالحے والا عنصر پایا جاتا ہے جس کے باعث احباب آپ کو طنزیات کا امام بھی کہتے ہیں۔ یہ خاص رویہ آپ کس چیز کا ردِعمل ہے؟

☆☆ جاوید صاحب! آپ نے درست فرمایا۔ بقول شاد عارفی۔

دوسروں کے واقعات عشق اپنائے ہیں وہ
جن سخن سازوں کی اپنی داستاں کوئی نہیں

میری نگارشات میرے اپنے تجربات کی دین ہیں لیکن طرزِ اظہار وہ اختیار کیا ہے کہ آپ بیتی جگ بیتی معلوم ہو۔ البتہ یہ سارا تلخی، ترشی اور کڑواپن نیم کے رس کی طرح معاشرے کی صحت کے لیے بے حد مفید ہے۔ ردِعمل کے بارے میں پچھلے سوالوں کے جوابات ملاحظہ فرمائیں۔

☆ پروفیسر صاحب! آپ کی شاعری میں جا بجا کلاسیکی رنگ نمایاں ہونے کے باوجود آپ خود کو میر، غالب اور فراق سے الگ گردانتے پر مصر ہیں مگر شاد عارفی اور یگانہ مرزا آبادی کے اثرات سے پہلوتہی آپ کے لیے ممکن نہیں؟

☆☆ میں نے ہمیشہ کہا اور لکھا ہے کہ کوئی فنکار اس وقت تک جدید ہو ہی نہیں سکتا جب تک اُسے یہ نہ معلوم ہو کہ قدیم ہے کیا۔ میرے ادبی مزاج کا خمیر اساتذہ کے کلام سے ہی اٹھا ہے جن میں میر و غالب بھی ہیں اور فراق و یگانہ بھی۔ لیکن جہاں تک اثر پذیری کا تعلق ہے

وروں سے تقابل نہ کرو ہے مری توہین
ہاں شاد و مظفر میں گیا شاد گیا میں!

☆ صدیوں سے اردو شاعری کی بنیاد "عشق و محبت" پر استوار ہے آپ اپنی عمارت کی نیو الگ رکھ کر ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں؟

☆☆ بقول شخصے ــ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ میں اپنی شاعری کو دوسروں سے مختلف رکھنا چاہتا ہوں، اکثر دعا کرتا ہوں:

ویسے تو مظفر کی تمنائیں بہت ہیں
آہنگ الٰہی مرا آہنگ الٰہی

☆ بسا اوقات آپ کی غزل کا لہجہ سپاٹ اور بسا اوقات کھردرا کیوں

ہوا کرتا ہے؟

☆☆ سپاٹ کے لیے بالعموم، کئی جگہ بعض اوقات، کہیں تو بات بجا ہوگی۔ یوں ہے کہ لہجہ کا شعر اکثر نثری ساخت رکھتا ہے اور سہل ممتنع کا حامل ہوتا ہے تو بادی النظر میں سادہ اور سپاٹ لگتا ہے لیکن غور کریں تو اس میں گہرے مفاہیم اور معنی کی پرتیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ کہ ہر دو سے ہی کا اپنا الگ ذائقہ ہے۔

☆ تمام تر جدت طرازی اور روشن خیالی کے باوصف کبھی کبھی روایت پرستی بھی آپ پر حملہ آور ہو کر اس طرح کے شعر کہلواتی ہے۔

ہمیں اک نیا حوصلہ چاہیے

پرانے عقیدوں پہ سجدہ نہیں

☆☆ بھائی میرے اگر کوئی پرانے عقیدوں پر سجدہ نہیں کرتا تو اُسے روایت پرست بھلا کیسے کہہ سکتے ہیں البتہ جس طرح کوئی پرواز میں چھوڑ کر خلا میں معلق نہیں رہ سکتا اسی طرح شاعر کتنا ہی منفرد اور جدید کیوں نہ ہو اپنی شعری روایت سے بے تعلق نہیں ہو سکتا۔ روایت بڑی ناؤ کی ہے۔

☆ کئی مواقعوں پر آپ کا انداز اس قدر باغیانہ ہوا کرتا ہے کہ اس پر مقدس صحائف کی نقل کا گمان ہونے لگتا ہے مثلاً!!

زمیں تنگ پڑی میرے پائے وحشت کو

تو اب خلائیں مرے نقشِ پا کی زد پر ہیں

☆☆ آپ کے حسن ظن کا شکریہ

☆ آپ غزل کی کوئی کمائی سے نا آسودہ ہیں اور ہیں تو آپ کے ہاں غزل کی کمائی کا تصور کیا ہے؟

☆☆ آپ نے میرے اس مطلع کو سوال میں تبدیل کر دیا ہے۔

مری زمین رہی آسماں پہ چھائی ہوئی

مگر غزل کی کمائی کوئی کمائی ہوئی

جواب میں ایک دوسرا مطلع سماعت فرمائیے۔

تشویش اور زیاں کے پہلو عرض ہنر میں صاف

شہرت سے ہٹ کر دیکھا تو مطلع گھر میں صاف

☆ جو ل آپ کے نئی زمین اور قافیوں کی تلاش میں آپ بڑی کاوش کیا کرتے ہیں ذرا اس کی تفصیل تو بتلائیے؟

☆☆ میرا نظریہ ہے کہ غزل کا عمدہ شعر وہ ہوتا ہے جس میں کوئی نیا خیال باندھا گیا ہو یا پھر کسی پرانے مضمون کو نئے انداز میں پیش کیا گیا ہو۔ اردو میں غزل چار سو برسوں سے کہی جا رہی ہے اس لیے اب مضمون تازہ اور اسلوب نو کا حصول میرے خیال میں اسی وقت ممکن ہے جب شاعر ردیفوں اور قافیوں کی روشوں کے نال سہل سے نئی نئی زمینیں تلاش کرے۔

☆ اس کے علاوہ ایک تصور یہ بھی ہے کہ آپ اپنی آواز کو بھیڑ میں گم ہونے سے بچانے کے لیے دانستہ کئی روایتی اور غیر روایتی جتن کیا کرتے ہیں؟

☆☆ جی ہاں یہ خیال حقیقت پر مبنی ہے۔

☆ اور ایک تاثر یہ بھی ہے کہ غزل تو آپ عام اور سادہ کہتے ہیں مگر بعد از تحریر کسی نہ کسی طور اس میں اپنا گاڑھا اور چمکدار رنگ ڈالنے کی کوشش ضرور کیا کرتے ہیں؟

☆☆ میں غزل میں زبان کو نثری ساخت سے قریب رکھ کر سہل ممتنع کی مدد سے اپنا لہجہ منفرد بنانے کی کوشش کرتا ہوں اور تکمیلِ غزل کے بعد بھی اُسے مسلسل مانجھتا اور چمکاتا ہوں۔ اب یہ آپ جیسے بالغ نظر احباب فہم بتائیں کہ رنگ کتنا چمکیلا اور گاڑھا آیا ہے۔

☆ ''کئی بغیر لہو شاعر پر تکلف شعر کہتے ہیں'' آپ کے فرمان میں اشارہ کس جانب ہے اور یہ پر تکلف شعر کس طرح کا ہوا کرتا ہے؟

☆☆ پر تکلف شعر سے میری مراد اس کلام سے ہے جسے شعوری طور پر صنعتوں اور رنگین بیانیوں سے بہت زیادہ آراستہ کیا گیا ہو ایسے شعروں کی تخلیق کرنے والے میرے خیال میں بغیر لہو شاعر ہوتے ہیں

☆ کم ظرفوں کے ذکر کا تیر کس جانب چلایا کرتے ہیں؟

☆☆ جانب دار نقادوں کی طرف، جو اپنے گروپ کے متشاعروں کو بھی سچے اور اچھے شاعروں پر فوقیت دیتے ہیں کیونکہ کم ظرف شاعر کسی متشاعر کی طرح نقادوں کی خوشامد کر ہی نہیں سکتا نہ ہی نا قد پن کے جاری کردہ فرمان کو خاطر میں لاتا ہے۔

☆ ساری دنیا آج کے دور کو اجتماعی Loud اور پرشور گردان رہی ہے جبکہ آپ اسے گونگوں بہروں کی بستی سے تشبیہ دے رہے ہیں؟

☆☆ اس ہجوم دھاڑ والے نقار خانے میں سچ گفتار طوطی کی آواز نہ سننے والوں کو گونگا بہرا نہ کہوں تو کیا کہوں؟ سچی اور کھری باتیں آسانی سے کون سنتا ہے اس زمانے میں!

☆ قلم کو حرز منظور غزل کو سچ کرو'' کی ضرورت کب اور کیوں محسوس ہوئی؟

☆☆ ہمارے زخموں پہ دنیا نمک چھڑکتی ہے۔ تو ہم بھی مرچ غزل کی زباں پہ رکھتے ہیں بے حسی اور سہل پسندی کے موجودہ زمانہ اور منافقتی معاشرے میں نشتر زنی کے بغیر کام نہیں چلنے کا۔ چیخی پنچری شعری شاعری سے ساکی معنویت کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔

۲۵۔ شعار لہو میں ڈوبے ہوئے سوچ پر خون کی بو جہاد کس مقدسات کی نشان دہی کر رہے ہیں؟

☆☆ ہمارے ملک کے فرقہ وارانہ فسادات اور معاشرے میں جاری و ساری تعصب، بے انصافی اور تنگ پسندی کی طرف۔

۲۶۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے! آپ اپنے معاشرتی اور سیاسی کرب کا

سلسلہ اکثر کربلا سے جا ملاتے ہیں وجبکہ یہ بیان ہوتا آپ کے گرد وپیش کا ہے مگر کوئی خوف ہے جس کے باعث آپ برملا اس کا اظہار نہیں کر پاتے؟

☆☆ بے شک کربلا کا استعارہ میری شاعری میں کثرت سے استعمال کیا گیا ہے اکثر لوگ مجھے واشگاف لہجے کا شاعر کہتے ہیں پھر بھی غزل جیسی رمزیہ اور اشاریاتی صنفِ سخن میں باتیں اگر علامت کے وسیلے سے نہ کی جائیں تو وہ محض ہنگامی نوعیت کی شاعری ہو جائے گی ایسی شاعری کرنے والوں کو لوگ نعرے باز کہتے ہیں۔ برملا اظہار کے لیے میری نثری تحریریں کافی ہیں۔

☆ غیر جانبداری کو یار لوگ بڑی ڈھٹائی سے منافقت کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں پھر بھی آپ خود کو غیر جانبدار کہلانے پر مصر ہیں؟

☆☆ اب بھلا آپ کے یار لوگوں کی ڈھٹائی سے ڈر کر میں اپنے اصول سے کیسے منحرف ہو سکتا ہوں۔ غیر جانبدار بننے میں سراسر نقصان ہے کیوں کہ ہر فریق ایسے آدمی کو فریقِ مخالف کا آدمی سمجھتا ہے اور کوئی اس کا حامی و مددگار بھی نہیں ہوتا۔ ایک فائدہ یہ ضرور ہے کہ آپ غیر جانبدار رہ کر وہ باتیں بے باکی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں جو آپ کے خیال میں صداقت پر مبنی ہیں۔

☆ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت سے وابستگی کے بعد نظم جدید سے تعلق بھی تضادات والی کیفیت کا سماں پیدا کر رہی ہے؟

☆☆ کسی خاص ازم یا ادبی تحریک سے لاوابستگی کی وجہ سے ہی ممکن ہو سکا کہ ترقی پسندی، جدیدیت یا مابعد جدیدیت کی خامیوں سے محفوظ رہ کر اپنی شاعری میں اپنی بات کہی جا سکے اور ہر خوبی خواہ وہ کہیں بھی ملے اپنائی جا سکے۔ نظم جدید میں طبع آزمائی کرنا میرے خیال میں تو تضاد کی علامت نہیں ہے۔

☆ آپ کے تنقیدی رویے کی بابت ہم فقط ایک سوال آپ کے اپنے شعر کی روشنی بلا تشریح کے ذریعے دریافت کرنا چاہیں گے؟

کئی نقاد عظمت بانٹتے ہیں
مظفر سر بسر انکار ہو جا

☆☆ ہمارے زمانے کے نقاد ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کے سر پر عظمت کا تاج رکھ دیتے ہیں۔ عظیم شاعر تو کئی صدیوں میں ایک آدھ نکلتا ہے اردو میں میر، غالب اور اقبال ہی عظیم شاعر ہیں چنانچہ میں نے سچے شاعروں کو مشورہ دیا ہے کہ نقادوں کی عطا کردہ مصلحت آمیز عظمت کی پروا نہ کریں۔ اپنے تنقیدی مضامین میں بھی میں عظمتیں تقسیم کرنے کے خلاف ہوں۔ میرا مشہور شعر ہے

مظفر پست قد تنقید سر پر تاج رکھتی ہے
مگر اک شاعر کبھی عظمت کے چکر میں نہیں رہتا

☆ شمس الرحمن فاروقی آپ کو برصغیر کا سب سے زیادہ کہنے اور چھپنے والا شاعر کہہ کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟

☆☆ اس طرح شاید میری تحریری خدمات کا اعتراف مقصود ہو۔ ویسے میں اب سے کوئی پچاس برس ادھر راولپنڈی کے بھی کئی رسالوں میں چھپتا رہا ہوں جن میں "نیرنگِ خیال" کا نام یاد آتا ہے۔ رشید امجد، سلطان رشک، ماجد الباقری مرحوم سے اسی زمانے میں آشنائی ہوئی تھی۔

☆ ہندی دیومالائی اور اساطیری ادب کی جانب آپ کی توجہ کب اور کیوں کر ہوئی اور اس میں آپ نے کیا کارہائے نمایاں انجام دیے اور آپ کو اس میں کس طرح کا اختصاص حاصل ہے؟

☆☆ جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے نویں جماعت کے بعد مجھے ہندی میڈیم سے پڑھنا پڑا اس لیے ہندو دیومالا اور اساطیر سے واقفیت ہوئی۔ اسلام صنمیات اور اساطیر کے خلاف ہے اس لیے میں شاعری میں دیومالائی علامت اور ہندو اساطیر سے استفادہ کرتا رہا ہوں البتہ اس میدان میں کسی اختصاص کا دعویٰ ہرگز ہرگز نہیں ہے۔

☆ ''سکاروف'' سے آپ کا تعارف کب اور کیسے ہوا اور ان کی کتاب کے ترجمے کا خیال کیوں کر آیا۔ اس کے علاوہ آپ کن غیر ملکی ادیبوں اور شاعروں سے ہم کلام ہوئے اور آپ کے ہاں ان کے افکار و خیالات کا برتاؤ کس رنگ میں ظاہر ہوا؟

☆☆ حضرت! میں نے 'سکاروف' کے علاوہ انگریزی سے روسی مصنف سوخملینسکی کے 'مکالمے' آر پی پیلا گوئی کے 'تمن وتر' گجراتی کے ایک بالی ہارے اوڈیا فسانے، بنگالی ناول اور ہندی سے کئی کتابیں اردو میں منتقل کی ہیں لیکن یہ سب معاشی ضرورتوں کے پیشِ نظر کیا تھا۔ فسانہ نگاری میں البتہ چیخوف اور موپساں سے تاثر قبول کیا۔

☆ کولکاتہ یونیورسٹی نے آپ کو کس اہلیت کی بنا پر اقبال چیئر کے لیے منتخب کیا۔ یعنی اس سے قبل اقبالیات کے حوالے سے آپ کے تجربات کی نوعیت کیا تھی نیز اقبال کی شاعری اور ان کے شعری مستقبل بالخصوص بھارت کے حوالے سے آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟

☆☆ مجھے بغیر کسی درخواست یا انٹرویو کے ۱۹۸۹ء میں اقبال چیئر کی پروفیسری پیش کی گئی۔ اقبال پر چند مضامین میں نے ضرور لکھے ہیں لیکن مہارت کا دعویٰ نہیں کرتا البتہ کلکتہ یونیورسٹی میں میرا اختیار کردہ اقبال پر ایک خصوصی پرچہ ایم اے (اردو) کے نصاب میں شامل کیا گیا جو تمام طلبہ کے لیے لازمی تھا۔ کئی ریسرچ اسکالروں سے اس موضوع پر تحقیقی مقالات مکمل کرائے۔ اقبال کے نظریات اور کلام سے ۱۹۶۰ء تک ہندوستان میں بلاشبہ بے اعتنائی برتی گئی تھی لیکن اب تو ہماری بھی دانشگاہوں میں سب سے زیادہ کام اقبال کے فکروفن پر ہو رہا ہے البتہ یہاں انھیں فلسفی اور مفکر سے زیادہ شاعر کی حیثیت سے اہمیت دی جاتی ہے اور ان کا شعری مستقبل ہندوستان میں بے حد روشن ہے۔

☆ اپنی ذات کی تلاش کا سفر آپ کے ہاں مدت سے جاری ہے مگر کوئی اس سفر کی بابت نہیں جان پایا؟

☆☆ سچ کہا آپ نے مجھ سمیت سے زندگی بھر کی تلاش کے بعد کیا تھا اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے وہی حال میرا ہے بقول شخصے:

طرزِ تعمیر کے کچھ نئے زاویے عصرِ نو کو مظفر نے بخشے تو ہیں
اپنی ہی ذات پر وار کرتے ہوئے اپنی ہستی کو مسمار کرتے ہوئے

☆ ڈاکٹر صاحب! کچھ اندازہ ہے کہ انڈیا اور انڈیا سے باہر آپ کی شخصیت اور فن پر کہاں کہاں کس نوعیت کا کام ہو رہا ہے اور آپ کا کلام کن زبانوں میں منتقل ہو سکا ہو رہا ہے؟

☆☆ جی، ہندوستان میں دو محققین کو پی ایچ ڈی کی ڈگری میری ناچیز شخصیت اور ادبی خدمات کے متعلق تحریر کردہ تحقیقی مقالوں پر مل چکی ہے جن میں سے محبوب راہی کا مقالہ کتابی صورت میں ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا تھا جو بقول وزیر آغا کسی ادبی شخصیت پر اس کے دوران حیات شائع ہونے والا پی ایچ ڈی کا اولین مقالہ تھا۔ دو دیگر یونیورسٹیوں میں کام جاری ہے۔ پاکستان میں خواجہ طارق محمود نے میری تقریباً سو سو غزلوں کو غزل کی ہیئت کے ساتھ انگریزی میں ترجمہ کیا ہے حسرت موہانی اور محمد حسین آزاد پر میری کتابیں انگریزی اور ہندی کے علاوہ چند دیگر علاقائی زبانوں میں ترجمہ ہوئی ہیں۔ بہت سی نظمیں اور غزلیں انگریزی، ہندی، گجراتی، مراٹھی، بنگلہ، پنجابی وغیرہ میں منتقل کی جا چکی ہیں۔ ایک آدھ مضمون اور غزل جرمن اور روسی کی زبان میں بھی ترجمہ کی گئی ہے۔

☆ حنفی صاحب! جس قدر وقت اور توانائی آپ نے اردو ادب پر صرف کی اور جس قدر کم صلہ ملا کام سر انجام دیا اس کے بدلے آپ کیا توقعات باندھے ہوئے ہیں؟

☆☆ نادان ہوں، جریدۂ عالم پر دوام ثبت دیکھنا چاہتا ہوں لیکن یہ شعر بھی میرا ہی ہے۔

پلٹ کر دیکھنے میں راہ کھوئی ہو گئی میری
جہاں سایہ کیا سارے نقوشِ پا میں روشن ہے

☆ آنے والے وقت میں ہندوستان بلکہ برصغیر میں اردو زبان و ادب کا مستقبل کیا دیکھ رہے ہیں؟

☆☆ روشن اور خوش آئند مجھے یقین ہے کہ آج نہیں تو کل ہندوستان بھر میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملے گا اور پاکستان میں یہ سرکاری زبان کے طور پر رائج ہوگی۔ دونوں طرف ادب میں ترقی کی رفتار اطمینان بخش ہے۔

☆ اردو کی نئی بستیاں امریکہ، برطانیہ، کینیڈا، مشرقِ وسطیٰ وغیرہ سے کس قسم کی توقعات باندھی جا سکتی ہیں؟

☆☆ پیوستہ شجر سے امیدِ بہار رکھ ہمارے سنگی بستیوں میں بسنے والے تارکین وطن کے بچے عموماً اردو سمجھ تو لیتے ہیں بولتے نہیں ہیں۔ اس طرف توجہ کی ضرورت ہے۔

☆ گزشتہ دنوں ڈاکٹر گیان چند جین نے اردو زبان کو ایک فرقے سے منسوب کرنے کی جو کوشش کی اس کی بابت آپ کی رائے اور اردو کے رسم الخط کو تبدیل کرنے کی جو مذموم کوششیں ہو رہی ہیں اس کی نسبت آپ کی پوزیشن کیا ہے؟

☆☆ جین صاحب سے میرے ذاتی مراسم رہے ہیں اور وہ میری شاعری کے مداحوں میں سے تھے میں بھی ان کے تحقیقی کاموں کی قدر کرتا ہوں لیکن اپنی آخری کتاب "ایک بھاشا دو لکھاوٹ، دو ادب" میں انھوں نے انتہائی تعصب آمیز رویہ اختیار کیا، جس کی میں نے بھی پر زور مذمت کی۔ رسم الخط کو تبدیل کرنے کی کاوشیں اب دم توڑ چکی ہیں یہ ایسی ہی فرمائش تھی جیسے کسی زندہ انسان کی کھال اتار کر دوسری پہنانے کی کوشش کی جائے، افسوس تو اس بات کا ہے دوسروں کے ساتھ کچھ اردو کے بڑے نام بھی رسم الخط کی تبدیلی کے حق میں تھے مثلاً پروفیسر احتشام حسین، سردار جعفری، کرشن چندر، عصمت چغتائی وغیرہ مظاہر ہے جس نے اس تجویز کی کڑی توڑ مخالفت کی تھی البتہ تقسیم ہند سے آٹھ دس سال پیشتر گاندھی جی نے تجویز رکھی تھی کہ آزاد ہندوستان کی سرکاری زبان ہندوستانی (اردو اور ہندی) ہو جو فارسی اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جائے۔ اگر مان لیا جاتا تو یہاں اردو، ہندی پر حاوی رہتی لیکن مولوی عبدالحق نے اس تجویز کو تسلیم نہیں کیا۔ خیر یہ سب گزرے وقتوں کی باتیں ہیں۔

☆ ڈاکٹر صاحب! زیرِ نظر سوالنامہ ہم نے نہایت دیانتداری اور غیر جانبداری سے مرتب کیا ہے مگر اس کے نا مکمل ہونے کا ہرگز دعویٰ نہیں کر سکتے۔ کسی خاص موضوع یا نکتے کے حوالے سے اگر آپ اظہار خیال فرمانا پسند کریں تو چشم ما روشن دلِ ما شاد

☆☆ جی ہاں باتیں بہت سی رہ گئیں لیکن ایک انٹرویو میں سب کچھ ممکن بھی نہیں ہے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ خاکسار کی کوشش سے حکومتِ ہند کے بہت بڑے اشاعتی ادارے قومی کونسل برائے تدریسی تحقیق و تربیت (این سی ای آر ٹی) کی تیار کردہ اردو کی درسی کتب کی قیمتیں ہندی کتابوں کے مساوی رکھی گئیں ورنہ وزارتِ تعلیم کے سرکلر کے مطابق ان کی قیمت آٹھ گنا سے بھی زیادہ مقرر ہوئی تھی۔ دوسری اہم خدمت یہ ہے کہ میں نے دوسرے بڑے سرکاری ادارے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی فرمائش پر بیسویں صدی کے آخری ربع میں ہندوستان بھر میں شائع ہونے والی اردو کتابوں کی وضاحتی کتابیات باعنوان ۲۳ جلدوں میں تیار کی ہے جو شائع ہو گئی ہے ان جلدوں میں تقریباً بیس ہزار کتابوں کا مختصر تعارف ہے۔

☆

جہاں تک تنقید میں غیر جانبداری کا سوال ہے میں سمجھتا ہوں اس معاملے سے کوئی بھی نقاد عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ بشریت کا تقاضا ہے کہ کچھ چیزیں پسند آتی ہیں اور کچھ کو مزاج قبول نہیں کرتا۔ نقاد بھی بہر حال ایک انسان ہی ہوتا ہے اور اس کی بھی ذوقی پسند و ناپسند ہوتی ہے چنانچہ جب حالی جیسا ثقہ نقاد اپنے استاد غالب کی شراب نوشی کو ایسے انداز میں بیان کرتا ہے کہ یہ ایک گوارا فعل محسوس ہونے لگے اور جب محمد حسین آزاد استاد ذوق کا حلیہ بیان کرتے ہوئے ان کی سیاہ فامی کو اپنے خوبصورت اسلوب تحریر کے وسیلے سے خوبصورتی کا مترادف بنا دیتے ہیں یا کلیم الدین احمد اپنے والد کی محبت سے مغلوب ہو کر ان کی سپاٹ نظموں کو عظیم شاعری تصور کرتے ہیں تو ہمیں ان سے بدگمان ہونے کا کوئی حق نہیں پہنچتا کیوں کہ رشتے خواہ وہ استادی شاگردی کے ہوں یا خون کے فطرتاً قریبی لوگوں سے محبت کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ہزار خوبصورت بچے جمع ہوں، ماں کو اپنا لنگڑا لولا بیٹا ہی زیادہ پیارا لگے گا۔ بے ایمانی وہاں سے شروع ہوتی ہے جب یہ ماں کسی دوسرے کے توانا خوبصورت بچے کو اپنے اپاہج بیٹے کے مقابلے میں بدصورت اور کمزور ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے اسی لیے ہم حالی، آزاد یا کلیم کو یہ حق بہر حال نہ دیں گے کہ وہ غالب، ذوق اور عظیم کے علاوہ بقیہ تمام تخلیق کاروں کو ہیچ پوچ گردانیں۔ نقاد کو کم از کم اتنا غیر جانبدار تو ہونا ہی چاہیے کہ وہ ذاتی تعلقات کی بنا پر پسند آنے والے فن کاروں کے علاوہ دوسرے لکھنے والوں کے ساتھ بہر طور منصفانہ رویہ اختیار کرے۔ ادب میں ایسی جانبداری جہاں کچھ خاص لکھنے والوں کو بالا دست ثابت کرنے کے لیے حقیقی بلند مرتبہ فن کاروں کے قد گھٹا دیے گئے ہوں، ہمیشہ لائقِ مذمت سمجھی جائے گی۔

ہم عصر ادب میں اس طرح کی گھپلے بازی کا گلہ کچھ زیادہ ہی سننے میں آتا ہے لیکن ہماری ادبی تاریخ شاہد ہے کہ جانبداری کی یہ مذموم روایت عہد قدیم سے چلی آرہی ہے البتہ تناسب میں فرق مختلف ادوار میں مختلف رہا۔ محمد حسین آزاد نے ذوق کے مقابلے میں مومن اور غالب کو جس طرح گھٹا کر پیش کیا، نیاز فتحپوری نے اختر حیدرآبادی کو اونچا اٹھانے کے لیے جوش و جگر کو کمتر ثابت کیا، کلیم الدین احمد نے نظیر و عظیم کے تناظر میں بقیہ تمام شعرا کی جس طرح مٹی خراب کی اور ابھی کل کی بات ہے کہ سردار جعفری نے اقبال اور فیض جیسے ہم شعرا کو دوسرے پست قامت ہم عصروں کے مقابل صرف فراموش کرنا چاہا، یہ ماضی بعید اور ماضی قریب میں تنقیدی جانبداریوں کے چند نمونہ از خروارے مثالیں ہیں۔

یہ نہ سمجھیے کہ تخلیق کار ہونے کے ناطے میں تخلیق کاروں کی حمایت کر رہا ہوں۔ مجھ سے زیادہ اس نکتے سے کون واقف ہوگا کہ شاعر اور ادیب کے تخلیقی سوتے اظہار ذات کے سرچشمے سے پھوٹتے ہیں۔ اس لیے اگر کوئی تخلیق کار یہ کہے کہ وہ خود پسند نہیں ہے تو ہمیں اس کذب بیانی کو سچ تسلیم نہیں کرنا چاہیے لیکن ہی نہیں کرتا کہ جذبہ نیکی مکمل نفی کرنے والا شعر کہنے پر قادر ہو یا دوسرا کوئی تخلیقی کام انجام دے سکے۔ ایسے لوگ پیر پیغمبر تو ہو سکتے ہیں تخلیق کار نہیں، البتہ اچھے اور سچے تخلیق کار کی انا ایک متوازن انا ہوتی ہے۔ یہ غالب نے میر کو اور اقبال نے غالب کو بڑا فنکار تسلیم کیا ہے۔ یہ تو مریض انا کے حامل بڑے بڑے چھوٹے لوگوں کا وتیرہ ہے کہ میر، غالب اور اقبال ہوں یا عہدوں کے دوسرے اہم فنکار سب کو تحقیر تضحیک ظاہر کرتے ہوئے اپنی عظمت کے ترانے خود گانے کا قبیح فعل مسلسل اختیار کرتے ہیں۔

عام طور پر دیکھا جائے تو کم و بیش تمام تخلیق کار کم از کم اپنے ہم عصروں سے خود کو بہتر تصور کرتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ لوگ ان ہی کو اپنے عہد کا سب سے اچھا تخلیق کار تسلیم کریں۔ موجودہ دور خود اشتہاریت Self Publicity اور رابطہ عامہ Public Relations کا دور ہے اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ کمتر درجے کا فن کار اپنی فنی بے مائگی سے بخوبی آگاہ ہوتا ہے لیکن اس کی انا اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہے اس طرح جو گو مگو کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کے ردعمل کے طور پر فن کار اپنے فن کے تئیں بے اعتمادی کا شکار ہو جاتا ہے اور اپنے پوچ فن کو وزن عطا کرنے کے لیے رابطہ عامہ اور خود اشتہاریت سے کام لانے کی سعی کرتا ہے۔ کبھی رسالوں اور اخباروں کے مدیران سے تعلقات استوار کرنے کی صورت تو کبھی ناقدین اور عمائدین ادب کی خوشنودی حاصل کر کے۔ ظاہر ہے یہ کام پیسے اور عہدے کے زور پر بآسانی کیا جا سکتا ہے اور جو فن کار ان وسیلوں سے عاری ہیں ان کے پاس لے دے کر ایک خوشامد کا حربہ رہ جاتا ہے۔ جن شاعروں اور ادیبوں کا تخلیقی شعور بالغ ہے انھیں اپنی ذات اور فن پر اعتماد بھی ہوتا ہے اور وہ یقین رکھتے ہیں کہ کوئی خراب تخلیق بڑے سے بڑے نقاد کے کہنے پر بھی اچھی نہیں ہو سکتی نیز سچا ادب ناقدین کی بے اعتنائی سے مر نہیں جاتا۔

دوسری جانب نقاد بھی بہر حال انسان ہوتا ہے اور اردو ادب کا نقاد تو ہندوستانی اور پاکستانی بھی ہوتا ہے اس لیے وہ تحفے تحائف وصول کر کے خوش بھی ہوتا ہے اور خوشامد سے اثر بھی قبول کرتا ہے۔ یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ حالی اور محمد حسین آزاد ہوں یا آل احمد سرور اور شمس الرحمان فاروقی، اردو کے ننانوے فیصد ناقدین وہ ہیں جنھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز تخلیقی کاوشوں سے کیا اور اس میدان میں اپنی عدم استطاعت کا شعور ہو جانے کے بعد تنقید کا پیشہ اختیار کیا۔ ان نقادوں میں سے بیشتر ایسے عہدوں پر فائز ہیں یا ایسے وسیلے ان کے قبضہ قدرت میں ہیں جن کے زیر اثر عارضی طور پر ہی سہی، اپنے پسندیدہ مہروں کو آگے پیچھے کر سکتے ہیں۔ ان میں کوئی عصری ادب، شب خون، ذہن جدید، جیسے جریدے کا مدیر ہے تو کوئی زبیر رضوی، محمود ہاشمی یا شمیم حنفی کی طرح کسی ریڈیو اسٹیشن یا ٹیلی ویژن کا بڑا عہدیدار ہے۔ محکمہ اطلاعات کے کئی بڑے منصب دار بھی اردو کے نقاد ہوں

میں شمار کیے جاتے ہیں اور مجھ جیسے پروفیسروں کی تو ایک بڑی تعداد ہندو پاک کی دانش گاہوں میں تنقید و تحقیق کے کارخانے چلا رہی ہے کیسے ممکن ہے کہ سروں کے ساتھ خوشامد کرتے ہوئے اور گرد پھرنے والے بلکہ بعض اوقات تحفہ تحائف پیش کرنے اور مختلف طریقوں سے دیگر خدمات انجام دینے والوں کو نقادوں کی طرح اور بنا دیں۔ ان ہی تخلیق کاروں میں سے کئی اپنی کتابوں کے چھپ جانے پر بڑے اہتمام سے رونمائی اور جشن منانے کی داغ بیل ڈالتے ہیں اور نقادوں میں سے کسی کو صدارت، کچھ کو مہمان خصوصی اور متعدد کو مقالہ نگار کی حیثیت سے مدعو کرتے ہیں۔ جلسوں کی تزک بھڑک میں سنہری کرسیوں پر بٹھاتے ہیں اور طرح طرح سے ان کی خاطر و مدارات کرتے ہیں۔ اب ممکن ہے کہ ان جلسوں میں شرکت کے بعد نقاد متعلقہ کتاب اور صاحب کتاب کی بھرپور تعریف نہ کرے۔ میرا مشاہدہ ہے کہ اس قسم کی تقریبات میں باستثنیں لوگوں کو میر، اقبال اور کالی داس سے بھی بڑا تخلیق کار ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور پھر ان بے سروپا تقریروں کے کیسٹ اور اسکرپٹ، ریڈیو، ٹی وی اور اخبار و رسائل کے وسیلوں سے گھر گھر پہنچا دیے جاتے ہیں۔ اب تو یہ سلسلہ بیرونی ممالک میں جشن منانے تک پہنچ گیا ہے کہ ہمارے ادب کے حمام میں اکثر تخلیق کار اور نقاد یکساں طور پر ننگے ہیں۔ ایسے فرقتری کے عالم میں جب کوئی غالب، کوئی یگانہ، کوئی میراجی، کوئی شاد عارفی یا کوئی منتخب تنقید کی بالادستی قبول کرنے سے انکاری ہوتا ہے تو ہمارے نقاد یا تو اس کی تنقیص پر اتر آتے ہیں یا اس کی جانب سے بے اعتنائی اختیار کر کے ایسے فنکار کو وقتی طور پر قعر گمنامی میں دھکیل دیتے ہیں۔

اب کچھ عبرت ناک بلکہ ہولناک واقعات سنیں۔ کئی سال پہلے پروفیسر گیان چند کا ایک مراسلہ کئی اخبارات و رسائل میں شائع ہوا کہ ادیب شاعر انھیں اپنی کتاب (عقیدتوں کے ساتھ مفت) نہ بھیجا کریں کیونکہ بعد ازاں وہ مصنفین کا یہ تقاضا سننا پسند نہیں فرماتے تھے کہ ان کی تصنیفات پر جین صاحب تبصرے بھی کریں۔ "شب خون" میں نقاد مدیر نے شاعری کے دس اسباق شائع فرمائے کہ ہم عصر تخلیق کار ان سے استفادہ کرنے کے بعد عظیم شاعری کر سکیں۔ مدیر مرحوم مدتوں تک جدیدیت کا امر جاری کرتے رہے کہ افسانہ نگار بالجبر کہانیاں لکھیں اور آزاد نظم جیسی فضولیات میں نہ پڑیں۔ دوسری طرف ایسے ہی کچھ نقادوں کی تعبیر و تشریح کے نتیجے میں تجریدی و علامتی ادب کے نام پر کثیر تعداد میں جیسی گنجلک شاعری اور بے مفہوم افسانے منظر عام پر آئے، اسے ہماری صدی کی آخری تین دہائیاں کبھی معاف نہ کریں گی۔ غیاث احمد گدی جیسا بڑا افسانہ نگار اپنے ادبی اعتراف کو ترستا ہوا مر گیا اور ہماری تنقید بلراج مین را کی گیلی ماچس سلگاتی رہی۔ کمل ورش ملک جیسے البیلے نظم نگار اور زیب غوری جیسے اچھے غزل گو کی قدر نہ کی بے اعتنائی جھیلتے ہوئے ملک عدم کو سدھار گئے اور نقاد بلراج کومل کی معمولی نظموں اور بانی کی اوسط غزلوں کا ڈھنڈورا پیٹتا رہا۔ اور کیجیے کہ تنقیدی رویوں میں جانبداری کی طویل روایت کے باوجود اتنی دھاندلی کم از کم آج سے نصف صدی قبل نہیں تھی۔ اب تو ریاستی اردو اکیڈمیوں سے لے کر حکومت کے سب سے بڑے ادبی ادارے ساہتیہ اکادمی تک انعامات نقادوں کو خوش رکھ کر ہی حاصل کیے جا سکتے ہیں اور اپنی شان میں سوونیر نکلوانے کے بعد ہی کوئی نقاد تخلیق کار کی اہمیت کا قائل ہوتا ہے۔ تنقید تو تخلیق کی خامیاں اجاگر کر سکتی ہے۔ تنقید کی غلط کاری پر انگلی اٹھانے والا کون ہے؟ تخلیق کار کو اپنی عظمت کا ڈنکا بجوانا ہے اور انعامات کے نمبر سے اصول بھی اس کے کانوں میں بج رہے ہیں وہ صاحب کے تنقیدی عمل میں انگلی دینے سے رہا۔ فن نقاد کو غلط روی پر ٹوکنے سے رہا۔ ایک کلیم الدین احمد کبھی کبھار یہ جسارت کر لیتے تھے وہ بھی نہ رہے۔

بقیہ: حصارِ جسم سے خواہش کے زلزلے

عارفی تھے۔

مظفر حنفی نے منہ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ البتہ اپنی پہچان پر زور دیا ہے۔ ان کی شاعری میں کلاسیکی سرمائے ہی سے روشنی آئی ہے۔ ان کی شاعری کی نئی جہت بھی اس کی مرہونِ منت ہے۔ میر، غالب اور فراق کے ہم عصر نہ سہی لیکن ان کی شاعری میں سوچ کے ایسے زاویے ملتے ہیں جس نے ان کی غزل کو نئی معرفت عطا کی ہے۔ اب تو عظمت کا لفظ پامال ہو چکا ہے۔ اردو کے کم شعراء ہیں جن کو عظیم کہا جا سکتا ہے۔ عظمت کا درجہ بہت بڑا ہے اور اس کے مدارج ہیں۔ لیکن مظفر حنفی کی شاعری میں سوچ کے وہ زاویے بھی ملتے ہیں جن میں بڑائی کے آثار موجود ہیں۔ ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

جنوں بھی ایک نیا انکشاف کرتا ہے
کہ بلبلے کا سمندر طواف کرتا ہے

ڈھلتے ہوئے سورج سے بُرے حال پڑے ہیں
ہم رات کی راہوں میں بھی تن کے کھڑے ہیں

حصارِ جسم سے خواہش کے زلزلے نہ رکے
غبار بیٹھ گیا اب ہوا کے نہ رکے

تجھے خیال میں لے جاؤں گا کہیں بھی میں
کہ آسماں بھی میں ہوں، زمیں بھی میں

بعض الفاظ کا محل کھٹکتا ہے۔ مثلاً اس شعر میں:

کچھ ادھوری کاملوں کا اس طرح پیچھا کیا
خواب کی چٹان سے پاؤں پھسل کر مر گیا

شاید یہ لفظ تحریر تخریب کے مروج ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ مظفر حنفی کے کلام میں سوچ کے جو نئے زاویے پائے جاتے ہیں اور وہ شاعری میں جو نئی جہت کا احساس ہوتا ہے وہ گوشے ہمارے سامنے نہ آتے تو ہمارے شعری سلسلے میں ایک بڑی کمی ہو جاتی۔

''رقص کرتا ہے قلم''

پروفیسر مظفر حنفی کے غزلیہ کلام سے مختصر انتخاب

پرویز مظفر (برمنگھم)

پوچھ ہوا سے پھولوں میں تقریریں کرتی ہے
دیکھ ندی کو موجوں کی زنجیریں کیا کرتی ہے

دیواروں پر، دیواروں میں، پردوں پر، پردوں میں
قدرت آخر یہ لاکھوں تصویریں کیا کرتی ہے

مصلحتوں کے سب دروازے بند کیے بیٹھا ہوں
دنیا مجھ تک آنے کی تدبیریں کیا کرتی ہے

بیداری کا دکھ سہنا ہے خواب سنا کر دیکھیں
سادہ لوحی خوابوں کی تعبیریں کیا کرتی ہے

میرے گھر میں جو کچھ بھی ہے موج بلا ہے تیرا
لے جا جو چاہے، بے جا تقصیریں کیا کرتی ہے

کچے پکے ارمانوں سے جگ مگ کرتی دنیا
اتنی ساری بندوقیں شمشیریں کیا کرتی ہے

یار مظفر فکر رسا پر لازم ہے کچھ قدغن
ریت گھروندوں جیسی یہ تعمیریں کیا کرتی ہے

○

آ گیا میں کسی جگنو کی نظر میں کیسے
بوند بھر نرم اجالا مرے گھر میں کیسے

سرخ آندھی نے بڑا شور مچایا کل رات
گھر بنائے ہیں پرندوں نے شجر میں کیسے

میں تو سمجھا تھا بہت دور نکل آیا ہوں
تو دھواں دھار مری گرد سفر میں کیسے

سب رگیں سوکھ گئیں دل کی جڑوں سے کٹ کر
برگ و بار آئیں بھلا شاخ ہنر میں کیسے

وسعتیں مجھ کو خلاؤں سے صدا دیتی ہیں
یہ نشیمن کی گرہ پڑ گئی پر میں کیسے

کھل گئے پھول لفافے پہ ترے نام کے گرد
رقص کرتا ہے قلم زیر و زبر میں کیسے

ایک ہی خون میں دو رنگ مظفر حنفی
آ گیا تو مرے دشمن کے اثر میں کیسے

○

''چارسو''

نیزہ بردار و کماں دار مرے گھر میں نہیں
وہ دلاور ہوں کہ تلوار مرے گھر میں نہیں

کوئی سیلاب ادھر رخ نہ کرے گا اب کے
اب سلامت کوئی دیوار مرے گھر میں نہیں

جن کو سورج پہ بھروسہ ہے بجھاتے ہیں چراغ
کوئی اس کے لیے تیار مرے گھر میں نہیں

میں نہ یوسف، نہ زلیخا، یہ تماشہ کیا ہے
دوستو مصر کا بازار مرے گھر میں نہیں

لائق دید مری بے سرو سامانی ہے
کوئی گنبد، کوئی مینار مرے گھر میں نہیں

گٹھلیاں میرے پڑوسی نے اچھالی ہوں گی
ایک بھی شاخ ثمر بار مرے گھر میں نہیں

یہ الگ بات مظفؔر ہی نہ مانے خود کو
ورنہ غالبؔ کے طرفدار مرے گھر میں نہیں

○

خون کے داغ آستیوں پر
اور تمغے انھیں کے سینوں پر

ایک ذرّے نے لی تھی انگڑائی
آسمان آ پڑے زمینوں پر

ہم ستارے بنا کے نادم ہیں
آپ نازاں ہیں آبگینوں پر

ہے کہیں گرد باد یا گرداب
دُھول اُڑنے لگی سفینوں پر

وہ تو انگارہ سے دہکتے ہیں
دل پھسلتا ہے جن حسینوں پر

عشق کرنا کوئی ضروری ہے
شعر کہہ لیں گے نازنینوں پر

اے مظفر سُنی غزل تیری
نُور سا آگیا جبینوں پر

○

رقیبوں سے بھی وہ اظہار بیزاری نہیں کرتے
اِدھر ہم ہیں کہ خود اپنی طرف داری نہیں کرتے

اُگل دیتے ہیں جو کچھ پیٹ میں ہو کر میں آتے ہی
پرندے اپنے بچّوں سے اداکاری نہیں کرتے

ہمیں جینے کی خواہش ہے کوئی تدبیر کرنے دو
اگر مرنا ہے، مر جائیں گے تیاری نہیں کرتے

یہ نکتہ کس طرح سمجھائیں ہم اہل سیاست کو
کہ دل تسخیر کرنے ہوں تو بمباری نہیں کرتے

کلی کا مُسکرانا بھی گراں ہے طبع نازک پر
ہوا کے نام اِک فرمان کیوں جاری نہیں کرتے

مظفر برگِ گُل سے پتھروں کو کاٹ سکتے ہیں
مذمت اب غزل کی خوئے انصاری نہیں کرتے

○

سچ ہے کچھ یادوں کے بدلے ہم نے دل کو بیچ دیا ہے
تم نے تو ماضی کے ہاتھوں مستقبل کو بیچ دیا ہے

طوفاں سے کیا باتیں کی ہیں، پیارے مانجھی سچ بتلانا
دریا کو گروی رکھا ہے یا ساحل کو بیچ دیا ہے

پھولوں کی اونچی مسند نے خوب چمن بندی فرمائی
پھونک دیے آباد نشیمن آب و گِل کو بیچ دیا ہے

سیلابوں کی زد میں آکر جلنے سے محفوظ ہُوا گھر
میں بھی خطرے سے باہر ہوں سر قاتل کو بیچ دیا ہے

پیروں میں چھالے باقی ہیں، راہوں میں کانٹے کافی ہیں
اونچی قیمت پا کر ہم نے پھر منزل کو بیچ دیا ہے

○

ڈوب جاتا ہے یہاں تیرا آنا ہے جسے
وہ کبھی ناؤ کبھی دریا لیے جاتا ہے جسے

تیرا سایہ ہے لرزتا ہے جسے دیکھ کے تو
اور آئینہ ہے تو آنکھ دکھاتا ہے جسے

باغباں بھی ہے یہی وقت، یہی گلچیں بھی
توڑ لیتا ہے وہی پھول اُگاتا ہے جسے

ساری بستی پہ نہ لے آئے وہ آفت کوئی
کون ہے کوہ ندا روز بلاتا ہے جسے

ہم تو خوشبو کی طرح خود ہی بکھر جاتے ہیں
تم وہ دیوار کہ مزدور اُٹھاتا ہے جسے

ٹوٹے رشتے بھی اُس درد سے جڑ سکتے ہیں
آدمی پاؤں کی زنجیر بناتا ہے جسے

یہ چمکتی ہوئی آنکھیں، یہ دہکتے ہوئے لب
ہے کوئی بات مظفر سے چھپاتا ہے جسے

○

پہلے لہو سے کھینچ کے تیزاب لے گیا
پھر بوند بوند دیدۂ خوں ناب لے گیا

بگڑی خدا کرے نہ بنے اس طرح کبھی
جیسے ہمیں کنارے پہ گرداب لے گیا

تم گھر جلانے آئے تہہ دل سے شکریہ
لیکن مرا اثاثہ تو سیلاب لے گیا

سورج کھڑا ہے در پہ کہ چکتا کر و خراج
دو بوند روشنی تھی سو مہتاب لے گیا

دشمن میں اور دوست میں کیا رہ گئی تمیز
بس یہ کہ کوئی نیند، کوئی خواب لے گیا

لنگر نے بادباں کو اشارہ کیا کہ ہاں
اَب کیا بتائیں کون تہہ آب لے گیا

قسمت ہے بار بار مظفر کی کائنات
دیوان پھر بغل میں کوئی داب لے گیا

○

سائے اپنے ساتھ لے آتے ہیں آلائش بہت
مَیں نے گھر میں دُھوپ کی رکھی ہے گنجائش بہت

زُود حس ہوں، میں خراشوں کو بنا لیتا ہوں زخم
اُس نے لکھی تھی مری قسمت میں آسائش بہت

زندگی سے لطف لینا خوب آتا ہے مجھے
درد میں لذت بہت، زخموں سے زیبائش بہت

ہر کلی، ہر پھول کو دھڑکا کسی گلدان کا
تتلیوں کی جان کو البم کی آرائش بہت

تیرہ بختی میں کھلی آنکھوں کا ہے سارا قصور
ورنہ آنکھیں بند کر لیجے تو آسائش بہت

رنگ و بُو اپنی جگہ آنکھوں میں نم بھی چاہیے
آج پھر شبنم نے کی پھولوں کو فہمائش بہت

ہر طرف سے تیر جیسا ہے مرا ایک ایک شعر
اے مظفر بے ضرر غزلوں کی فرمائش بہت

○

خود پہ جو یقیں ہوتا، پاگل بھی نہیں بنتے
جھکتی نہ اگر گردن، مقتل بھی نہیں بنتے

مدت سے میری آنکھیں بس گرد اڑاتی ہیں
دریا بھی نہیں بنتے، بادل بھی نہیں بنتے

موجودہ زمانے کی آنکھوں میں حیا کم ہے
مٹی کے چراغوں پر کاجل بھی نہیں بنتے

ہر آدمی اندر سے شاداب اگر ہوتا
ہر شہر میں جسموں کے جنگل بھی نہیں بنتے

ہم بھوک اگاتے ہیں کھیتوں میں، ہمارے گھر
سبزی بھی نہیں پکتی، چاول بھی نہیں بنتے

کچھ لوگوں کی قسمت ہی زائیدہ ہے ظلمت کی
جلتے ہیں دھواں دیکر، مشعل بھی نہیں بنتے

شعروں میں مظفرؔ کے قائم ہے طرحداری
ہر چند کہ محفل میں افضل بھی نہیں بنتے

○

مرتبے رنگ نے، خوشبو نے، ہوا نے پائے
خار تھے ہم ترے نزدیک نہ آنے پائے
آج بستی میں بپھرتا ہوا سیلاب آیا
کہ گھروں کو نہ کوئی آگ لگانے پائے
ہم بھی جاتے ہیں کھنچے سے لگائے غم کو
دیکھیے حال وہاں کون سنانے پائے
ہر قدم ساتھ رہا پاسِ ادب صحرا میں
گردِ وحشت بھی نہ جی بھر کے اڑانے پائے
گُل بھی کر دے مجھے آندھی تو نہ گھبرا تو
روشنی، دیکھ، مری بات نہ جانے پائے
شہر بھر میں نہیں اک باغ مظفرؔ صاحب
غول چڑیوں کا جہاں شور مچانے پائے

○

ریت کا جسم ڈھ نہ جائے سب
خون آنکھوں سے بہہ نہ جائے سب
وار سینے پہ ہنس کے جھیلتا ہے
تیر تلوار سہہ نہ جائے سب
بھید گہرائیوں کے نکلیں سے
سر پھری موج کہہ نہ جائے سب
چھانٹ کر بات کہہ نہیں سکتا
جی کی جی ہی میں رہ نہ جائے سب
شعر کہتے رہو مظفرؔ جی
جب تلک دردِ تہہ نہ جائے سب

○

''سمندر کو آداب کرتے رہو''

پروفیسر آل احمد سرور (●)

مظفر حنفی جدید اُردو غزل کا ایک محترم نام ہے کوئی ایسا اہم ادبی رسالہ نہ ہوگا جس میں اُن کا کلام شائع نہ ہوا ہو۔ اس کی تصانیف کی تعداد بھی خاصی ہے۔ شاد عارفی کی شخصیت اور فن پر ان کی کتاب ارباب نظر سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ جدید غزل کے جلوۂ صد رنگ میں ان کی کرنوں کی روشنی اور گرمی سے کون واقف نہ ہوگا۔

کسی شاعر کی خصوصیات کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ خود شاعر کے اپنے اعترافات کو سب سے پہلے دیکھا جائے۔ مظفر حنفی کے یہ اشعار اس سلسلہ میں ہماری خاصی رہنمائی کرتے ہیں۔

شعروں کے یہ تیر مظفر جیسی کمانیں غزلوں کی
تم جس لہجے میں کہتے ہو شمشیر و سناں کیا ہے
زمین تو سخت ہے مظفر مگر تمہاری غزل کا لہجہ
رواں دواں آبشار جیسا ظہور کی خوش نوائی سا کچھ

ہاں مظفر کی غزل ہے تو جدید
اے روایت کے امیں تو سکی
قلم کو تیز مظفر غزل کو تیغ کرو
نہ باز آئے گی دنیا تمہیں ستانے سے
اے مظفر ترے اشعار لہو میں تر ہیں
سوچ پر خون کی بوچھار عدو ہے کہ اٹھی
نہ پوچھئے کہ یہ لہجہ کہاں کا حصہ ہے
کھری زبان مرے جسم و جاں کا حصہ ہے
لہو کی بوند ہر اک لفظ کو عطا دل کی
بقیہ سب مری طبع رواں کا حصہ ہے

اور یہ شعر بھی غور طلب ہے۔

مری زمین رہی آسماں پہ چھائی ہوئی
مگر غزل کی کمائی کوئی کمائی ہوئی

یعنی یہ شعروں کے تیر اور غزلوں کی جیسی کمانیں' یہ سخت زمین اور رواں دواں آبشار کا سا لہجہ' لہو میں تر اشعار' یہ کھری زبان' یہ دل کے لہو کی بوند' یہ آسمان پر چھائی ہوئی زمین' یہ سب باتیں مظفر حنفی کے لہجے اُن کی کھردری تیغ کی سی تیزی رکھنے والی زبان کے متعلق کیا کچھ نہیں کہتیں۔ ان اشعار میں دھیمی دھیمی بہنے والی جوئے آب کی سی بہتی ہوئی روانی نہیں ہے۔ پہاڑی چشمے کی سی تند و تیز لہر ہے۔ ان کے اشعار میں تلوار کی کاٹ ہے۔ ایک برہم نوجوان کے لہجے کی تلخی ہے۔ اس میں کچھ توڑنے اور پھر کچھ جوڑنے کی بات بھی ہے۔ اس میں بگاڑ اور نئے سرے سے بناؤ کی داستان بھی ہے اور اس میں غزل کی کمائی سے کچھ نا آسودگی کی آہٹ بھی۔ یہ ایک سرکش روح کی کہانی ہے اور ایک باغی کا خواب۔ زندگی کا کتنا زہر پی کر یہ مسرت حاصل ہوا ہے۔

مظفر حنفی کے شعر پڑھیے تو شاد عارفی کا خیال ضرور آتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ شاد کے یہاں طنز کی کاٹ زیادہ تھی۔ پھر بھی شاد کا لہجہ مظفر کے یہاں جھلک ہی جاتا ہے۔

رقص بسمل کا تو سرکاری میں ہوتا ہے شمار
آپ کا خنجر چلا بھی طرحداری میں ہے
شریعت نہ فرما تصوف نہ کر
محبت میں گردن کٹا اُف نہ کر
بلا سے تجھے پار ہو تشنگی
سمندر کو آداب کرتے رہو
عشق کیا کوئی ضروری ہے
شعر کہہ لیں گے نازنینوں پر

میں نے جدید غزل کو ایک جلوۂ صد رنگ کہا تھا لیکن اس میں اب کسی سرخ سویرے کے خواب کے بجائے خواب اور حقیقت کی کشمکش اور دونوں کی شکست و ریخت' شخصیتوں کا دو نیم ہونا' انجمن میں تنہائی کا احساس' سیاست کے طلسم' بھیس بدل بدل کر آنے والے لات و منات' سیاہ و سفید رنگوں کے علاوہ میلے مٹیالے رنگوں کا عرفان' فرشتوں میں شیطان اور شیطانوں میں فرشتے' ترقی کی برکتوں کے ساتھ اس کی لعنتوں کا احساس' گنجان شہروں کی تعمیر میں فطرت کے خزانوں کی پامالی' عقلیت کی بنیادوں میں زلزلہ' زندگی کی لغویت اور لامعنویت کا احساس' مادیت کی آمریت' غرض دیکھتے ہی دیکھتے تغیرات کا ایک بھیانک اور روح فرسا منظر اور ان سب کے ساتھ انسان کے اندر اُمید کی وہ کرن' دردمندی اور دل سوزی' دل دہی اور دلداری کے وہ جلوے جو اس جہنم کو بھی گوارا بنا دیتے ہیں ہمارے جدید شعراء کے یہاں اپنے اپنے اسلوب' انداز' لہجے' طرز میں مل جائیں گے۔ پھر سوال یہ ہوگا کہ مظفر حنفی کا طرز یا انداز یا اسلوب کیا ہے' اُن کی انفرادیت کس بات میں ہے۔ اُن کی پہچان کیا ہے۔ اس سوال کے جواب میں ان کی یہ غزل ملاحظہ فرمائیں۔

ڈوب جاتا ہے یہاں تیرا آتا ہے جسے
وہ بھی ناؤ تھی دریا لیے جاتا ہے جسے
تیرا سایہ ہے' لرزتا ہے جسے دیکھ کے تو
اور آئینہ ہے' تو آنکھ دکھاتا ہے جسے
باغباں بھی ہے کسی وقت یہی گلچیں بھی
توڑ لیتا ہے وہی پھول' اُگاتا ہے جسے
ساری بستی نہ لے آئے وہ آفت کوئی

کون ہے کو صدا روز بلاتا ہے جسے
ہم تو خوشبو کی طرح خود ہی بکھر جاتے ہیں
تم وہ دیوار کہ مزدور اٹھاتا ہے جسے
ٹوٹے رشتے بھی اس ڈور سے جڑ سکتے ہیں
آدمی یادوں کی زنجیر بناتا ہے جسے
یہ چھلکتی ہوئی آنکھیں یہ دھڑکتے ہوئے لب
ہے کوئی بات مظفر سے چھپاتا ہے جسے

زندگی کے تضادات' وقت کی چیرہ دستیاں' یادوں اور آنسوؤں کے غم' پابندیوں میں آزادی' جذبات کی اپنی منطق غرض مظفر ان اشعار میں زندگی کے تجاذبات کے ساتھ اس کے امکانات بھی دکھانے پر قادر ہیں۔ ان کے یہاں نئی روشوں اور جدول اختراع "ریشے کی نئی دیوار" کے ساتھ قدرت کلام کے ساتھ مضامین کی جدت کے ساتھ ایک تازگی اور شعریت کا احساس بھی ہوتا ہے مگر دوسرے پن پر بھی اور کہیں کہیں بیزاری کے باوجود گھلاوٹ اور شیرینی بھی ملتی ہے اس لئے میں نے شروع میں ان کے کلام کی خصوصیت کو واضح کرنے کے لئے تیغ ستم شیریں کی عبارت' اشارات اور ادا سے کام لیا تھا۔ یہ اشعار بھی دیکھئے

غزل کو سینچے کا' استعارے توڑنے کا
اٹھو کہ وقت یہی ہے ستارے توڑنے کا
خود اپنے آپ کو پایاب کرتی رہتی ہے
عجب جنوں ہے ندی کو کنارے توڑنے کا
سچ بولنے لگے ہیں کئی لوگ شہر میں
دیواریں اُٹھ رہی ہیں نئے قید خانے کی
ہمارا کیا جسم یہاں ہیں ہم
وہی پانی وہی برتن ہمارا
کیسے مر مر کے چکاتے ہیں ہر اک سانس کے دام
لوگ جینے کے بہانے تو بنالیتے ہیں
جذبہ بیدار نہیں ہوتا اور ابل پڑتے ہیں شعر
بچے ماں کی انگلی کھینچے آگے آگے چلتے ہیں
اس کو مرہم اس کا تازہ میرے شعر
لکھے بیٹھے تازہ تازہ میرے شعر
مٹی اور پسینہ مل کر خوشبو دینے لگتے ہیں
یوں سب کو نئی ہوا نے عالم کیا اور جاہل کیا
چلے تھے کارواں کے ساتھ پھر مڑ کر نہیں دیکھا

اس شعر کو پڑھ کر یگانہ کا ناری کا یہ شعر یاد آجاتا ہے' گو حنفی نے اپنی آن قائم کر رکھی ہے

صد رہتی وصد ہدم پر شکستہ و دل تنگ
دیوانگی نسبد بال و پرے من تنہا

دنیا کا وہ سلوک ہمارا وہ زہر خند
انمول آنسوؤں کا لٹاتے خزانہ کیوں
اس بی بی کا کلام ہوتا تھا حضرت عشق فدا تھے جس پر
حضرت نے ہجرت فرمائی' بی بی نے پردہ فرمایا
زمیں ہم کو جکڑتی ہوئی قدم بہ قدم
ہم آسمانوں کو زیر کمند کرتے ہوئے
کہاں ہے تیرا قبیلہ کہ راہ دے پانی
عصا نہیں ہے تو جادوگروں سے جنگ نہ کر
میرا اثاثہ اپنی ذات' آپ حریف کائنات
سوچ سکیں تو آپ سے میرا جہاد کم نہیں
سب نے چنگاریاں بو رکھی تھیں
تتلیاں کیسے اگتیں ہم تو کیا
ہم بھوک اگاتے ہیں کھیتوں میں ہمارے گھر
سبزی بھی نہیں پکتی چاول بھی نہیں بچے

اس شعر کو پڑھنے کے بعد فیض کی مشہور نظم "موضوع سخن" کا یہ شعر یاد آتا ہے

وہ حسیں کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
کس لیے ان میں فقط بھوک اُگا کرتی ہے

دلچسپ بات یہ ہے کہ جب فیض نے یہ شعر کہا تھا (غالباً ۱۹۴۲ کی بات ہے) تو جگر صاحب علی گڑھ میں تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ فیض نے بھوک اُگا کہہ کر غلطی کی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ یہی غلطی ہے جو عصر صاحب کے عصر سے چہک رہا ہے جو دورِ ستارہ سحری میں ہے یعنی استعارے کی توسیع۔ جگر صاحب منکسر مزاج تھے۔ انہوں نے میری بات مان لی۔ اور فیض پر اعتراض واپس لے لیا۔ سوچئے مظفر صاحب نے کس طرح فیض کے چراغ سے چراغ جلایا ہے۔ عرصہ ہوا سیماب اکبرآبادی نے کہا تھا۔

کہانی میری روداد جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

مظفر حنفی نے اپنے طور پر یہی بات کہی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہاں بھی اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے

جیسے غزلوں میں شامل ہو پڑھنے والے کی سوچ
یہ کانوں مظفر صاحب کیا کیا رنگ بولتے ہیں

قاری اساس تنقید کے علم بردار یقیناً مظفر صاحب کے اس شعر پر مسرور ہوں گے۔ مظفر حنفی کی غزلیں جدید غزل کے تیغ ترش و شیریں عناصر کی بڑی اچھی نمائندگی کرتی ہیں۔

''بوند بھر زم اجالا''

ڈاکٹر وزیر آغا (لاہور)

ڈاکٹر منظر حنفی ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت ہیں۔ ایک طرف وہ دانشوری کی اس روایت سے منسلک ہیں جو تعصب یا اسدوری کی سطح سے بلند ہو کر ذات اور کائنات پر تحمل مزاجی سے نظر ڈالنے کی ہے اور دوسری طرف وہ ایسے فنکار کی حیثیت میں ابھرے ہیں جو جمالیاتی ذوق کی اساس پر تخلیق کے حسن و قبح کے بارے میں پورے تیقن کے ساتھ اپنے تاثرات پیش کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ وہ جدید اُردو ادب کے علمبردار غالباً پہلے زندہ تخلیق کار ہیں جن پر پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ لکھا گیا۔ یقیناً وہ اس اعزاز کے مستحق تھے۔ بحیثیت شاعر ان کے فن کا ابھی پوری طرح اعتراف نہیں ہوا حالانکہ انہوں نے اُردو غزل میں ایک نیا ذائقہ پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ یہ نیا ذائقہ شاد عارفی کے کلام سے ان کے گہرے تعلقِ خاطر کی دین ہے۔ شاد عارفی معاشرے کی کروٹوں کے نہایت زیرک نباض تھے۔ اور ایک طنز آلود نظرِ عمیق کی مدد سے اشیاء، افراد اور رویوں کی ناہمواریوں کو زیرِ لب تبسم کے ساتھ نشان زد کرنے میں بہت کامیاب تھے۔ منظر حنفی نے جب غزل کے میدان میں قدم رکھا تو ان کے ہاں شاد عارفی کا طنزیہ اور ہجویہ انداز زیرِ لب تبسم کے بجائے تغزل کی لطیف ترین کیفیات سے مملو ہو کر ایک ایسے نئے انداز اور لہجے میں ابھر آیا جو ان کے معاصرین کے ہاں نہیں تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ شاد عارفی نے سامنے کی اشیاء کی موجودگی کو محسوس کرنے کے جس میلان کو اپنایا تھا اُسے منظر حنفی نے غزل کے نازک اور لطیف پیالے میں پیش کرنے کی کامیاب سعی کی۔ یہ ایک بے حد مشکل کام تھا کیوں کہ غزل کی امیجری بالعموم شفاف (Trasnsparent) ہوتی ہے اور اس میں موجود کے مقابلے میں ماورا اور شے کے بجائے اس کی پرچھائیں کو چھونے کا رویہ بہت نمایاں ہوتا ہے۔ چنانچہ منظر حنفی کو تخلیق کی کارگہِ شیشہ گری میں بیٹھ کر ایک ایسا پیالہ خلق کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی جس میں غزل کے پیالے کی شفافی (Transparency) گاڑھے مشروب کے باعث اپنی تابندگی سے محروم نہ ہونے پائے۔ یہ ایک ایسا نازک مرحلہ تھا جہاں شیشہ گر کے سانس کی ذرا سی جنبش سے بھی شیشے میں بال آ سکتا تھا۔ منظر حنفی اگر اس مرحلے سے بخیر و خوبی گزر سکے ہیں تو یہ بات اُن کے ہاں اس لمحۂ خود فراموشی کی رہینِ منت ہے جس میں تخلیق کار کے سانس کا زیر و بم الفاظ کے فطری بہاؤ سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو جو اس شعبدہ بازی کی نہایت عمدہ مثال ہے

آگیا میں کسی جگنو کی نظر میں کیسے
بوند بھر زم اُجالا مرے گھر میں کیسے

آپ دیکھیں کہ کس طرح ایک جیتا جاگتا واقعہ اپنی تمام تر عینیت کے ساتھ شعر کے نازک پیالے میں اس طور پیوست آیا ہے کہ پیالے کی شفافی کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ گئی ہے۔

شاعر کسی بھی شعری صنف کو اظہار کا ذریعہ بنائے زندگی کے معاملات منقلب ہو کر اس میں ضرور شامل ہو جاتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ نظم میں واقعات اور معاملات کا "ٹھوس وجود" اپنے ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے یوں کہ کہانی کی قاشیں نظم کے تار و پود میں تمثالوں کی صورت شاعر کو ذہن اور اس کے مظاہر کی کششِ ثقل میں جکڑے رکھتی ہیں جب کہ غزل میں واقعات پس منظر میں موجود تو ہوتے ہیں مگر غزل کے خاص رنگ کی چھینٹ پڑنے سے مبہم اور بے چہرہ ہو جاتے ہیں۔ دراصل غزل ایک پر اسرار دھند پیدا کرتی ہے جو کسی ہی دھند جیسی نیاگرا یا دوسری بڑی آبشاروں پر ہمہ وقت تنی رہتی ہے۔ ایسے میں نظر کے خورد بینی زاویے کی جگہ دور بینی لے لیتا ہے یعنی زندگی کو قریب کے بجائے دور سے دیکھنے کا انداز ابھر آتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تجریدیت اور ماورائیت کی دھند جو غزل کی فضا میں عام طور سے موجود ہوتی ہے، دیکھنے کے اس خاص انداز ہی کے باعث ہے۔ چنانچہ غزل میں 'محبت' کے بجائے 'عشق' ایک مخصوص چہرے مہرے اور خدوخال والی عورت کے بجائے معشوق (بصورت منزل بجائے نظر مرکزِ ذات) اور شخصی غم کے بجائے غیر شخصی "دکھ" (وہی جس کا ادراک گوتم کو ہوا تھا) سے منسلک نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں غزل ماورا کو یا "عظیم تجربے" کے اسرار کو چھونے میں کامیاب تو ہوتی ہے اور یہاں وہاں غزل کے اشعار تخلیق بھی ہو جاتے ہیں جو اپنے پر اسرار وجود کے باعث ابدیت کے حامل قرار پاتے ہیں مگر بڑے پیمانے پر ایسا نہیں ہوتا اور موجود سے فاصلے پر ہونے کے باعث غزل میں کلیشوں اور پیش پا افتادہ تصورات اور خیالات کی تکرار ابھر آتی ہے۔ جدید غزل نے اس صورت حال سے نکلنے کے لئے نظم سے استفادہ کیا ہے اور وہ "فاصلہ" جو غزل نے "موجود" اور "ماورا" میں قائم کر رکھا تھا اُسے ذرا کم کرنے کی سعی کی ہے۔ چنانچہ سامنے کی اشیاء اپنی ٹھوس موجودگی کا احساس دلاتی تغزل کے آنچل پر ستاروں کی طرح چمکنے لگی ہیں۔ منظر حنفی جدید غزل کے اس خاص انداز سے بھی آگے گئے ہیں اور انہوں نے بڑی دلیری سے غزل کو اس کے اطلاق میں بھی کہانی سے اس طور متعارف کرایا ہے کہ فاصلے کم ہو گئے ہیں۔ ہر چند کہ غزل کی مخصوص خوشبو اور دھند بدستور موجود ہے مگر کہانی کے نقوش مدھم نہیں پڑے جیسا کہ غزل میں عام طور سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر انسان کی زندگی کا محور وہ جنسی رشتہ ہے جو مرد اور عورت کے درمیان کئی مراحل سے گزرتا ہے۔ کلاسیکی غزل نے زیادہ تر اس کے محض ایک مرحلے یعنی عشق (وہ بھی زیادہ تر

ناکام عشق) کو موضوع بنایا تھا۔ مگر مظفر حنفی نے اپنی غزل میں قاشوں اور ٹکڑوں کی صورت میں ساری کہانی بیان کر دی ہے۔ میں یہاں ان کے چند اشعار ایک خاص ترتیب کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔ آپ دیکھیں ان میں کس طرح پوری ازدواجی زندگی اپنی جملہ کروٹوں کے ساتھ ابھر آتی ہے:

کھل گئے پھول لفافے پہ ترے نام کے گرد
رقص کرتا ہے قلم زیر و زبر میں کیسے
(محبت)

آ گیا میں کسی جگنو کی نظر میں کیسے
پھر بکھر نرم اجالا مرے گھر میں کیسے
(شادی)

دستکیں مجھ کو خلاؤں سے صدا دیتی ہیں
یہ نشیمن کی گرہ پڑ گئی پر میں کیسے
(نیا گھر)

سانس لیتی ہے زمیں بن تو سکی
بیج پھوٹا ہے کہیں نمی تو سکی
(بچے کی پیدائش)

گھروندے کو بنایا ریت نے کس دردمندی سے
کرخت ہو کے کوئی آواز دیتا ہے بلندی سے
(ازدواجی جھگڑا)

بدل رہا ہے ہمارے تعلقات کا رنگ
پرانے پیڑ کے پتے نہیں بدل جاتے
(جذبات میں تبدیلی)

ہم اپنے آبلوں سے راستے گلنار کرتے ہیں
ہمارے پاؤں پر قوس قزح بیدار کرتی ہے
(کام کا بیوی سے فرار)

سائے نکل رہے ہیں چراغوں کی گود میں
سمجھے تھے ہم کہ گھر سے اندھیرا نکل گیا
(ردِعمل)

ہونے لگا ہے ماں کی دعا میں غلط اثر
بیٹی تو گھر میں بیٹھی ہے بیٹا نکل گیا
(گھر کا بحران)

ایسے میں گھر سے باہر ہے بے گھر میں بیٹے کا قرض
باقی باپ کہیں زنداں میں ماں دیوانی گھر میں ہے
(شکست و ریخت)

اور بوڑھے ہاتھ اٹھائے سو گئے تھے دو چار درخت

پہلے من پر بجلی ٹوٹی، ویسے بادل برسا بھی
(آخری ایام)

بچوں کا نہیں ذکر کہ تہذیب و ادب سے
بیگانہ ہیں کچھ اہل ادب تک مرے سوا
(زوالِ تہذیب)

یہ کسی خاص شخص کی کہانی نہیں۔ انسان کی (بالخصوص معاشرتی انسان کی) کہانی ہے اور یہ کسی واقعاتی تسلسل کے ساتھ نہیں بلکہ یہاں وہاں آگے پیچھے غزلوں میں بکھری پڑی ہے۔ محبت، شادی، بچے، رنجش، دوریاں، بیٹے کی بغاوت، کنواری بیٹی کا وجود، گھر سے فرار کی خواہش، ندامت، افسوس، احساسِ شکست۔ یہ ایک عمومی داستان ہے کہ اس کے پس منظر میں لاتعداد واقعات موجزن ہیں۔ غزل کا عام انداز بھی ہے کہ اس میں زندگی کے واقعات، سانحات پیچھے دھکیل دیے جاتے ہیں اور ان کے اثرات کی دھند اوڑھ لی جاتی ہے مگر مظفر حنفی کی غزل نے واقعات کو دھند میں تبدیل کرنے کے باوجود انھیں کسی نہ کسی حد تک باقی رکھا ہے اور قاری اگر پسند کرے تو مختلف غزلوں سے واقعات کی قاشیں چن کر کہانی کو اپنے طور پر مرتب کر سکتا ہے۔ اس خاص انداز میں مظفر حنفی کی غزل کو ایک نیا لہجہ اور ذائقہ بخشتا ہے جو کم کم ہے۔

مظفر کی غزل نے محض ایک موضوع یا واقعات کے کسی ایک سلسلہ تک خود کو محدود نہیں رکھا۔ ان کے ہاں بیک وقت سوچ کے کئی سلسلے کارفرما نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر سیاسی اور معاشرتی جبر کا موضوع لیجیے جو جدید اردو غزل کو شاعر کے ہاں مقبول ہوا ہے مگر عام طور پر اس نے یا تو نظریاتی سچ اختیار کر کے کسی ایک سیاسی، مذہبی یا معاشرتی نظریے کی ترویج و اشاعت کے لیے کام کیے یا پھر آمرانہ عصبیت کے خلاف آواز بلند کی ہے مگر مظفر حنفی کے ہاں معاشرتی اور سیاسی جبر دونوں کو اس کی عالم گیر اور بے پایاں صورت کے حوالے سے موضوع بنایا گیا ہے۔ اس باب میں بھی ان کے ہاں شاعرانہ بغاوت کی حیثیت ایک جادہ نوردی کی سی ہے۔ وہ مظفر علی خاں یا شوکت کاشمیری یا پھر بعض ترقی پسند شعراء کی طرح عصری واقعات سے براہِ راست اثرات قبول کرنے کی طرف مائل نہیں ہوئے۔ مظفر حنفی کے ہاں سیاسی گراوٹ، بے حسی، فرد پر معاشرے کا سیاسی دباؤ اور جبر کے شکنجہ ''روپ کا حقیقی کردار ان سب کو نمایاں کرنے کا رویہ ابھرا ہے۔ جسے انھوں نے اکثر کربلا کی علامتوں میں بڑی خوبی سے پیش کر دیا ہے۔ ان کے اس موضوع کے اشعار:

کچھ دیر تو نیزے پہ اچھالو نہ سروں کو
بستی میں ابھی رقص شرر ختم ہوا ہے
شہکار کی تکمیل پہ کاٹے گئے بازو
کیا مرے ہاتھوں پہ ہنر ختم ہوا ہے

یہ بات ہم پہ بند ہوا آب و دانہ کیوں

اُس کے کشکول میں سمندر سے ہونٹوں پہ ہر لب

میں پیاسا ہوں تو وہ بھی نہیں کم تشنہ

اُدھر بھی لاش تڑپتی ہے دفن ہونے کو

یہ سر بھی نیزۂ سفاک سے اُتارا جائے

قریب آؤ کہ مہندی رچی ہتھیلی پہ

ستارہ دیدۂ نمناک سے اُتارا جائے

کیا دیر ہے مجھ کو بھی اجازت ہو رجز کی

حرف آنے لگا نام و نسب تک مرے ہوا

سرخ آندھی نے بڑا شور مچایا کل رات

گھر جلائے ہیں پرندوں نے شجر میں کیسے

یہ اشعار دیکھ کر پہلے اس سیاسی یا معاشرتی جبر کو بے نقاب کرتے ہیں جو صرف بیسویں صدی کا وظیفہ حیات نہیں ہے بلکہ جب سے مظلومیت اور سفاکی ایک دوسرے کے مقابل آئے ہیں تو وہ ایک ہی شدت کے ساتھ کارفرما رہا ہے۔ مظفر حنفی کی غزل نے اس معرکہ حق و باطل کو غزل کے مخصوص علامتی اور استعاراتی انداز میں اس طور پر جزو بدن بنایا ہے کہ واقعہ اور تجربہ اپنی واقعیت اور تجربے کو ترک کیے بغیر غزل کی دھند میں شامل ہو گئے ہیں۔

آخر میں مظفر حنفی کے یہ غزلیہ اشعار دیکھئے جو مکاں کے افقی پھیلاؤ سے اوپر اٹھ کر زماں اور زمن سے اوپر اٹھ کر ایک کائناتی تناظر کو سامنے لا رہے ہیں۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں مکان اور زمن میں تنہا نہیں ہو گئے جیسا کہ کلاسیکی غزل میں عام طور سے ہوا ہے بلکہ اس لانچنگ پیڈ کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں جو تخلیقی جست کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ یہ وہ اشعار ہیں جو اپنی داخلی قوت کے باعث ہر زمانے کے لئے قابل قبول ہوتے ہیں:

نہ جانے کب سے زمیں گھومتی ہے محور پر

میں بن چکا ہوں مجھے چاک سے اتارا جائے

اور

بس کہہ دیا کہ ہم چلیں نہ کسی کے ساتھ

پیچھے پلٹ کے دیکھ رہا ہے زمانہ کیوں

مظفر حنفی کی غزل جدید اُردو غزل کی کشتی سے بچھڑا ہوا ایک منفرد تازہ پیچ و خم کھاتا دل سوز لئے ہوئے وہ دھارا ہے جس نے غزل کے "کل" سے لحظہ بھر کے لئے الگ ہو کر اپنے وجود کا اثبات کیا ہے مگر پھر لپک کر غزل کی کشتی میں دوبارہ شامل ہو گیا ہے۔ تجربے اور روایت کا بنتا بگڑتا تحرک مظفر حنفی کی غزل کا امتیازی وصف ہے۔

☆

بقیہ: ہمارا تمہارا خدا بادشاہ

☆

ہے۔ وہ جس کی معیت کا احساس ہر لحظہ سوہانِ روح بنا رہتا ہے۔

اب آخری بات جو عرض کرنا چاہتا تھا یہ ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارا رشتہ پورے آفاق کو ہمارا نگہبان رکھتا ہے، فاصلے اور زمانے سمٹ گئے ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان کی سرحدوں کا احترام برحق لیکن ایک امتی کے لیے کراچی، دہلی اور مدینہ (اور دوسرے اسلامی ممالک) تقریباً یکجا ہو جاتے ہیں۔

شاید کسی پاکستانی بلکہ کراچی کے کسی شاعر نے بھی کراچی کو اپنی غزل کی ردیف نہیں بنایا ہے اور یہ ردیف محض نامزدگی ہے۔ شہر آشوب بھی، حزنیہ غزل کی نوحہ گری بھی (آخر یہ سب کا آدمی ہوں، بنیادی طور سے میرا کام نہیں چلتا)۔ لیجیے اس غزل کے بھی کچھ شعر سن لیجیے:

کاٹے گی مہاجر کو تو قریے سے کراچی

ہے دور بہت دور مدینے سے کراچی

انچاس برس گزرے مگر سیر نہ ہو پائی

خون اپنی ہی اولاد کا پینے سے کراچی

تجھ پر ترس آتا ہے مہاجر ہو کہ انصار

خوش ہے نہ جینے سے نہ مرنے سے کراچی

ہاں دوست کے سینے پہ چلا دیتی ہے خنجر

دشمن کو لگا لیتی ہے سینے سے کراچی

ہماری اور آپ کی طرح کراچی بھی عجب ہے۔ نصف صدی سے ہمارے ساتھ کراچی کا یہی سلوک ہے مگر کراچی کے بغیر ہم بھی نہیں رہ سکتے۔ وطن عزیز کے سوا دنیا کی کون سی جگہ ایسی ہے جہاں کراچی بے طرح یاد نہ آتی ہو۔

میرا ارادہ تھا کہ مظفر صاحب کے منتخب اشعار آپ کو سنا کے بات ختم کی جائے مگر راستے ہی میں تھک گیا ہوں تو مضمون کو اس جگہ ختم کرتا ہوں جہاں سے ہماری داستانیں قصہ کا آغاز کرتی تھیں:

ہے ایک مظفر بادشاہ

ہمارا تمہارا خدا بادشاہ

☆

"ہول کیسا سرِ بازار ہے"

پروفیسر سید امین اشرف

(علی گڑھ، بھارت)

شاعر مظفر حنفی کا نام دنیائے ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آج تقریباً نصف صدی سے اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ مظفر نے تنقیدی مضامین لکھے ہیں جو مشاہیر سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ اُن کے کام تحقیقی نوعیت کے بھی ہیں۔ انھوں نے افسانے لکھے ہیں۔ کتابیں مرتب کی ہیں، تراجم کیے ہیں، سفرنامے لکھے ہیں اور بچوں کی دلچسپی کی چیزیں بھی پیش کی ہیں۔ مگر اس ہشت پہلو شخصیت کی نمایاں شناخت شاعری ہے اور بحیثیت شاعر ان کی شخصیت زیادہ معتبر اور مسلم ہے۔ جملہ نثری تصانیف مظفر حنفی کے علمی ذوق کی آئینہ دار ہیں مگر شاعری بیک وقت اُن کے علم، وسیع مطالعہ، وجدان، روحانی اضطراب، جذبہ و احساس اور بصیرت کا نچوڑ ہے۔ نثری تصانیف مظفر کے لئے آگہی کے پیمانے ہیں اور شاعری کربِ آگہی۔

زیرِ مطالعہ شعری مجموعے کا نام ہے "ہات اوپر کیے"۔ کتاب پر یہ نام دیکھتے ہی میرا ذہن انگریزی ادب کے مابعد الطبیعاتی شعراء میں سے سرِ فہرست شاعر جان ڈن کی طرف جاتا ہے۔ ان دونوں میں موضوع کی مماثلت نہیں ہے۔ پھر ان کا خیال کیوں آتا ہے؟ ڈن کا کلام جس طرح شروع ہوتا ہے وہ کم و بیش ہر نظم میں ایک طرح کے اچانک پن (Suddenness) سے واسطہ پڑتا ہے۔ آغاز نہایت abrupt ہوتا ہے۔ مصرعۂ اول آتا ہے ایک لخت حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ مظفر حنفی کی کتاب کا نام بھی ڈن کے مصرعۂ اول کی طرح قاری کو یک بیک چونکاتا ہے۔ یہ نام ایک استعجابی کیفیت کا غماز ہے۔ غزلوں سے قطع نظر اس نام سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ شعری مجموعہ ہے یا کسی کہانی کی سرخی یا ڈرامہ کا عنوان۔

کسی بھی شعری مجموعے کا نام بیشتر شاعر کے کلام کے رنگ و آہنگ کو متعین کرتا ہے۔ خوش گو شاعر فیض کے کلام کے مجموعوں کے نام ہیں، "نقشِ فریادی"، "دستِ صبا" وغیرہ۔ چنانچہ فیض کے ان مجموعوں میں نہایت نفیس و لطیف ترکیب سازی کا عمل ہے اور صناعی بھی۔ "ہات اوپر کیے" محض Statement نہیں بلکہ Dramatic کیفیت کا حامل ہے۔ یہ ایک استعاراتی اسٹرکچر ہے۔ اس ڈرامے میں تین کردار ہیں۔ ایک تو ہاتھ، یعنی دستِ دعا، دستِ حاجت۔ دوسرا ہات اوپر کرنے والا۔ تیسرا کردار جس کی طرف ہاتھ اٹھے ہیں مگر جو نگاہوں سے اوجھل ہے۔ یعنی تخلیقِ شعر کا سرچشمہ مسلسل تشنگی اور عالمِ امید و یاس ہے۔ فکر کی یہی ڈرامائی صورت، اظہار کا یہی انوکھا پن اور یہی استعجابی کیفیت اور استعاراتی نظام مظفر کی پوری شاعری میں جاری و ساری ہے۔

"ہات اوپر کیے" کے حوالے سے میرے ذہن میں دو باتیں اور آتی ہیں۔ یہ مظفر حنفی کا تازہ ترین گیارھواں شعری مجموعہ ہے۔ عمر میں بتدریج اضافہ کے ساتھ ساتھ ایک صورت تو یہ پیدا ہوتی ہے کہ کلام پختہ سے پختہ تر ہوتا رہے یا پھر شاعر اپنے آپ کو دہرانے لگے اور اعادہ و تکرار سے کام لے۔ میرا ذہن اول الذکر تاثر ہی قبول کرتا ہے۔ جوش و خروش میں کمی کی یا پیش کش میں کسی looseness کا احساس نہیں ہوتا۔ اس میں وہی آب و تاب، وہی آن بان اور وہی دم خم ہے جو پچھلے مجموعوں میں ہے۔ The poetic spirt is not flagging۔ دوسرے یہ کہ کسی بھی معتبر شاعر کے کلام کو پڑھ کر ناقد یہ فیصلہ بھی صادر کر دیتے ہیں کہ کلام پر کسی کلاسیکل شاعر کا رنگ نمایاں ہے یا پنہاں، مجھے مظفر کی شاعری پر کسی کا رنگ و آہنگ نظر نہیں آتا۔ مظفر کا اپنا لہجہ، اپنی آواز اور اپنا طرز ہے۔ وہ شاد عارفی کی تیغِ آبدار کے زخم خوردہ ضرور ہیں مگر پوری طرح اُن کی گرفت میں نہیں۔

زیرِ مطالعہ شعری مجموعے میں شامل غزلوں کی خصوصیت یہ ہے کہ مظفر کا رویہ مسائل و مضامین کی تفہیم کے سلسلے میں روایتی یا کتابی نہیں ہے۔ وہ روایت کو یکسر مسترد بھی نہیں کرتے۔ انھوں نے روایت کے تحت مندرجہ عناصر کو اپنی شاعری میں جذب کر کے اپنی طبیعت، اپنے نقطۂ نظر اور اپنے مخصوص طریقِ فکر سے اس رنگ کو چوکھا کر دیا ہے۔

غزل کا روایتی عاشق ہجر و وصال کی سرزمین کو طے کرتا ہے۔ خود رحمی اور آہِ نیم شبی اس کا مقدر ہے۔ محبوب کی یاد، اس کا انتظار، اس کی تمنا شیوۂ عاشقی ہے۔ وہ ہمیشہ رنجور و دل گیر رہتا ہے۔ اس کے برعکس مظفر حنفی کی غزلوں کا عاشق خود نگر و خوددار ہے۔ اس کی اپنی شخصیت ہے، وہ باوقار اور صاحبِ فہم و پندار ہے۔ وہ مصائب کے آگے سرِ تسلیم خم کرتا ہے نہ محبوب کی بے نیازی کا شکوہ کرتا ہے۔ مظفر کا عاشق زندگی اور زندگی کی سچائیوں سے عشق کرتا ہے۔ زندگی کی صالح اقدار پر اس کا ایمان ہے۔ وہ زندگی کے تلخ حقائق سے بہت مسرور ہوتا ہے نہ زندگی کی تلخیوں سے فرار اختیار کرتا ہے۔ وہ زندگی کی تلخیوں کو جھیلتا اور اسے بسر کرنا جانتا ہے۔ مظفر کے عاشق کو زندگی کی مثبت اقدار سے محبت ہے۔ وہ وضع داری اور ظاہری رکھ رکھاؤ کا ایک دلکش پیکر ہے۔ اپنی ہمہ گیر دلچسپیوں کی وجہ سے مظفر کا عاشق نیرنگ خیالی، شائستگی اور خودداری کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہے۔

اس کا عشق محض جسم یا لطیف تک محدود نہیں، اس کی جہتیں ذات سے کائنات تک پھیلی ہوئی ہیں۔

مظفر حنفی پر ترقی پسندی یا جدیدیت کا کوئی ایک لیبل چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی شاعری ایک بھرپور اکائی ہے۔ ان کی غزلوں میں فرد، زندگی اور ذات کا انتشار اور بکھراؤ ہے، اداسی، بے بسی، تشکیک اور تہ تشکیل وحشت کا عذاب اور تہی سامانی بھی۔ یہ شاعری خواب و حقیقت کا تصادم، ارمانوں اور آدرشوں کی شکست اور زندگی کی بے معنویت کا المیہ بھی ہے۔ اسی کے شانہ بشانہ ان کی غزلیں سیاست کے مدوجزر، حکومت کے جبر و استبداد، معاشرتی اقدار کی پامالی، معاشی بحران، نئے نوآبادیاتی نظام کی چیرہ دستیوں، زندگی کی توانا اقدار سے روگردانی، خانگی زندگی کے نشیب و فراز، مادیت کی آمریت، فطرت کی برکتوں سے بے نیازی، بڑے بڑے شہروں میں رہنے والے افراد کے تعلقات میں اخلاقی قدروں کے زوال کا مرثیہ بھی ہیں۔ میرے مذکورہ بالا خیال کی تائید مظفر حنفی کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ "کلاسیکی روایات، ترقی پسندانہ مقصدیت، صحت مند جدید رجحانات سبھی کے لئے میری شاعری کے دریچے کھلے ہیں۔ کسی نے مجھے ترقی پسند کہا تو کوئی مجھے جدید شاعروں میں شمار کرتا رہا لیکن میں نے کسی بھی مکتب فکر سے وابستگی کا اعلان نہیں کیا۔" ---("بات اوپر کی" پیرا ۱، صفحہ ۹)

انسانی شخصیت کے نہاں خانوں کی تلاش، انسانی نفسیات کے پیچ و خم کا ادراک اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کی بازیافت کا عمل مظفر حنفی کی شاعری کے اہم نکات ہیں۔ شاعر کوئی Moral preacher نہیں ہوتا۔ وہ براہ راست اخلاقی تعلیم نہیں دیتا۔ وہ تو خوبصورت اور دلنشیں اشیا اور اعمال کی طرف مبہم اشارے کر دیتا ہے۔ وہ جذبات اور نصائح کا پلندہ فراہم نہیں کرتا کیونکہ اس سے قاری اشعار سے حظ نہیں اٹھا سکتا۔ اپنی علامتی اور استعاراتی اسلوب کے وسیلے سے مظفر نے انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ جسے ہم انسانی بیماریاں سمجھتے ہیں وہ ہمارے اندر چھپے آزار کیوں رہتا ہے۔ جب دنیا میں اظہار کے خلوص کا فقدان کیوں ہوتا ہے۔ ہماری بد دیانتی کے پیچھے فریب و دستار و زر کیوں ہیں؟ شرافت، نیک نفسی اور پاکیزگی کیوں نہیں؟ انسان کی فطرت میں خیر و شر کی کشمکش اور حق و باطل کی رزم آرائی کیوں رہتی ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کی طرف مظفر کی شاعری میں علامتی اسلوب میں اشارے ملتے ہیں۔ اصل شے انسان کا باطن یا قلب انسانی ہے۔ یہ صاف اور نکھرا ہو تو رفاقت اور ہم آہنگی کی بنیادیں استوار ہو سکتی ہیں۔ ہماری کلاسیکل شاعری میں ایسے اشعار کی کثرت ہے جو اخلاقیات پر مبنی ہیں۔ مظفر حنفی اس لحاظ سے فقید المثال ہیں کہ ترقی پسند یا جدید شعراء کے کلام میں اس فراوانی سے ایسے خوبصورت اشعار نہیں ملتے جن کی بنیاد Ethical values پر ہے۔ مظفر نے نام نہاد جمہوری نظام، عدل و انصاف کے کھوکھلے پیمانے، شرافت کے بے روح معیار، تصنع آمیز وضع داری اور ظاہری و رسمی تعلقات پر طنز کیا ہے۔ انھوں نے امتیاز رنگ و نسل کی بے معنویت، انا و تفاخر میں بے نفسی کی ضرورت اور ابن آدم کے باہمی رشتوں میں محبت و اخلاص پر زور دیا ہے۔ امن و آشتی کے نام پر خون ریزی حیوانی فعل ہے۔ زندگی محبت سے عبارت ہے۔ زندگی کی صداقتوں پر ایسا حکیمانہ ردعمل اور ایسا بصیرت آمیز شعری رویہ مظفر کے ہم عصروں میں کہیں اور نظر نہیں آتا۔

مظفر حنفی کی شاعری مشاہدات و تجربات کی شاعری ہے۔ انھوں نے زندگی کو قریب سے دیکھا اور برتا ہے۔ زندگی، فرد، کائنات، معاشرت، سماج، انسانی تعلقات، موجودہ سیاسی نظام کی طرف ان کا فکری رویہ کسی بھی کمپلکس اور تعصب کی آلودگی سے پاک ہے۔ یہ ایک سچے اور کھرے شاعر کا آزادانہ رویہ ہے تو پھر کیا مظفر حنفی کی شاعری کا طرۂ امتیاز صرف یہی ہے؟

مظفر کے کلام کا پورا شعری نظام علامتی اور استعاراتی ہے۔ اسلوب کی فرسودگی، ترکیب سازی اور شعوری صناعی سے دور کا بھی علاقہ نہیں۔ ان کو لفظوں کے استعمال پر خلاقانہ دسترس حاصل ہے۔ انھوں نے گھسی پٹی (Out-moded) تشبیہات کے استعمال سے گریز کیا ہے۔ سامنے کے سیدھے سادے، سادہ اور سلیس شعر مظفر کے وجدان و شعور کی طرفگی سے تہہ دار نظر آتے ہیں۔ موجودہ زندگی میں شکست و ریخت کی طرح مظفر کی شعری لفظیات میں بھی توڑ پھوڑ کا عمل دخل ہے۔ زبان پر حاکمانہ قدرت اور خیال کی ندرت نے اس شاعری کو صحت مند، توانا اور جاندار بنا دیا ہے۔ لفظوں کا الٹ پھیر اور تضاد بھی مظفر کی شاعری میں ایک فنی حربہ (Artistic device) ہے۔ ان کا لہجہ کہیں طنزیہ ہو جاتا ہے اور کہیں ہمدردانہ۔ بادشاہ، میاں جی، شیخ جی، بابا جی جیسے الفاظ یا کردار سے ہم سرسری طور سے گزر جاتے ہیں مگر ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کے بعد ان میں خیالات و افکار کی کئی جہتیں نظر آتی ہیں۔ نہایت سادہ اور سامنے کے لفظوں کا وار نہایت بھرپور ہوتا ہے اور ان کی کاٹ میں ایک لطیف ذائقہ۔ بحیثیت مجموعی یہ فکر انگیز شاعری ہے اور اپنی ماہیت میں Anti romantic۔ "بات اوپر کی" سے مختلف موضوعات سے متعلق اشعار پیش کیے جا رہے ہیں جن سے شاعر کے فکر کی گہرائی کے ساتھ ساتھ اسلوب کی تازہ کاری، لہجے کے تیکھے پن، آواز کی ندرت اور طرز ادا کے بانکپن کا اندازہ ہوتا ہے۔

دل دہلا ہے مکانوں سے نکلتے ہوئے کیوں
بول کیا ہے سر بازار ہے، پوچھو ان سے

ہمسائے کا حجرہ اب چھڑکا میرے لہو
حاکم کو بری تیغ سنائی نہیں دیتی

بجا رہے ہیں جہاں تالیاں اصول پسند

پڑا ہے ایک پرندہ وہاں سسکتا ہوا

زمانے میں شرافت کا یہی معیار ٹھہرا ہے
تو میں بھی آج ہی بازار سے دستار لاتا ہوں

جس نے کھینچ ڈال دی آدمی آدمی کے بیچ
علم نہیں وہ جہل ہے، فہم نہیں فتور ہے

مجھے دیکھ کر اپنا مہرباں تم کو سمجھتا ہوں
مرے پہلو میں نیزہ کس نے مارا، تم سمجھتے ہو

وضعداری کی بہت قدر کرو، ایسے لوگ
آج کل صرف کہانی میں نظر آتے ہیں

ہزار دعویٰ کریں تقسیم مطمئن کا
دل و دماغ میں چپقلش تو رہتی ہے

ہمیں بھی پیاس لگتی ہے ہمیں بھی سانس لینی ہے
سمندر پر تمہیں قابو، ہوا پر حکمراں تم ہو

دلوں میں فرق آ جائے تو اس کو فاصلہ کہیے
کسی کے جسم کی دوری کو میں دوری نہیں کہتا

ہماری جان حاضر ہے وہ جب چاہے طلب کر لے
اُسے سجدے کی خواہش ہے وہی ہم سے نہیں ہوگا

تعصب تخت جاں لیا کر صدیوں تک نہیں مرتا
بھروسے کی عمارت لمحہ بھر میں بیٹھ جاتی ہے

مجھے اچھی طرح معلوم ہے انجام خود بینی
نہ اِس دنیا میں روشن ہے نہ اُس دنیا میں روشن ہے

کثرت پہ نہ جاؤ کس طرف ہے؟
انصاف بتاؤ کس طرف ہے؟

جذبات کا احترام کرتا
کاشی میں مجھے سلام کرتا

بڑی بحر میں غزل ندی کے پانی کے بہاؤ کی طرح ہے۔ یہ شاعری کی طبع رواں پر دال ہے۔ بڑی بحر میں شاعر کو سنبھل کر چلنا پڑتا ہے کیوں کہ لفظوں کی بھرمار میں بنیادی فکر کے مجروح ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ بڑی بحر میں شعر کہنا ایک قسم کی آزمائش ہے۔ چھوٹی بحر میں شعر کہنا اس سے زیادہ محنت طلب ہے کیوں کہ یہاں کوزے میں سمندر کو بند کرنا ہے۔ چھوٹی بحر میں میر، غالب اور مومن کی غزلیں میرے دعوے کی تصدیق کرتی ہیں۔ مظفر حنفی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے شعروں میں گھل بول نہیں لاتے، خوش نما الفاظ سے انہیں نہیں سجاتے، ان میں ظاہری چمک دمک پیدا کرنے کی کوئی شعوری کوشش نہیں کرتے تاہم ان کی غزلیں یا انھوں نے چھوٹی بحر کی غزلوں میں زندگی کا رس، تہ داری کی پرت اور کائناتی تخیل اور تجربات سے ایک تاثر پیدا کر دی ہے جو قاری کو ذرا سے غور و تامل کے بعد مسحور کرتی اور دل و دماغ کو اپنی بھرپور گرفت میں لے لیتی ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

سیدھی راہوں پہ چلتا ہوں
کیا کون قیادت میری؟

یہ بات خبر میں آ گئی ہے
قوت مرے پر میں آ گئی ہے

گرچہ طاؤس پہ آ بیٹھا میں
سرمۂ سفت نظر جیسا میں

سرا سر بہہ گئیں آنکھیں ہماری
کہانی کہہ گئیں آنکھیں ہماری

تیر سب دل پہ ہیں، جینے پہ نہیں
ہم بھی اب آمادہ جینے پہ نہیں

سر بلندی پہ ناز بھی نہ کرو
قد سے بڑھ کر نیاز بھی نہ کرو

مظفر حنفی غزل کہتے ہیں قافیہ پیمائی نہیں کرتے۔ وہ خود کہتے ہیں:
''مظفر نے لہجے سے ثابت کیا۔ غزل قافیہ پیمائی کا پلندہ نہیں۔''
دل تو یہ کہ شعر کے دونوں مصرعوں میں ایک فطری تسلسل ہو۔ یہ آپس میں مضبوطی سے جڑے ہوئے ہوں۔ دوسرے قافیہ و ردیف میں ایک محکم ربط ہو۔ تیسرے خیال کی ترسیل کے لئے مصرعوں میں موزوں اور مناسب لفظوں کا استعمال۔ مظفر ان تینوں منازل سے نہایت خوبصورتی سے گزر جاتے ہیں۔ کثرت استعمال سے مسخ شدہ قوافی کے استعمال سے گریز کرتے ہیں۔ مظفر چوں کہ طبعاً جدت پسند ہیں اس لئے اُن کی ردیفوں میں بھی ایک نوع کی Originality ہے جس سے کام لینا ہر جسے گوارا کرنا سب کے بس کی بات

نہیں۔ مثلاً ان کی ردیفیں ---- رنج، کراچی، نیچے، چادر، دریسی، بچھڑ گئی، پیچھے، سلیقہ، چلی بھی گئی، چاند، زخم، آسمان، ہاتھ، پانی وغیرہ۔

نوک پلک سے درست، سادگی میں پرکار زبان، عصری حسیت اور جدید غزل کا خوبصورت نمونہ ص ۱۹ پر مظفر کی غزل پڑھیے۔ میرے خیال میں ان کی نمائندہ ترین غزل ہے۔

زمین و آسماں کا بھید سارا تم سمجھتے ہو
مگر شیشے کے ٹکڑے کو ستارا تم سمجھتے ہو

میں نے مظفر حنفی کو Anti romantic کہا ہے وہ ان معنوں میں رومانیت کی نفی نہیں ہیں کہ ان کا تخیل کسی سے جہانِ معنی کی سیر نہیں کرتا یا وہ خواب نہیں دیکھتا یا خیال کی ترسیل کے لئے لفظوں کے انتخاب میں کلاسیکل شائستگی اور سلیقہ مندی سے کام نہیں لیتا یہ کہ نظریاتی اعتبار سے وہ رومانیت کے خلاف ہیں۔ میرا موقف یہ ہے کہ ان کی غزلوں میں عشقیہ مضامین کی کمی ہے۔ یعنی یہ کہ یہ جذبہ مظفر کی شاعری میں Dominating passion نہیں ہے۔ بات اوپر کہے گئے میں جو بھی عشقیہ اشعار ہیں ان میں کوئی بھی کج رنگ یا مصنوعی خیال آرائی نہیں ہے۔ مظفر حنفی گھسے پٹے Beaten اور چبائے ہوئے نوالوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان اشعار میں خود ان کا خون دوڑتا ہے۔ ان میں مظفر کی اپنی جگر کاوی اور اپنا لہو ہے۔ لہجے کا بانکپن مظفر کا اپنا ہے۔ ان اشعار میں باد صبا کی شوخی، شبنم کی نرمی اور اپنے دیس کی مٹی کی سوندھی خوشبو ہے۔ جب مظفر عشقیہ اشعار کہتے ہیں تو اپنے پسندیدہ اسالیب کی حد کو Transcend کر جاتے ہیں اور اس طرح فراق، ناصر کاظمی اور احمد مشتاق کے قریب نظر آتے ہیں۔

پھر عشقیہ شاعری کرنے کی وجہ کیا ہے۔ اول تو یہ کہ مظفر کی شاعری مختلف رنگوں کا آمیزہ ہے۔ اس میں عشق بھی ایک عنصر ہے۔ دوسرے یہ کہ حسن پرستی انسان کی بنیادی جبلت ہے۔ یہ اس کے خمیر، اس کی سرشت میں ہے۔ ایک صحت مند نارمل انسان مادی عشق کے رنج و غم سے اپنے آپ کو الگ نہیں رکھ سکتا۔ عام طور پر مظفر کی زبان کھری کھردری اور نوکیلی ہوتی ہے مگر جب جب بیزار شدہ غزل سے واسطہ پڑتا ہے یا عشقیہ مضمون سے تو غزل کے امیجز کی پوری فضا ہی بدل جاتی ہے۔ لہجے کا بانکپن، آواز کا لوچ اور سادہ اسلوب کی جادوکاری ان اشعار میں دیکھیے۔

مر جائے رنگ نے، خوشبو نے، ہوا نے پائے
خار تھے، ہم ترے نزدیک نہ آنے پائے

اتنی بڑی دنیا بے تصویر پڑی ہے
یاں پاؤں میں احساس کی زنجیر پڑی ہے

بھاری تھا دو جہاں سے مگر جھومتے ہوئے
نوک پلک پہ میں نے ترا غم اٹھا لیا

ہر پھول کی جھولی تری خوشبو سے بھری ہے
غنچے کی کٹوری سے چھلکتا ہے ترا رنگ

سنا تم نے کہ دنیا کے بجھانے سے نہیں بجھتی
لگی ہے آگ ایسی خرمنِ یک دانہ دل میں

غبار اٹھتا تھا پہلے بھی، گھٹا پہلے بھی اٹھتی تھی
مگر اب کے عجب عالم ترے شوریدہ سر کا ہے

نیند آتی نہیں مدت سے کہ کس نے رکھا ہے
ہاتھ وہ دیدۂ بیدار پہ رکھ دیتے ہیں

یونہی ترے خیال سے بہلا رہا ہوں جی
اتنا کہاں دماغ کہ وحشت کرے کوئی

سوچا تھا مگر پھر بھی اُسے دیکھ نہ پایا
میلا ہے کہ سب لوگ اُدھر دیکھ رہے تھے

چھت نے آئینہ چمکانا چھوڑ دیا ہے
کھڑکی نے بھی ہاتھ ہلانا چھوڑ دیا ہے

ان اشعار میں سنگین حقائق کی انتہا کی نہیں بلکہ نسیم صبح کی انگڑائی، سنگلاخ پہاڑی دامن سے پھوٹتے ہوئے چشمے کی روانی اور نوک دار کانٹوں کے بیچ میں مہکتے ہوئے پھولوں کی عطر بیزی ہے۔

غزل میں مظفر حنفی کا کارنامہ ان کے اشعار کی لسانی تشکیل اور لفظیات کا دروبست ہے۔ وہ گھسے پٹے، پامال اور فرسودہ الفاظ کو بھی نئے نئے معانی سے روشناس اور روشن کر دیتے ہیں۔ وہ لفظوں کو برتنا اور ان سے کام لینا جانتے ہیں۔ مظفر حنفی کے کسی بھی ہم عصر شاعر کو ان کے اسلوب کی ہوا تک نہیں لگی ہے۔ یہ اسلوب Inimatble ہے۔ وہ پیش پا افتادہ مضامین کے Treatment سے گریز کرتے ہیں۔ ان کی غزلیں جدید حسیت سے لبریز اور جدید موضوعات کی پیش کش سے شاعری اور دانشوری کے امتزاج کا نمونہ ہیں۔ مظفر حنفی کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کو انتہا پسند جدید شعراء کی مہمل گوئی سے بچایا ہے اور ترقی پسند شعراء کے مصنوعی شور و غوغا سے بھی۔ یہ زندہ رہنے والی شاعری ہے۔ مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ جس اسلوب یا جس لہجے کو مظفر نے اختیار کیا ہے وہ اس کے موجد ہیں اور خاتم بھی۔

"ہمارا تمہارا خدا بادشاہ"

سید محمد ابوالخیر کشفی (●)

یہ بات ساٹھ برسوں میں مظفر حنفی کی سمجھ میں نہیں آسکی کہ:

کون ہے کیا ہے مظفر حنفی

تو پھر ہم کون ہیں کہ مظفر شناسی کا دعویٰ کریں۔ اور ویسے بھی یہ سوال انسان کی پیدائش کے ساتھ وجود میں آ گیا تھا کہ:

من کیستم؟

مظفر حنفی کی غزل اس بات کا ادھورا جواب ہے کہ "کون ہے کیا ہے مظفر حنفی۔"

اپنی تلاش اور اپنے آپ کو پانے کی جستجو ہر مہذب سوچنے والے انسان کا مقدر ہے اور اپنے آپ کو پانے کی یہ کوشش کبھی شاعری بن جاتی ہے کبھی مصوری، کبھی خلوت نشینی کی عبادت اور کبھی محفل میں خاموشی۔

شاعری مظفر حنفی کا مسئلہ ہے۔ شاعری ان کے لیے جواز زندگی بھی ہے ان کی تنہائی بھی اور جلوت میں زودِ آرائی بھی۔ کبھی جاننے والوں کے مقابل ان کا غصہ اور قہقہہ کا سامان حرب ہے اور کبھی انبساطِ تصور و گریز بھی۔

مظفر حنفی ایک بڑے شاعر ہیں۔ یہ ایک معلوم اور ظاہری حقیقت ہے اور بس۔ لیکن یار لوگوں نے اسے بھی مسئلہ بنا لیا ہے اور اس بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ جو آدمی اپنی شاعری کو اپنی زندگی بنا لے اس کے ہاں بڑائی خود بخود ظہور پذیر ہو جائے گی۔ میر صاحب کے ضخیم کلیات اسی حقیقت کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے لیے شاعری زندگی کی پیش کش نہیں بلکہ زندگی ہے اور اپنی بلند ترین سطح پر یہ شاعری زندگی کی ترتیب نو بن جاتی ہے۔ میر صاحب کے لیے "بلندش بسیار بلند و پستش بسیار پست کہا گیا ہے" یا لوگوں کا تبصرہ ہے۔ میر صاحب نے اپنی پوری زندگی شاعری میں پیش کر دی اور زندگی میں فراز بھی آتے ہیں اور نشیب بھی، بلندی بھی اور پستی بھی۔ زندگی کو پوری طرح دیکھنے سمجھنے اور پیش کرنے کو لوگوں نے پست و بلند کے پیمانوں سے ناپا۔ بے چارے اور کر بھی کیا سکتے تھے اور ان بے چاروں کی نسل بھی یہی کر سکتی ہے۔ ہاں یہ کیا ہے کہ ہم ایسے شاعروں کی بلندی ہی سے ملنا چاہتے ہیں اور یہ تمنا پیدا ہوتی ہے کہ یہ اپنے کم نظر نقادوں کا ذکر نہ کرتے تو خوب کرتے۔ مگر ہم ان سے ولی ہونے کے تقاضوں کو چھیننے والے کون ہیں؟ مظفر حنفی کے ہاں بھی کم نظروں کا ذکر ہے اور خوب خوب ہے مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ ان سے الجھ کر اپنی رسوائی کروں۔

اس وقت میرے پاس مظفر حنفی کا گیارھواں شعری مجموعہ "ہاتھ اوپر کیے" ہے۔ نقل مکانی کی وجہ سے "پریشاں گردیدہ" ادھر ادھر ہو گیا ورنہ اس کی روشنی میں حنفی صاحب غزل گوئی کے رجحانات پر گفتگو ہو سکتی تھی۔ مگر یہ بھی اچھا ہوا۔ "ہاتھ اوپر کیے" اکیسویں صدی کے آغاز میں مظفر کی زندگی کی شعری روداد ہے۔ حقیقت جب شعر کے قالب میں ڈھلتی ہے تو اور بھی قابل اعتماد ہو جاتی ہے بالخصوص غزل کے اشعار میں ڈھل کر کیوں کہ غزل کا شاعر کسی نظریہ کو صحیح یا غلط ثابت کرنے کے چکر میں نہیں پڑتا۔ اسے تو قوالی کہلانے کا شوق ہوتا ہے اور نہ وہ رجائیت کا پرچم بلند کرتا ہے۔ اس کا کام تو یہ ہے کہ:

گھڑی کو طول دے کے ابد ہم نے کر دیا

لمحوں کو گرفت میں لینے والا ہی وقت کے بطون کی خبر لا سکتا ہے۔ وقت کی چھوٹی سے چھوٹی اکائی کا شناسا وہی ہو سکتا ہے جو عہد در عہد تہذیب یافتہ شخصیت کا مالک ہو۔ مگر یہ بات نیم وحشی ذہن اور بجھے ہوئے علم و دانش رکھنے والے نہیں سمجھ سکتے۔

سب سے پہلے تو میں مجموعے کے نام سے الجھتا رہا۔ یا ہاتھ کچھ کچھ مظفر حنفی کے اس شعر سے سمجھ میں آیا:

پھول برسائیں مرے دوست کہ پتھر برسائیں
میں نے ہاتھ اپنے اٹھا رکھے ہیں اوپر کی طرف

ہاتھ کو اوپر اٹھا رکھنا غزل گوئی کے ایک رویہ کا اظہار اور اعلان ہے۔ یہ ہاتھ غزل کو کاغذ کے سینے میں اتار کر اب فارغ ہو گئے ہیں اور یہ قول غالب کس بلند سطح سے ہماری تفہیم کی طرف آ رہا ہے کہ:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

اور اوپر اٹھنے والے غزل گو کے ہاتھ، اوپر اٹھنے سے پہلے زندگی کے تصور کو سوچ ہموار بنا دیتے ہیں۔ زندگی کے ساتھ ایسا سلوک کون کر سکتا ہے:

اس طرف بھی تو دیکھیے صاحب
دیکھیے پھر بھنور سے نکلے ہاتھ

انسانی ہاتھ بھی کمال کی چیز ہے۔ یہ پڑوسی کے ہاتھ میں خنجر بھی گھونپ سکتا ہے سینے کی پسلی تا ہنچ کو غریب کلرک کی جیب بھی کاٹ سکتا ہے مگر یہ ہاتھ موضوع غزل نہیں بن سکتا (ہاں، ایک مکتبۂ فکر کے سخن وروں کا موضوع سخن بن سکتا ہے) ہمارے غزل گو کا دست ہنر زندگی میں دوسروں، بالخصوص کسی دوسرے کے لیے دست رفاقت کی کہانی رقم کر سکتا ہے یا بازار سے لوٹنے والے کسی مرد حُر کے ہاتھ کے کھو جانے کا نوحہ لکھ سکتا ہے:

دل ہی نہیں روشن تو تجھے کیا نظر آئے
یہ وادیٔ ظلمت ہے مرے ہاتھ میں دے ہاتھ

سنتے ہیں کہ نیکی ہی کمانا تھا ہمیشہ
اک روز وہ بازار سے لایا تو نہ تھے ہاتھ

اس جہاں دیدہ مردم گزیدہ مایوس اور پر امید، تقی اور بے نیاز

ہاتھوں والے کے ہاتھوں کا تجربہ منسوب میر تقی میر کے ہاتھوں سے جاملتا ہے:

آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز
یہ ہاتھ سوگیا ہے سرہانے دھرے دھرے

صاحبو! میں مظفر حنفی کے مجموعۂ غزل کے نام ہی میں الجھ کر رہ گیا۔ اس مجموعے کے بارے میں ایک دو باتیں اور عرض کرتی ہیں۔

مظفر حنفی نے اپنے مجموعے کے حرفِ آغاز (مجھے کہنا ہے کچھ ———) میں لکھا ہے کہ "میں نئی زمین کی تلاش میں بہت کاوش کرتا ہوں جو عموماً مشکل ہوتی ہیں۔ کہیں قافیے سخت ہوتے ہیں تو کسی میں ردیف آڑی ترچھی۔ پھر بھی قافیے کو شگفتہ بنانے اور ردیف کو ان سے جسم و جاں کی طرح چسپاں کرنے میں خون پسینہ ایک ہوجاتا ہے"

غزل کو حقارت سے 'قافیہ پیمائی' کہنے والے خال خال اب بھی پائے جاتے ہیں۔ پہلے مان لیا:

کہتے ہیں غزل قافیہ پیمائی ہے ناصر
یہ قافیہ پیمائی ذرا کرکے تو دیکھو

اور ناصر کاظمی کے مشورے پر عمل کون کرے؟ آزاد غزل تو موجود ہی ہے۔ ہمارا یہ عہد میدانِ طلب ہی میں عجب دوڑیں، معنوی اعضائے انسان کی زندگی کی سل بنائی جاتی ہے اور آزاد غزل کے نام پر اردو ادب کی حرمت کو بٹا لگایا جارہا ہے۔ بہر حال ہمارے دور میں بھی ایسے غزل گو زندہ ہیں جو قافیے کی پابندی کے باوجود یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں:

مظفر کے لہجے نے ثابت کیا
غزل قافیوں کا پلندا نہیں

میں بات کرنا چاہتا تھا ردیف کی، مگر قافیے سے بچ کر کیسے گزر جا سکتا ہے کیوں کہ غیر مردّف غزل تو ہو سکتی ہے مگر قافیے سے ذوقِ شعر رکھنے والا کوئی شخص کیسے گزر سکتا ہے۔

عہدِ حاضر کی غزل کو ردیف نے نیا رنگ و آہنگ عطا کیا ہے۔ طویل ردیفوں کے اس عہد میں غزل کی موج سا مانی غزل کا روپ بن گئی ہے۔ بعض یک لفظی ردیفوں میں بھی غزل گو شعرا نے جہانِ معانی آباد کر دیے ہیں۔ "میاں" کی ردیف میں جو غزلیں لکھی گئی ہیں ان کو میر صاحب کے عہد سے دما چھتائی اور نعت اقدس کی تک لے آئیے۔ اس لفظ کی تہیں کھلتی جائیں گی اور اپنی زبان پر آپ کا ماں بڑھتا چلا جائے گا۔ "میاں" کو اپنی غزل کے مطالعے کا قافیہ ولیتا تے ہوئے مظفر میاں نے نیا بادشاہ کی ردیف میں شعر کا جادو جگایا ہے۔ میں نے ایک طویل مضمون میں غزل میں نعت کی جلوہ گری دیکھی اور دکھلائی تھی۔ وہ مطالعہ میرے تنقیدی مجموعے "نعت اور تنقیدِ نعت" میں موجود ہے۔ میری دانست میں مظفر حنفی کی یہ غزل نعت کی دنیا میں ایک نئے لہجے کا وجود رکھتی ہے۔ کسی غزل گو اور کسی شاعر کے بارے میں ایسا دعویٰ اس کے کلام کی مضمون فضا میں نبیٔ عربی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی یاد کے کنایوں اور اشاروں کی موجودگی کی بنا پر لگایا جا سکتا ہے۔ میں آپ کو مظفر حنفی کا ایک شعر سناتا ہوں جس میں اس طرف

زیست کو حسرت سے یاد کیا گیا جس سے ہم محروم ہوگئے ہیں:

کیا ہوئے طور طریقے وہ مدینے والے
وہ بہاؤ جس وہ فضا جسے پوچھوں سے

محبت کا ایک حوالہ بہت ہے تو اب نعتیہ غزل سنیے۔ یہ نعت کا اعزاز ہے کہ مظفر حنفی نے اس تلک رحیۂ ذات کی محبت میں لفظ "یار" کو آسمانِ نصیب بنا دیا۔ مگر نعت سے پہلے حنفی کا ایک اور نعتیہ شعر سن لیجیے۔ یہ شعر اسی مجموعے کی ایک غزل کا ہے۔ غزل میں نعتیہ شعر اچانک سامنے آتا ہے تو قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اچانک کسی گلستان میں پہنچ گیا۔ وہ ورن کا ذکر ہمارے لیے آبِ حیات ہے جو ہمارے وجود میں خونِ رواں کی طرح بہتا رہتا ہے اور ہمیں شاداب کرتا رہتا ہے۔ اس شعر میں معراج کے عظیم معجزے کو غزل کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے:

قوسین بس اک ذرا تھم کے نعت و سماں اک اڑان کے ہیں اب

غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں

تھوڑا سا التفات، میاں یار بادشاہ
دینے لگے ہیں زخم دھوں یار بادشاہ
ہے کون دست گیر میرا آپؐ کے سوا
سیلاب میں ہے قریۂ جاں یار بادشاہ
معلوم یہ ہوا کہ وہاں آپؐ ہیں مقیم
ہم نے کیا جہاں قیام یار بادشاہ
ایسی کوئی نگاہ کہ سر میں نہیں رہیں
لاریب ہائے سوہنیاں یار بادشاہ

یہ شعر مقامِ رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے باخبری کی شہادت بھی ہیں اور یہ ایک امتی سے اس کے رسول کے تعلق کی دستاویز بھی ہیں۔ رسولِ عالی مرتبت سے یہ قربت، اور اس کا یہ احترام کہ نام لیتے ہوئے سینے میں سانس رکنے لگے تو شاعر یا بادشاہ کہہ کر چپ ہوجائے۔ ایسے دو لفظوں سے یہ خطاب وجود میں آیا ہے کہ رسول اور اس کے امتی کے بیچ کوئی حجاب نہ ہے اور ایسا احترام کہ بادشاہ کے سوا کسی لفظ میں سمٹ نہ سکے اور جب زخمِ حیات دھوں دینے لگیں تو ان کے تھوڑے سے التفات کے علاوہ جینے کی اور کون سی شکل ہے۔ اس دعوئی میں اپنی ذات سے آگے بڑھ کر پورے ماحول کی تصویر کشی ہے۔ وہ ماحول جس میں دھوں بھی ہے اور قریۂ جاں کو بہا لے جانے والا سیلاب بھی، مگر ہماری سلامتی کے لیے یہ کافی ہے کہ ہم نے جہاں بھی پناہ لی، وہاں ہمارا دست گیر موجود

باقی صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ فرمایئے

"حصارِ جسم سے خواہش کے زلزلے"

ڈاکٹر حنیف فوق (●)

مظفر حنفی کی کتاب "پرچم گرد باد" سے غزل گوئی کی ایک نئی جہت سامنے آتی ہے۔ ہر چند کہ ان کی غزل کا منفرد لہجہ اپنی پہچان آپ بن چکا ہے۔ شاد عارفی کے اثر سے انھوں نے طنزیہ اسلوب اور لہجے کی انفرادیت سیکھی۔ حقیقت یہ ہے کہ شاد عارفی کے اثرات ان کی شاعری میں جگہ جگہ اپنا پرتو ڈالتے رہے ہیں اور کئی مقامات پر مظفر حنفی نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ اگرچہ ان کے استفادے کی مدت کم ہے لیکن مزاجی مناسبت سے شاد عارفی کو ان کے لیے ایک روشن ستون بنا دیا ہے۔

"پرچم گرد باد" میں "پانی کی زبان"، "کھل جا سم سم" اور "پردہ سخن کا" کی غزلیں شامل ہیں اور اس طرح اردو شاعری کے قاری کو ان کی شاعری کی نئی جہت اور سوچ کے نئے زاویوں کے مطالعے کا موقع ملتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ان غزلوں سے ان کے رنگ شاعری کا تعین ہوتا ہے۔

ان کا ایک شعر انتساب قابل توجہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

پردیس نہ جانا کبھی بنگال کو ہم نے
کلکتے میں دلّی کبھی بھوپال بچھایا

اس شعر سے واضح ہوتا ہے کہ مظفر حنفی نے متنوع تہذیبی روایات سے بہت کچھ اخذ کیا ہے لیکن اپنا لہجہ الگ رکھا ہے۔ مظفر حنفی نے متعدد مجموعات شائع کیے ہیں۔ کچھ کا ذکر "پرچم گرد باد" میں موجود ہے اور کچھ کا نہیں۔ اپنے الگ لہجے کے باوجود ایسا نہیں کہ روایات غزل کی جمالیات و آن بان مظفر حنفی کی شاعری میں نہیں پائی جاتی۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

اس جھونپڑی کی یاد آئی نہ محل ملے
خود بخود سیلاب سا کیوں چشم تر میں آ گیا

یوں ہی شعلے کو ہوا دیتا رہا
اپنے ہونے کا پتہ دیتا رہا

اس انجمن میں بات نہیں بن سکی لیکن
اللہ کو سنا ہے بڑا کارساز ہے

اس کی زلفوں میں بس رہی ہے گھٹا
میرے دل پر برس رہی ہے گھٹا

ہاں اپنے بہکنے پہ ہمیں ناز بہت ہے
اس باب میں ہم بادہ گساروں کی طرح ہیں

نہ جانے کون سی منزل پہ آ گئی ہے
کہ میرے سر سے اترتا نہیں خمار مرا

سمندروں پہ برستا بھی کیا برستا ہے
برس ہماری طرف ریگ زار ہم بھی ہیں

آئینہ بن کے نہ بستی میں نکلیے صاحب
ورنہ ہر شخص تماشائی نظر آئے گا

طویل رات زمیں تخت آسماں چپ چاپ
گزر رہا ہے قافلۂ زندگی رواں چپ چاپ

ویرانیوں سے اس نے مرا حال کہہ دیا
تنہائیوں سے اس کا پتہ مل گیا مجھے

تری محفل سے اچھا ہے مرا وحشت کدہ جس میں
جدھر آواز دیتا ہوں وہیں سے تو نکلتا ہے

جن کو دنیا سے ہے امید وفا
ریت پر تعمیر کرتے ہیں محل

جستجو کا شعور ہے کہ بڑھتے جائیے
راہ میں آرام کرنے کے لیے سائے بہت

کہاں چلے مجھے دامن تھما کے حیرت کا
ادھر تو آؤ ذرا آئینہ دکھاؤں تمھیں

مندرجہ بالا اشعار میں اردو کے مشاہیر شعرا کی جو بازگشت ملتی ہے اس سے خود اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ مظفر حنفی کا اردو شاعری کے سرمائے سے کتنا گہرا ربط رہا ہے۔ ان کے کلاسیکی شاعری کے مطالعے ہی سے وہ روشنی آ رہی ہے کہ مظفر حنفی کے انداز غزل میں نئی جہت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی فنکاری کی بنیاد اردو شاعری کا کلاسیکی سرمایہ ہے۔ مظفر حنفی نے ردیفوں اور قافیوں سے بھی کام لے کر اپنی شاعری میں جدت پیدا کی ہے۔

مظفر حنفی کے کلام میں اردو کی شاعرانہ روایت کی بازگشت ضرور مل جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

دل پا دس بجی تو وقت ہے پینے پلانے کا
گھٹا اکثر نہیں کھل کر برستی دیکھا گیا ہے

مظفر حنفی نے بعض اوقات سپاٹ بیان سے کام لیا ہے لیکن اس سپاٹ بیان میں بھی صورت حال کا تیکھا پن نمایاں ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

سوچ نئی ہے لہجہ تیکھا فکر ہے آورد جدا
دانستہ رکھا ہے اپنے شعروں کا انداز جدا

مظفر حنفی کی غزل میں جدت اور جودت کے ساتھ ان کی شاعری میں ایک نوع کا کھردرا پن بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ:

اس کمرے دری غزل کو نہ یوں منہ بنا کے دیکھ
کس حال میں لکھی ہے مرے پاس آ کے دیکھ

لیکن یہی لہجہ صورت حال کی ایسی وضاحت کرتا ہے جو شاید دوسری طرح ممکن نہ تھی۔ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے ہر شعر پر اپنی انفرادیت کا رنگ بھی چڑھا لیا ہے یا اپنا ٹھپہ لگا دیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس کے لیے انھوں نے بطور خاص اہتمام بھی کیا ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ ان کی غزل وقت کے مزاج سے عاری ہو۔ بعض اوقات اس میں تاریخی شعور کا احساس بھی جاگتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

پھر ہاتھ نہ آئیں گے وہ الفاظ بگڑ کر
پتھر کے زمانے سے جو محکوم رہے ہیں

البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا راستہ سیدھا راستہ نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

میں نے اپنا فن ٹھہرا لیا ترچھی راہوں پر چلنا
جب سے سیدھی سیدھی راہیں پاؤں سے ناپ لی ہیں

اسی غزل کا ایک شعر دھاردار طنز کا آئینہ دار ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

بے شک فلسفیوں جیسی بات کرے گا شعروں میں
جس نے بھی دو چار کتابیں مغرب سے منگوا لی ہیں

مظفر حنفی نے اپنے آپ کو پانچواں درویش کہا ہے۔ فسانے اور اساطیر سے ان کا گہرا رشتہ رہا ہے۔ وہ "گوہا" کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

اور پھر پانچویں درویش کی باری آئی
باغ فسانہ میں عورت کی سواری آئی

وہ اپنے آپ کو میر، غالب اور فراق سے الگ بتاتے ہیں۔ لیکن ان کی شاعرانہ روایت سے مظفر حنفی نے استفادہ ضرور کیا ہے۔ وہ مطالعۂ حیات کے قائل ہیں اور وہ آنکھوں سے کتاب کی عینک ہٹا کر بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایک مقام پر وہ کہتے ہیں کہ:

پیپل کا دوسرا ہے کتابوں کا طاق اور
ہے گھر کا ذوق اور ہمارا مذاق اور

اختر الایمان نے غزل سے پناہ مانگی تھی۔ مظفر حنفی شاعری میں نرے تغزل کے قائل نہیں۔ لیکن آتش کے لہجہ مردانہ کے قائل ہیں۔ ان کے کلام میں طلسم ہوش ربا کا ذکر بھی ہوا ہے اور قدیم حکایتوں کی گونج بھی پائی جاتی ہے۔ پانچویں درویش کا استعارہ ان کے کلام میں بار بار آیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

پانچواں درویش ہوں مجھ سے سنو
اک نیا افسانہ باغ و بہار

"نیکی کر دریا میں ڈال" کا ذکر بھی ان کے کلام میں موجود ہے۔ اگرچہ اب فسانے سے انھوں نے اپنی توجہ ہٹا لی ہے اور شاعری کا دامن مضبوطی سے تھام لیا ہے۔ ان کی شاعری میں ندرت و جدت کے اسالیب حاوی رہے ہیں اور کہیں کہیں یہ گمان ہوتا ہے کہ اپنے طرز کو جدا رکھنے کے لیے وہ بعض اوقات غیر معمولی تکلیف سے بھی کام لیتے ہیں۔

عام روایتی بیان میں بھی وہ کوئی نہ کوئی نیا پہلو نکال لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

اے مظفر صاف اور تہہ دار ہے میری غزل
آپ بیتی ہے حدیث دیگراں ہوتے ہوئے

اس آپ بیتی میں وہ سماجی احتجاج بھی شامل ہے۔ ان کے کلام میں سماجی احتجاج کے متعدد اشعار ملتے ہیں جس کے حوالے سے شاد عارفی کی شاعری اور آتش کا کلام ہے (مردانہ لہجہ مستزاد)۔ ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

باغبانوں کو اجازت ہے کہ من مانی کریں
آئیے ظلم چمن پر فاتحہ خوانی کریں

لیکن مشکل یہ ہے کہ انھوں نے رفتہ رفتہ اپنے وطن کو بھی مجبور مان لیا ہے جو دوسروں کی پریشانی دور کرنے سے قاصر ہیں۔ ترقی پسندانہ خیالات تو ان کی شاعری میں ملتے ہیں لیکن شاید ترقی پسند تحریک سے ان کا رابطہ استوار نہیں رہا ہے۔ وہ شعر کے ابلاغ اور ترسیل فہم ہونے کو ضروری سمجھتے ہیں اور شاید اسی لیے جدیدیت اور تجریدیت سے وہ اب اجتناب برتنے لگے ہیں۔ شاید اسی لیے وہ جدیدیت سے الگ ہوئے۔

جہاں تک تغزل کا تعلق ہے وہ اس کا انکار کرتے ہیں لیکن ان کی غزل میں جگہ جگہ تغزل کے نقوش بھی ملتے ہیں۔ اپنے ہم عصروں میں وہ جگر سے بھی متاثر ہوئے ہیں۔ اگرچہ اپنا لہجہ الگ رکھا ہے۔ جگر کے تغزل سے تو خود فیض نے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ مظفر حنفی کا شعر ہے جس پر جگر کی چھاپ واضح ہے:

میں تھا کہ احتیاط کو ٹھکرا کے پی گیا
وہ دیکھتے رہے کہ کوئی دیکھتا نہ ہو

شمس الرحمن فاروقی نے مظفر حنفی کو ہندو پاک کے سب سے زیادہ کہنے والے اور سب سے زیادہ شائع ہونے والے شاعروں میں شمار کرتے ہوئے دونوں کو مساوی حیثیت دی ہے۔ جو شاید صحیح نہیں۔ امریکہ اور کناڈا میں رہنے والے اکثر شاعروں اور شاعرات کی کتابیں مسلسل چھپ رہی ہیں۔ البتہ زود گوئی کے وصف کو ان کے منفرد لہجے نے سنبھالا دیا ہے۔ سماجی احتجاج نے ان سے یہ خوبصورت شعر بھی کہلوائے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

احتجاجاً سر اٹھایا جب کسی لاچار نے
خود فرمانے کا وعدہ کر لیا سرکار نے

یہ آج کی ظلم حکومت پر گہرا طنز ہے اور حقیقت یہ ہے کہ طنزیہ اسالیب نے ان کی شاعری میں نئی جان ڈال دی ہے۔ جس کے لیے ہی شاعر شاد

باقی: صفحہ ۲۱ پر ملاحظہ فرمائیے

"مرنا ہے تو بے موت نا مرنا"

ہمدان نعمانی (کولکتہ، بھارت)

شعری اصناف سخن میں لاغزل کے بعد کا اطلاق نظم پر ہوتا ہے۔ کوئی بھی نظم غزل نہیں ہو سکتی لیکن غزل کے فارم میں نظم کہی جا سکتی ہے اور نظموں کے متعدد اقسام بھی ہیں۔ اردو میں جدید نظم نگاری کا آغاز ۱۸۶۷ء میں انجمن پنجاب کے زیر نگرانی مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا حالی کی سرپرستی میں ہوا۔ اقبال اور جوش کی نظمیں اسی جدید نظم نگاری کی بازگشت ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ترقی پسند شعراء میں فیض اور مجروح نے غزلوں میں بھی اپنا اسلوب و آہنگ برقرار رکھا۔ ترقی پسندوں کے نظریے سے انحراف کرتے ہوئے شعراء کا ایک حلقہ میرا جی اور ن۔ م۔ راشد کی سربراہی میں حلقۂ ارباب ذوق کی شکل میں افق ادب پر نمودار ہوا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ادبی بددیانتی ہوگی اگر اردو نظم کی تاریخ میں امیر خسرو تا حالی نظم نگاروں (جنہوں نے اپنے زمانے کے تقاضے کے مطابق) ماضی بعید و ماضی قریب کے پیش روؤں کی خدمات کو مسترد کر دیا جائے یا انہیں آؤٹ ڈیٹیڈ قرار دے دیا جائے جو اردو ادب کا سرمایۂ عظیم ہیں۔

دراصل جدیدیت ترقی پسندوں کی تنگ نظری اور بندھے ٹکے نظریے کے خلاف ایک اقدام تھا۔ یہ سچ ہے کہ ہر زمانے کا سچا شاعر و ادیب عصری رجحان اور حقائق کو ہی رموز و علائم سے مزین کرتے ہوئے ترسیل و ابلاغ کی شکل کو سہل بناتا ہوا اپنی تخلیق کو آراستہ کرتا ہے۔ ۱۹۶۰ء کے آس پاس ترقی پسندی اور حلقۂ ارباب ذوق سے مختلف ایک بدلے ہوئے تخلیقی رویے کا نام جدیدیت ہے۔ جہاں ہر طرح سے وسیع پسندی کے واضح امکانات ملتے ہیں۔ مظفر حنفی کا شمار جدیدیت کے نمائندوں میں ہوتا ہے۔ ان کی شخصیت کثیر الجہات ہے۔ اپنی عمر سے زیادہ کتابوں کے مصنف اور تخلیقی سفر کی نصف صدی گزارنے کے بعد بھی موصوف کے فن پارے رواں دواں آبشار رہتے ہیں۔ حالیہ دنوں ایک ورقی کتاب "اردو میں ہندوستان" اس کا بین ثبوت ہے۔ خواہ افسانہ نگاری ہو یا غزل گوئی، سفرنامہ ہو یا ترجمہ نگاری، ادب اطفال ہو یا نظم نگاری و ادبی تحقیق کی سیر ہو یا معرکۂ تخلیق و تنقید غرض ہر شعبے میں نہ صرف اپنے قلم کا نقش قائم کیا بلکہ اپنے استاد محترم شاد عارفی کو اردو دنیا میں نہایت ہی سلیقے سے متعارف کرایا جو ان کی قدر شناسی بھی ہے اور بحیثیت شاگرد سعادت مندی بھی۔

مظفر حنفی کا یہ تیرہواں شعری مجموعہ "آگ مصروف ہے" جسے بھوپال اردو اکادمی نے شائع کیا ہے۔ جس میں ۵۹ غزلیں، ۱۰۶ نظمیں اور ۵۶ رباعیات شامل ہیں۔ سردست غزلوں سے صرف نظر کرتے ہوئے نظمیں اور رباعیات پیش نظر ہیں۔ حنفی صاحب نے رباعیات، پابند اور آزاد نظمیں اور غزلیں کہی ہیں۔ غزل کا وافر سرمایہ موجود ہے جو تقریباً ہزار اشعار پر مشتمل ہیں اور اس وافر سرمائے سے انتخاب آسان تھا۔ موصوف نے خود ہی کہا ہے۔

بری نہیں ہے مظفر کوئی بھی صنف ادب
نظم غزل کے رنگ میں رہے تو اچھا ہے

"لوح طلسم آباد سے" ابھی مہذب نہیں ہوئے ہیں ہم ۱۰۶ نظموں میں سے بزدلی، ایک نظریہ نظم، عمر گریزاں، تحفہ، قہر اور ابھی مہذب نہیں ہوئے ہیں ہم کا شمار پابند نظموں میں اور بقیہ تمام نظمیں آزاد نظموں کے زمرے میں آتی ہیں۔ ان نظموں میں شاعر نے عرفان ذات اور نا پرسی، تجربہ و تجزیہ، نفسیاتی ژرف بینی، جدیدیت کی شعوری قبولیت، انداز بیان میں سکہ لگا رنگ، منفرد اسلوب، گہری زبان، کہیں کہیں خود سے بیگانگی اور کہیں خود کلامی تو کہیں خود آگہی سے اپنی شعری کائنات کی تزئین بڑی ہنرمندی سے کی ہے۔ طنزیہ لہجے کی کاٹ نے نظم کو دو دھارا بنا دیا ہے۔ یہ کہنے میں باک نہیں کہ موصوف کے لسانی تجربے نے لفظوں کے تلازمات میں مزید اضافے کیے ہیں۔ مزید برآں ایہام، رمز و کنایہ اور استعاراتی نظام و پیکر تراشی نے نظموں کے حسن میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ نظم کا ہر مصرعہ ایک بیانیہ وصف سے متصف ہے۔ نظموں کا اختتام کہیں ایک نئے تجسس کے باب وا کرتی ہے تو کہیں قاری کشمکش و مخمصے میں مبتلا ہو جاتا ہے تو کہیں ایک خوش گوار حیرت بصیرت افروزی کا سامان مہیا کرتی ہے۔ جہاں موصوف کی غزلوں میں ایک جہان معانی آباد ہے وہیں نظمیں بھی انسانی جذبوں اور ان کی آفاقی سچائیوں کو آشکار کرتی ہیں۔ زیادہ تر نظمیں آزاد ہیں مگر پابند نظمیں بھی افکار کی بلندیوں کو چھوتی نظر آتی ہیں۔ بہ مختصر میں اپنے لہجے اور اسلوب سے پہچانے جانے والے منفرد قلم کار اور ہر شعر پر اپنے نام کا ٹھپہ لگانے والے شاعر کی نظمیں اس کے قلب و نظر کی گہرائیوں کو آشکار کرتی ہیں۔ جس میں حیات و کائنات کے تمام مسائل سانس لیتے ہیں۔ انہیں اپنی صداقت کے آئینہ خانے میں جگہ دیتے ہیں جس میں ایک شان بے نیازی اور انکساری بھی ہے جو قلندرانہ رویے کے غماز ہیں۔ مگر حالات کے انتشار اور کسی کی حق تلفی پر لاوا کی طرح پھٹ پڑتے ہیں۔ خودی کو شاعر تصور کرتے ہوئے زمانے کے ادب کی پرواہ کیے بغیر نام نہاد سکہ بند ناقدوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔

کئی نقاد عظمت بانٹتے ہیں
مظفر سر بسر انکار ہو جا

معیار و مرتبہ کا فیصلہ آنے والے کل پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اس تناظر میں نظم "میری نظموں کا مصرف" ملاحظہ کریں۔

میں نہیں کہتا
کہ میری کمزوری نظموں کو پڑھ کر

سنگ میل میں رہ کر تحلیل کیجیے
میری تعبیر تو
روایت کی بہت پامال فرسودہ
سڑک کے دونوں جانب
کنکروں اور پتھروں کے
ڈھیر کی مانند ہیں
جن سے راہیں بنائی جائیں گی

میری دانست میں کھردرے الفاظ اور کھرا لہجہ شاعر کے جسم و جان کا حصہ ہے۔ اس نظم میں روایت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ نئے راستے تلاشنے کا اعلامیہ بھی ہے جس پر آج کی نئی نسل رواں دواں ہے۔

لوہے کے راستے پر ٹوٹی لکڑی، پاتال کی منطق اور دوسری جلاوطنی کا شمار نمائندہ آزاد نظموں میں کیا جانا چاہیے۔ یہاں شاعر نے سرشت آدم کی نفسیات والے منفرد اسلوب میں آشکار کیا ہے۔

"آگ مصروف ہے" میں ۵۶ رباعیات کا ایک الگ ذائقہ ہے واضح ہو کہ اس سے قبل "دیپک راگ" میں ۳۲ اور "طلسم حرف" میں ۳۳ رباعیاں شامل تھیں۔ رباعی اپنے مخصوص بحر کی وجہ سے اپنا ایک الگ وقار رکھتی ہے اساتذہ نے رباعی گوئی کے لئے فکر و فن پر عبور و قادر الکلامی کی شرط رکھی اور یہ خوبی بتائی ہے کہ پہلے تین مصرعے ذخیرہ آب بنائیں اور چوتھا مصرع فوارے کی طرح چھوٹتا نظر آئے۔ حنفی صاحب کے رباعیات کے مطالعے سے بے ساختہ مجروح کا یہ مصرع ذہن میں گونجنے لگتا ہے

اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

جس میں موضوعات کا تنوع، بول چال کی زبان، مکالماتی انداز، سربلندی اور انا پسندی، اندرون ذات کا سلگتا منظر نامہ، سرشت، کھرا لہجہ اور سہل ممتنع کا ایک نکھرا ہوا شگفتہ اسلوب کی کارفرمائیاں نمایاں ہیں۔ گہرے مشاہدے کے ذریعہ عرفان ذات کی بصیرت اور حساسیت ملاحظہ کریں۔

کیا عرض کروں پست کہ قد آور ہوں
باہر سے تو اندر ہی کا پس منظر ہوں
ہاں قد سے خیالات اگر جڑتے جائیں
میں اپنی رسائی سے بھی بالاتر ہوں

مرنا ہے تو بے موت نہ مرنا بابا
دم سادھ اس پل سے گزرنا بابا
سنتے ہیں کہ ہے موت سفر کا وقفہ
اس پار ذرا بچ کے اترنا بابا

تقدیر پہ الزام نہیں دھر سکتے
خاکے میں یہ رنگ نہیں بھر سکتے
ہر لوح پہ تحریر کہ جینا ہے حرام
آواز اٹھا دو کہ نہیں مر سکتے

شاعر کے سفر کا ایک ارفع مقام یہ ہے کہ انسان خود اپنا احتساب کرے اور اس کا یہ احتساب ہی اس کا سب سے اہم مرحلہ ہے جب اس کا عرفان ہو جائے اور فکر کو خیالات سے جوڑ کر دیکھنے کے بعد وہ خود اپنی رسائی سے بالاتر نظر آتا ہے۔ موت ایک تلخ سچائی ہے لیکن اس کے بعد بھی ایک دنیا ہے جو اس زندگی کے خاتمے کے بعد کی دنیا ہے لہذا وہاں بھی ہم صحیح و سالم گزر جائیں۔

شبنم ہے کہ تاروں کی وضو کی بوندیں
یہ پھول لگے کہ رنگ و بو کی بوندیں
احساس کا یہ حال ہے کہ ہر منظر پر
آنکھوں سے ٹپکتی ہیں لہو کی بوندیں

حساس شاعر و ادیب کے یہاں اس کے اندر ہی اندر سلگتے رہنے کا عمل جاری رہتا ہے غزلوں پر غزلیں کہہ کر جذبہ تشنہ رہ جاتا ہے اور وحشت کو کہیں ٹھہرنا کہیں چین نہیں ملتا ہے کیونکہ اس کے سینے میں حساس دھڑکتا ہوا دل ہے جو معاشرے کے جبر پر کائنات کا ایک فرد ہونے کے ناطے لفظوں کو اشاروں سے بتاتا ہے

لب تک وہی افسانہ محمود و ایاز
سچ ہے کہ تضادات کی ڈوری ہے دراز
دامن میں وہی بہت خون کے رنگوں کے ستم
ظاہر میں مساوات کی اونچی آواز

ہر گام پہ سو بار بھٹکتی حیرت
آئینہ در آئینہ بھٹکتی حیرت
معیار اگر نہ جھوٹ سا ملتا کوئی
سچ کو بھی پہچان نہ سکتی حیرت

جملوں میں مقید ہیں پریشاں الفاظ
منہ بند سسکتے ہوئے حیراں الفاظ
افسانے نہ گڑھے شعر کہے نظم لکھی
الفاظ تھے کھوکھلے بے جاں الفاظ

محولہ بالا رباعیات کی روشنی میں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ مظفر حنفی نے اپنی رباعیوں میں منفرد، اچھوتے اور مخصوص اسلوب سے روزمرہ کے واقعات کی مرقع نگاری حسین انداز میں کی ہے۔ ان کے ہی ایک قول کی روشنی میں اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

''ہر انسان برابر ہے''

ڈاکٹر خوشحال زیدی

(دہلی بھارت)

مظفر حنفی اردو ادب اطفال میں کئی حیثیتوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ ناقد بھی ہیں۔ محقق بھی۔ ڈرامانگار بھی ہیں اور بہترین کہانی نویس بھی۔ شاعر اعلیٰ پایہ کے ہیں۔ ادب اطفال کے تحت ان کی تمام تخلیقات نظم و نثر بچوں کے دلوں کو چھوتی ہیں۔ بچوں کی آپسی نوک جھونک، محبت و نفرت شرارتیں، کھیل، تماشے، ایک دوسرے سے حسد، جیسے موضوعات ان کی نظموں، کہانیوں اور ڈراموں کے موضوعات رہے ہیں۔ موصوف تقریباً پچھلے ۵۵ برس سے مسلسل بچوں کے لیے لکھ رہے ہیں۔

مظفر حنفی کی تخلیقات نظم و نثر پہلے پہل دہلی کے ماہنامے کھلونا اور پھلواری جیسے پرچوں کے بالکل ابتدائی دور میں ہی شائع اشاعت نظر آتی ہیں۔ چونکہ یہ ان کا لڑکپن ہی کا زمانہ تھا۔ اس لیے ان کی تخلیقات میں فطری شوخیاں، شرارتیں، نفسیاتی پیچیدگیاں اور بچوں کے ذاتی مسائل بہت خوبصورت انداز میں مل جاتے ہیں۔ بعد کی تخلیقات میں بھی انہوں نے کبھی بڑا بننے کی کوشش نہیں کی۔

''فٹ بال، پتنگ کا مرثیہ، گھی شکر، ناچ میرے بندر، چوہا ماموں، اولیں سے ماں نے کہا، امتحان ہال میں، مداری کا بندر، اور دو روٹے لگا، مزدور کا نغمہ---'' وغیرہ مظفر حنفی کی مختلف موضوعات پر دلچسپ نظمیں ہیں۔ جو بچوں کے مختلف رسائل مثلاً 'دوست' کراچی، فنکار (کراچی) کھلونا (دہلی)، کلیاں (لکھنؤ)، بچوں کا آج کل (دہلی) اناؤ (ملیگاؤں) پھلواری (دہلی)، جگنو (بھوپال) کرنیں (ناگپور) اور رہنمائے تعلیم (دہلی) وغیرہ میں وقتاً فوقتاً چھپتی رہی ہیں۔

مظفر حنفی نے اپنی تمام نظموں میں بچوں کی نفسیات، ان کی ضروریات اور نفسیاتی پیچیدگیوں کو پیشِ نظر رکھا ہے مثلاً گڑیا گڈے کے سلسلے میں بچوں کے مابین اکثر تنازع بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ لیکن گھر اور شوخ و شنگ بچے کی شرارت اور معصوم بچی کا واویلا مظفر حنفی کی ہائے اللہ جیسی نظموں کے موضوع رہے ہیں۔ ایک بند مثال کے طور پر درج ذیل ہے:

ٹانگیں ٹوٹی ہیں گھوڑے کی
درگت گڑیا کے جوڑے کی
کھول کے میری الماری کو
کس نے ان پر بولا ہلّہ
کوئی دوڑو ہائے اللہ

کھیل بچے اور بڑے سب پسند کرتے ہیں۔ کھیل بچوں کی جسمانی اور ذہنی نشوونما میں بڑے معاون ثابت ہوتے ہیں لیکن ایسا بھی ممکن نہیں کہ بچوں کو محض کھلاڑی بننے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ مظفر حنفی کی نظم فٹبال کے یہ دو بند بطور مثال ملاحظہ ہوں۔

اور نہ مانو بڑوں کا کہنا
کیچڑ ہی میں لپٹے رہنا
ہم نے منع کیا تھا تم سے
مت کھیلو فٹ بال
کیسا جھل گیا سارا گال

اس میں ہے اپنی ہی بھلائی
کہنا بڑوں کا مانو بھائی
مرہم لگوا لو اور جاکر
لٹھ اوڑھ کے شال
کیسا جھل گیا سارا گال

کھیل کے ساتھ تماشے اور خصوصاً مداری کا تماشہ کس کو پسند نہیں۔ مظفر حنفی کی نظم تاک دھنا دھن جدید شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔ بندر کا ناچ ہو رہا ہے آیئے تصور کا سہارا لے کر لطف اندوز ہوں:

ہمکن کے ٹھنگر
لاٹھی لے کر
کاندھے پر رکھ
دلّی جا
دلّی جاکر
اپنے واسطے
ایک چاندی کی بیوی لا
تاک دھنا دھن، دھنک دھنا
چل میرے بندر ناچ دکھا

بچوں کی ضروریات اور دلچسپیوں کے ساتھ، مظفر حنفی نے بچوں میں مساوات، مذہبی رواداری، انسان دوستی، قومی اتحاد اور حب الوطنی کو فروغ دینے والی نظمیں بھی تخلیق کی ہیں اور بچوں کے دلوں سے نفرت کا جذبہ دور کرنے نیز باہمی محبت پیدا کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ مساوات کا درس انہوں نے اپنی نظم 'سب انسان برابر ہیں' میں بڑے برجستہ اور بے ساختہ انداز میں دیا ہے۔ انہوں نے کوشش کی ہے کہ ہندوستان جیسے عظیم ملک کے سبھی فرقوں، زبانوں اور علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی برابر حیثیت کا تعین کر دیا جائے۔ نظم کا ایک اقتباس میرے اس خیال کی تائید میں پیش ہے۔

کشمیری ہو یا سندھی
اردو بولے یا ہندی
دھوتی پہنے یا شلوار
پھول سجائے یا بندی
سب کا مان برابر ہے
ہر انسان برابر ہے
سکھ ہو یا ہندو ہو
احمد ہو اور بندو ہو
وہ سکھ ہو یا عیسائی
مسلم ہو یا ہندو ہو
سب کا مان برابر ہے
ہر انسان برابر ہے

حب الوطنی سے معمور نظم "سرزمین ہند" کے دو بند بھی بطور خاص ملاحظہ ہوں:

حقیقتاً بہشت سے کہیں سوا حسین ہے
جواب اس کا روئے ہے زمیں پہ نہ کہیں ہے
یہی ہمارا دھرم ہے یہی ہمارا دین ہے
کہ دو جہاں میں سرزمین ہند بہترین ہے
قدم قدم پہ اس کے بے شمار پاسبان ہیں
امیر ہیں، غریب ہیں، جوان ہیں، کسان ہیں
ہزار ان میں فرق ہو مگر ہمیں یقین ہے
کہ دو جہاں میں سرزمین ہند بہترین ہے

مظفر حنفی نے اپنی نظم "ذمہ دار ہوں گا" کے ذریعہ نونہالوں میں جدید ہندوستان میں جاری و ساری خامیوں کو دور کرنے کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے:

آمدنی کم کنبہ بھاری
بچے بھوکے ماں دکھیاری
لاحق روز نئی بیماری
سب کا باعث ہے بیکاری — میری بھی ہے ذمہ داری
ہر شعبہ میں رشوت خوری
بازاروں میں سینہ زوری
دن میں جھگڑے رات میں چوری
سب کا باعث ہے بیکاری — میری بھی ہے ذمہ داری

مظفر حنفی کی چودہ کہانیوں اور ڈراموں کا مجموعہ مکتبہ پیام تعلیم دہلی کے توسط سے منظر عام پر آچکا ہے "نیلا ہیرا" ان مقبول کہانیوں اور ڈراموں کا مجموعہ ہے جو موصوف نے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۶ء کے دوران قلم بند کی تھیں۔ اس میں بارہ کہانیاں اور دو ایک بابی ڈرامے ہیں جو کتابی شکل میں چھپنے سے قبل بچوں کے مشہور و مقبول رسائل میں شائع ہو چکے تھے۔ "نرالا گڈا" (پھلواری دہلی نومبر ۱۹۵۱ء) "جھمنا" (پھلواری جون ۱۹۵۲ء) "قتل کا قصہ" وغیرہ شریک اشاعت ہیں۔ علاوہ ازیں دو کہانیاں "جنگ نہ ہونے پائے" پھلواری جون ۱۹۵۵ء "انوکھی کہانی" (چاند تارا گورکھپور جنوری ۱۹۵۲ء) بھی رسالوں میں ملتی ہیں۔ مظفر حنفی نے چند معلوماتی مضامین بھی لکھے ہیں جو ان کی منظومات کے ساتھ بچوں کی درسی کتب میں شامل ہیں مثلاً "محبت کے پیام بر کبیر داس" اور "ٹیگور کا بچپن"۔

"بندروں کا مشاعرہ" نظم و نثر کے امتزاج کا ایک اچھا نمونہ ہے جس میں بندر شریر بچوں کی طرح شوخیاں کرتے نظر آتے ہیں۔ باغوں میں کودتے ہیں اور دلچسپ ہنگامے کرتے ہیں۔ بچوں کے مشاعروں اور بیت بازیوں کے موقع پر بندروں کے اس مشاعرے کا سماں آنکھوں کے سامنے گزرتا ہے بندروں کے مشاعرے کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"میاں دم کٹے کے مداری کے چنگل سے چھوٹ آنے کی خبر نے سارے جنگل کے بندروں کے دلوں کو خوشی سے بھر دیا۔ بندر شاعروں کی انجمن نے برادری کے مشہور اور پیارے شاعر دم کٹے صاحب کو قید تنہائی سے چھٹکارا پا جانے پر مبارکباد پیش کرنے کے لیے ایک مشاعرہ کا انتظام بھی کر ڈالا اور اسی دن شام کو ایک بندر بڑا سا ڈھول گلے میں لٹکا کر دھم دھم بجاتا ہوا سارے جنگل میں دم ہلا ہلا کر اعلان کر آیا"۔

بندروں کے اس مشاعرے میں بندروں کی اچھل کود، داد و تحسین کا انداز، ان کی خوشیاں، ان کی شوخیاں اور اسی قسم کی پرلطف باتوں کا بیان اتنی خوش اسلوبی سے کیا گیا ہے کہ معصوم سے معصوم ذہن بھی اس کے تخیل سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

"تاج کی درگت" مظفر حنفی کا ایک روایتی ڈراما ہے۔ اس ڈرامے میں بادشاہ بہت نیک اور شریف ہے۔ رعایا اس سے بہت خوش ہے لیکن وہ توہم پرستی کے سبب شاہی تاج کی درگت کا سبب بنتا ہے۔ ڈرامے کا آغاز بچوں کے معمولی کھیل سے ہوتا ہے جس میں پہیہ چلاتے ہوئے وہ شاہی قلعہ کے پھاٹک تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ معصوم اور بھولے بھالے بچے کھیل کھیل میں ایک گیت سونے کی انگوٹھی سے پھاٹک پر لکھ دیتے ہیں۔ اس طرح مصنف نے نہایت چابکدستی کے ساتھ ایک معمولی سے واقعہ کو ڈرامے کا موضوع بنایا ہے۔ بچوں کا لکھا ہوا یہ گیت تقریباً ادھورا ہے۔ اور بادشاہ اور اس کے مصاحب اسے پڑھتے ہیں۔ اس موقع کی ایک جھلک دیکھئے۔

"بادشاہ: (پھاٹک کی طرف دیکھ کر) میں نے دیکھی اور جیا

پنجرے سے اڑ گئی۔ اڑتے اڑتے بڑی دور تک اور پری اوپر گئی۔ پھر وہاں سے گر کر مر گئی۔

بادشاہ (چونک کر) ارے یہ تو ڈھنگی معلوم ہوتی ہے۔ (سنتری سے) یہاں کون آیا تھا؟

سنتری صرف ایک نجومی آیا تھا۔

بادشاہ کیا اس نے چاٹک کو چھوا تھا۔

سنتری جی نہیں عالم پناہ۔

"تاج کی درگت" چونکہ بچوں کے لیے ہے اس لیے ڈرامہ نگار نے بچوں کی دلچسپی کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔ بچے تاج کے مقابلہ میں کھیل کے پیسے سے زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ مظفر حنفی نے زبان کی لطافت کے ساتھ سادگی اور روانی کو برقرار رکھا ہے۔ نیز کرداروں کے حسب مرتبہ الفاظ اور جملے استعمال کیے ہیں۔ درج ذیل سطور مصنف کی مرقع کشی پر مہارت کا ثبوت ہیں۔

"شاہی چاٹک! اگل تو میں تم سے پوچھنا بھول ہی گیا تھا۔ لاؤ جلدی سے مجھے پیسہ دے دو صبح کا اسکول ہے مجھے دیر ہو رہی ہے۔ (کچھ ٹھہر کر) کہیں تم اس لیے ناراض تو نہیں کہ میں نے اس لڑکی کے بہلانے کو تمہارے اوپر واہیات سا گیت لکھ دیا تھا۔ (مناکر) لو اب تو گیت بھی سنا دیا۔ لاؤ اب پیسہ دے دو۔ تاج کو دیکھ کر۔ واہ رے میرے اچھے چاٹک تم نے تو پہلے ہی کتنا اچھا سا پیسہ دکھا چھوڑا ہے شکریہ"

بادشاہ، مصاحب، نجومی، سنتری، ایک بھولی بھالی بچی، اور ایک کمسن لڑکا اس ڈرامے کے کردار ہیں۔ بادشاہ مصاحب اور نجومی کی حرکات و سکنات اور مکالمات کی پیش کش میں ان کے مرتبہ کا لحاظ رکھا گیا ہے اور بادشاہ کے آنے پر وہی استقبالیہ جملے استعمال کیے گئے ہیں جو ان کے شایان شان تھے۔ بحیثیت مجموعی تاج کی درگت بچوں کا ایک دلچسپ روایتی انداز میں لکھا گیا ڈراما ہے۔ جس کی نمایاں خوبی واقعات کی پیش کش ہے جو بالواسطہ طور پر یہ ڈراما بچوں کو توہم پرستی سے دور رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ مظفر حنفی بچوں کے ادب میں ایک ڈراما نگار کی حیثیت سے بھی امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔ بچوں کے لیے ان کا ایک "ڈراما مچھلی کا شکار" بھی قابل ذکر ہے۔ جس میں اختصار کے ساتھ بچوں کو نمائش پسندی سے بچنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

مظفر حنفی صرف بچوں کے بہترین ادیب اور منفرد شاعر ہی نہیں بلکہ وہ ادب و اطفال کے محقق اور نقاد کی حیثیت سے بھی اردو ادب میں ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ مظفر حنفی ہمیشہ ادب اطفال کے مسائل اور ان کی ضروریات پر غور و فکر کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے اردو ادب اطفال کو نظر یاتی اور ناقدانہ دلچسپی تناظر میں دیکھا اور اس کے بارے میں متواتر تنقیدی مضامین لکھتے رہے۔ مثلاً اردو میں ادب اطفال (مطبوعہ رسالہ زبان و ادب پٹنہ ستمبر ۱۹۸۳ء) بچوں کا ادب ایک سرسری جائزہ (تعمیر ہریانہ چنڈی گڑھ) موجودہ ہندوستان میں بچوں کے ادب کے موضوعات (رسالہ شاہین اندور شمارہ ۱۹۸۵ء) ان کے اس نوع کے مقالات ہیں۔ این سی ای آر ٹی (NCERT) اور نیشنل بک ٹرسٹ جیسے اداروں کی جانب سے منعقدہ سیمیناروں اور ورکشاپ وغیرہ میں وہ ادب اطفال کی نمائندگی کرتے رہے ہیں۔ شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں آپ کی نگرانی میں اردو ادب اطفال پر پہلا تحقیقی مقالہ اردو میں بچوں کا ادب (محقق خوشحال زیدی) پایہ تکمیل تک پہنچا۔

بچوں کے ادب میں ان کی خدمات کے پیش نظر نیشنل کونسل فار چائلڈ ایجوکیشن دہلی نے نومبر ۱۹۸۵ء میں اردو ادب اطفال کے نمائندہ کی حیثیت سے مظفر حنفی کو قومی اعزاز کا مستحق قرار دیا گیا۔ بلاشبہ مظفر حنفی کی ادبی خدمات ناقابل فراموش رہیں گی۔

بقیہ: دل کے آئینے میں

"کوئی بڑی دیر سے آپ کا نام لے لے کر دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے"

"بلاؤ اندر —" میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ملازم ایک شکستہ حال شخص کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ لیکن اف۔ وہ تو ٹھاکر تھا۔ پہلے ٹھاکر سے بالکل مختلف ٹھاکر۔ داڑھی بڑھی ہوئی۔ کپڑے ستارنا رہ لٹکے ہوئے بال۔ دل دل آنکھیں۔ بالکل بچوں جیسی کیفیت تھی میں نے کہا —

"ٹھاکر! یہ تم ہو! کیا حالت بنا رکھی ہے اپنی تم نے"

وہ پچھاڑ کھا کر زمین پر گر پڑا۔

"بابو جی خدا کے لیے وہ تصویر — بابو جی میں آپ کے پاؤں پڑتا ہوں وہ تصویر مجھے دے دیجیے —"

میں بھاگا بکا اسے دیکھتا رہا آخر جواب بھی کیا دیتا؟

وہ گھگھیانے لگا —

"خدا کے لیے وہ تصویر مجھے دے دیجیے بابو جی! وہ میرے گھرے پرے کنبے کی آخری یادگار ہے۔ بابو جی! بابو جی میری پیاری بیوی کی یادگار جو تین سال پہلے مر گئی میرے لاڈلے بچی کی یادگار جو...."

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا — "کیوں کیا ہوا بچی کو —؟"

ٹھاکر نے سینہ پیٹ کر کہا —

"وہ پرسوں ہیضہ کا شکار ہو گیا!!!"

☆

''بے دست وپا لوگو!''

پروفیسر مظفر حنفی کے نظریہ کلام سے مختصر انتخاب

صفوت علی صفوت (نیوارک،امریکہ)

موت کا دوسرا نام

اس کو البم دکھاتے ہوئے،
میں نے بتلایا:
''یہ دیکھیے، یہ مرا دوست ہے''
آج کل غالباً کینیا میں،
ربر کی کسی فرم میں اونچے عہدے پہ ہے''
اس نے چہرے کو لمبا بنا کر کہا:
''میں اسے جانتا ہوں
کئی بار دو چار پگ اس کے ہمراہ بھی پی چکا ہوں،
یہ چھ سال پہلے مجھے کینیا میں ملا تھا،
مگر اس ملاقات کے دوسرے ہی برس،
ریل کے حادثے میں یہ مارا گیا تھا!''
فضا فضا درد سے بھر گئی۔
سمجھ میں نہ آتا تھا، میں اس کی ڈھارس بندھاؤں،
کہ خود چند تسکین کے لفظ چاہوں۔
تو ایسا بھی ہوتا ہے۔۔۔
یہ شخص جو میرے البم کے اس کالے پنے کے البم پہ بیٹھا ہوا
ہے مسکراتا ہے
آج تک میرے نزدیک زندہ تھا یہ،
اور میرے تئیں دو گھڑی پیشتر ہی مرا ہے۔
تو کیا موت کا دوسرا نام ہے آگہی؟!

فصیل جسم کے زندانیوں سے

نہ جانے کب،
کوئی تازہ ہوا کا سرد جھونکا،
اس طرف آ جائے
اور مایوس پلٹے
کیا خبر کس وقت،
چنچل روشنی کی کوئی آوارہ کرن،
کسی دیوار سے سر پھوڑ کر واپس چلی جائے۔
کسے معلوم کب،
معصوم رنگوں کی کوئی تتلی،
ادھر سے ہو کے گزرے،
اور دروازے سے ہی ٹکرا کے رہ جائے
کبھی چونچال سا کلکارتا نغمہ ہی آنا چاہے،
اور دم سادھے لمبا یوں ہو رہے
بہت ممکن ہے خوش بو کا پرندہ ہی کبھی آئے،
سلاخوں سے پروں کو مس کرے،
مجبور ہو جائے
تو اے بے دست وپا لوگو!
برا کیا ہے،
اگر
روزن کھلے رکھو!

ایک فسادزدہ رات میں

میں چلتے چلتے ٹھٹک گیا
سنسان گلی کے نکڑ پر
اک سایہ سالہرایا تھا
یہ تیری جان کادشمن ہے
میری رگ رگ نے دہرایا
خوف بھر ریڑھ کی ہڈی سے
سردی میں پسینہ آنے لگا
دس بجنے میں تھے پانچ منٹ
وقت آہی لگا تھا کرفیو کا
اپنا بٹوہ، پن اور گھڑی
دے کر بچ لوں، میں نے سوچا
ان چیزوں کو ہاتھوں میں لیے
ڈرتے ڈرتے اس تک پہونچا
پھر آسماں جیسے ٹوٹ پڑا
وہ میرے پاؤں پر لوٹ گیا
اے بھیا! مجھ پر ترس کھاؤ!
مت مارو مجھ کو مت مارو!!

○

فیڈنگ پرابلم

شہر میں کرفیو لگا ہے۔
میری ہمسایہ کے گھر طوفاں بپا ہے۔
دودھ اس کی چھاتیوں سے بہہ رہا ہے۔
بھوک سے بے حال بچہ اس کے کپڑے نوچتا ہے۔
دودھ کا ٹن اس طرف خالی پڑا ہے۔
شہر میں کرفیو لگا ہے۔

دائرے سے مربعے تک

زمیں گول تھی،
(یعنی اس کی کوئی حد نہ تھی)
مگر تم نے اس پر،
سمندر کے پردے لگا کر،
کئی بر اعظم بنائے۔
پہاڑوں کو دیوار،
ندیوں کو خندق بنا کر،
اسے سیکڑوں تنگ ملکوں میں بانٹا۔
ہر اک ملک میں رنگ اور نسل،
تہذیب و مذہب،
زبان و ثقافت کی چھریاں چلا کر،
اسے صوبوں میں،
شہروں میں، قصبوں میں،
گاؤں میں ٹکڑے ٹکڑے کیا۔
پھر وہاں بھی علاقے محلے کی قاشیں،
محلوں میں گھر،
پھر گھروں میں بھی کمرے،
کئی مستطیلیں،
ہزاروں مربعے!
بتاؤ!
کہ ان چار دیواروں میں بیٹھ کر،
تم کو اپنی گھٹن،
اور اس حبس و تنہائی کی شکل میں،
جو سزا مل رہی ہے
وہ کیوں کر غلط ہے؟
زمیں گول رکھنے میں ہی مصلحت تھی!

کچھن ریکھا

تم کہو گے دن تو میں بھی کہوں گا،
ہو بلا سے رات آدھی۔
میں کہوں گا رات،
تم سورج چمکتا ہو تو اس کو چاند سمجھو گے۔
تمہاری آنکھ میں آنسو نظر آئیں گے جب،
میں تعزیت کے ریشمی رومال سے پونچھوں گا ان کو۔
مسکراؤں میں،
تو تم اس کو گل افشانی کہو گے۔
اور دھوکے سے کہیں میں،
شب کو شب کہہ دوں،
کہیں تم دن کو دن کہہ کر مجھے سورج دکھا دو۔
نظر آئے اگر مجھ کو،
تمہاری آنکھ کے آنسو مگر مجھ کے سے آنسو،
مرے ہنسنے کے پیچھے جھانکتی محرومیاں تم کو نظر آجائیں،
تو سمجھو کہ ہم،
اک دوسرے کے جسم میں پوشیدہ شیطانوں سے،
واقف ہو گئے ہیں۔
راہوں میں صلح جوئی کے لیے،
بے حد ضروری چیز ہے،
کچھن کی ریکھا!

O

صور اسرافیل

اب تو بستر کو جلدی سے تہہ کر چکو
لقمہ ہاتھوں میں ہے تو اسے پھینک دو
اپنے بچوں کی جانب سے منہ پھیر لو
اس گھڑی بیویوں کی نہ پروا کرو
راہ میں دوستوں کی نظر سے بچو
اس سے پہلے کہ تعمیل میں دیر ہو
سائرن بج رہا ہے چلو دوستو!

دوسری جلاوطنی

جب گیہوں کا دانا جنس کا سمبل تھا،
اس کو چکھنے کی خاطر،
میں جنت کو ٹھکرا آیا تھا۔
اب گیہوں کا دانہ،
بھوک کا سمبل ہے۔
جس کو پانے کی خاطر،
میں اپنی جنت سے باہر ہوں!

بات کی بات

ہوا جانے کیا کان میں کہہ گئی،
کہ برگد کے پتوں نے تالی بجائی،
شگوفے نے سن کر تبسم کیا،
تھرکنے لگی لہر تالاب میں،
بھڑک کر چراغ سحر بجھ گیا،
ہوا جانے کیا کان میں کہہ گئی۔۔۔

اندر کا ایک مکالمہ

یہ کون آیا،
کہیں کوئی نہیں ہے یہ تو میں ہوں،
ترا اپنا میں۔
ارے!
تجھ کو تو میں نے قتل کر کے،
بے حسی کے سرد اور اندھے کنوئیں میں،
دفن کر رکھا تھا،
تو کیسے؟
بہت معصوم ہے تو،
کیا تجھے یہ بھی نہیں معلوم اے ناداں،
کہ جب بھی تیرے دل میں،
کروٹیں لیتی ہے میرے واسطے نفرت،
تو ایسے وقت میں،
ہوتا ہے تو ہر سمت سے میرے اثر میں۔
جسے تو قتل کر آیا،
وہ تو تھا۔
اور یہ میں ہوں،
ترا اپنا میں!

O

خودی کی دہری چھلانگ

میں بہت اونچی پہاڑی پر کھڑا تھا،
اس لیے کچھ اور بھی اونچی،
کہ اپنے اصل قد سے دوگنی دکھلائی دیتی تھی وہ مجھ کو۔
میرے نیچے،
جھیل کا شفاف پانی،
اس طرح ٹھہرا ہوا تھا،
جیسے کوئی آئینہ پگھلا ہوا ہو۔
سرخ ڈیڈنگ سوٹ میں ملبوس،
وہ تہہ میں کھڑا تھا سر کے بل
(آسماں کی سمت دونوں پیر تانے)
مجھ کو اس ہیئت کذائی پر ہنسی آئی،
تو وہ بھی ہنس دیا تضحیک کے انداز میں۔
اس کی اس جرأت پہ جھلا کر،
لگا دی میں نے نیچے کو چھلانگ،
اور پھر کیا دیکھتا ہوں ---
سرخ ڈیڈنگ سوٹ پہنے،
آسماں کی سمت دونوں پیر تانے،
سر کے بل نیچے چلا جاتا ہوں میں،
جب کہ وہ،
سیدھا اڑا آتا ہے اوپر کی طرف!

O

''چہارسو''

طویل نظم عکس ریز کے، کچھ بند

(۱)

یہ مسلماں ہیں یہ ہندو ہیں یہ سکھ
باہمی اخلاص چیزے دیگر است
قوم پرور یہ ہیں وہ فرقہ پرست
جن میں تھے مذہب کے اخلاقی سبق
پھاڑ ڈالے چھانٹ کر ایسے ورق
مذہباً یہ سب نہایت نیک ہیں
پاک باطن فیصدی دو ایک ہیں
ان کو انسانوں کے خانے میں نہ لکھ
یہ مسلماں ہیں یہ ہندو ہیں یہ سکھ

(۲)

ان سے ملیے حسن کے بازار میں
گرم محفل ہر انہیں کے دم سے تھی
آبروئے دل انہیں کے دم سے تھی
دام اونچے تھے جوان کے جسم کے
اُن کے عاشق بھی تھے اونچے قسم کے
چھوڑیے سب قصۂ ماضی ہیں یہ
آج کل ہر بھاؤ پر راضی ہیں یہ
عمر ان کو کھینچ لائی غار میں
ان سے ملیے حُسن کے بازار میں

(۳)

یہ جو صندل کا لگاتے ہیں تِلک
دَھن میں ان کا کوئی ثانی نہیں
شہر میں ان سے بڑا دانی نہیں
پاٹھ رامائن کی اِک اِک ماترا
سال میں دو بار تیرتھ یاترا
باندھتے ہیں تین گانٹھوں کی جنیؤ
ہونٹ پر بھگوان من میں کام دیو
شادیاں نو کر چکے ہیں آج تک
یہ جو صندل کا لگاتے ہیں تِلک

(۴)

محترم ہیں فوجداری کے وکیل
فیس اُن کی پانچ سو سے کم نہیں
قتل کا مجرم بھی ہو تو غم نہیں
آپ پھانسی کے لیے تیار ہیں
یہ بچا لینے کے دعوے دار ہیں
کس میں ہمت ہے گواہی کے لیے
یہ جو آئیں سَر براہی کے لیے
بھول کر ان سے نہ کیجیے گا دلیل
محترم ہیں فوجداری کے وکیل

(۵)

آپ گُم رہتے ہیں اپنی توند میں
آٹھ دوکانیں ہیں گاندھی چوک پر
یہ نہ پوچھو آپ تھے کیا پیشتر
چونکہ چندوں میں نہیں کرتے کمی
دیں گے انکم ٹیکس کا دس فیصدی
خرچ کرنا آپ کو آتا نہیں
ہاتھ آکر روپیہ جاتا نہیں
جس طرح مکھی پھنسی ہو گوند میں
آپ گم رہتے ہیں اپنی توند میں

(۶)

ہاں ذرا پہچانتا تو آپ کو
آپ کے اسٹور تھے کیا شان دار
بن گئے لیکن میاں ایمان دار
نوکروں پر فرض تھا سچ بولنا
جرم ٹھہرایا گیا ......کم تولنا
طے یہ فرمایا کہ کم لیں گے نفع
ہو گئے گاہک رفع نوکر دفع
چپلیں سیتے ہوئے بیٹھے ہیں جو
ہاں ذرا پہچانتا تو آپ کو

(۷)

رات دن چلتا ہے ہوٹل آپ کا
چھوکرے کپڑا لگا اس میز پر
اے! ذرا چٹنی میں مرچیں تیز کر
دیکھ! شیرینی میں تھوڑا گڑ ملا
ورنہ یہ بابُو ہے بیحد ''ٹھرو ولا''
دودھ میں پانی ملائیں گے تو خود
اور بالائی نہ کھائیں گے تو خود
آنکڑے خشی کے ٹوٹل آپ کا
رات دن چلتا ہے ہوٹل آپ کا

(۸)

ہر محلّے میں کلاری ان کی ہے
دیکھ بے کھڑکی پہ بلوہ مت مچا
پھوٹنے کو ہیں ذرا ٹکڑے بچا
شیخ صاحب! یہ رہی بوتل ......مگر
اک ذرا کھاتے پہ کر لیتے نظر
ریشماں دینا تو بابو کو گلاس
بیٹھ جا سیتا ذرا دادا کے پاس
ملکیت بے شک یہ ساری ان کی ہے
ہر محلّے میں کلاری ان کی ہے

(۹)

ایک ہی باپ کے بیٹے ہیں یہ
''اسم اقدس آپ کا؟'' عبدالکریم
بیچتے ہیں آپ ناجائز افیم
آپ سے پردہ نہیں ہے ایں جناب
کھینچتے تھے غیر قانونی شراب
اتفاقاً ایک دن پکڑے گئے
سات من افیون کے چھکڑے گئے
جیل میں کس ٹھاٹ سے لیٹے ہیں یہ
ایک ہی باپ کے بیٹے ہیں یہ

۔افسانہ۔

دل کے آئینے میں ہے......!

مظفر حنفی

سات آدمی اس نیلگوں تک چٹان پر کھڑے تھے۔ منظر واقعی مرجانے کی حد تک حسین تھا۔ ایک جانب سرسبز شاداب گھاس سے لدی ہوئی پہاڑ کی چوٹی سر بلند کیے کھڑی تھی اور اس کی آغوش میں یہ چٹان واقع تھی۔ ایک پتلی سی نیلی لکیر جیسی پگڈنڈی اسے وادی سے ملاتی تھی۔ دائیں طرف چھوٹا سا آبشار گر کر وادی میں بہنے والی ندی سے ملتا تھا اور ندی کی دوسری جانب گھنے چیڑ کے درختوں کی گود میں چھوٹا سا گاؤں بسا ہوا تھا۔ کچھ تو جنگلی پھولوں نے ہی منظر کو رنگوں سے بھر رکھا تھا پھر اوپر سے ڈھلتے ہوئے سورج کی سرخ شعاعیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے قدرت نے قوسِ قزح کے تمام رنگ اسی جگہ انڈیل دیے ہیں۔

ان سات میں دو عورتیں تھیں۔ ایک نوجوان اور دوسری کی عمر ڈھلنے لگی تھی۔ ایک تیرہ سال کا لڑکا جس کی بغل میں کیمرہ لٹک رہا تھا۔ تین نوجوان مرد اور ایک ادھیڑ عمر کا پستہ قامت شخص۔ لڑکا اسی پستہ قامت شخص سے ضد کر رہا تھا—

"میرے اچھے چچا جان! ایک گروپ آپ کھینچ دیجیے!"

"بھئی نسیم پریشان تو نہ کرو......"

لڑکا مچل گیا—

"نہیں چچا جان! ہم ایک گروپ آپ سے کھنچوائیں گے!"

"اب تم ضد کرو گے......"

لڑکے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بڑی عمر والی عورت بولی

"اے اللہ! جاوید بھائی، میں کہتی ہوں بچے کا دل رکھنے کے لیے کیمرہ لے کر بٹن دبا دو گے تو کیا ہو جائے گا؟"

"میں سچ کہتا ہوں رحمانہ! اب مجھے اس چیز سے الجھن ہوتی ہے اور پھر مجھ سے تصویر اچھی اترتی بھی تو نہیں۔" "خیر یہ تو نہ کہیے بھائی صاحب" نوجوانوں میں سے ایک نے کہا...... "ہم لوگ آپ کے البم دیکھ چکے ہیں۔ ماشاء اللہ فوٹوگرافی میں آپ کو خاص مہارت ہے۔"

"یہ فن تو میں عرصہ ہوا چھوڑ چکا ہوں۔"

"پھر بھی جیسا آپ سے بنے، ایک گروپ لے ہی دیجیے۔" نسیم نے اصرار کیا باقی لوگوں نے بھی تائید کی۔ مجبوراً جاوید کو کیمرہ ہاتھ میں لینا پڑا۔

"نسیم تم سامنے بیٹھ جاؤ۔ رحمانہ تم ان کے بائیں طرف آ جاؤ۔ ہاں سلمٰی وہاں بائیں جانب ٹھیک رہیں گی۔ قمر تم نے تو آنکھیں بالکل ہی پھاڑ دیں۔ نگاہ بہت نرم رکھو۔ اگر تے ہوئے آبشار کی طرف...... رحیم تم وہاں کیا دیکھ رہے ہو، نگاہ ادھر رکھو۔ شاہد چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کرو بھلے آدمی...... بس ریڈی......"

وہ بٹن دبانا ہی چاہتا تھا کہ اچانک اسے اپنے کان بجتے ہوئے محسوس ہوئے اور وہی جانی پہچانی لرزتی ہوئی ملتجیانہ آواز......

"بابوجی! خدا کے لیے وہ تصویر...... بابوجی میں آپ کے پاؤں پڑتا ہوں، وہ تصویر مجھے دے دیجیے" اسے اپنے بدن میں کپکپی کی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی ہاتھ کسی شاخِ نازک کی طرح لرزنے لگے اور دوسرے لمحے کیمرہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے ندی میں جا پڑا!

تقریباً دس منٹ بعد جاوید کی بے ہوشی دور ہوئی تو اس نے بقیہ چھ افراد کو بدحواسی کے عالم میں اپنے اوپر جھکے ہوئے پایا۔ زبردستی اپنے چہرے پر مسکراہٹ لانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے وہ اٹھ بیٹھا۔

"اب کیسی طبیعت ہے بھو جان......!" سلمٰی نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ پوچھا

"کچھ نہیں بیٹی! ٹھیک ہوں......"

"مجھے معاف کر دیجیے چچا جان"! نسیم گڑگڑایا

"ارے پگلے!" جاوید کھوکھلی ہنسی ہنس کر بولا......" اس میں تیری کیا غلطی تھی۔"

"ہائے اللہ!" رحمانہ نے کہا......" آپ کہتے ہیں اس کی کوئی غلطی ہی نہ تھی۔ یہی شریر تو آپ کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ اگر راشد نے لپک کر تھام نہ لیا ہوتا تو جاوید بھائی آپ اس وقت ندی میں ہوتے۔ ساری پکنک دھری رہ جاتی ہم لوگوں کی"

جاوید کے لبوں پر پھیکی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"لیکن بھائی جان بات کیا تھی......؟" قدرے توقف کے بعد رحیم پوچھ بیٹھا اور جاوید کا چہرہ فق ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ گم سم اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ پھر جیب سے پائپ نکال کر پائپ میں تمباکو بھرتے ہوئے آہستہ آہستہ کہنے لگا——

"بات بہت پرانی ہے۔ شاید پچیس سال گزر گئے۔ اس وقت میں تمہاری ہی عمر کا تھا۔ فوٹوگرافی کا نیا نیا خبط سر پر سوار ہوا تھا۔ ہر وقت کیمرہ بغل میں لٹکا رہتا تھا۔ تالاب میں تیرتی ہوئی مچھلیوں سے لے کر مینڈکوں اور کتوں تک کی تصویریں کھینچتا پھرتا تھا۔ دیہات میں میری ایک رشتے کی خالہ رہتی تھیں۔ یہ شوق شروع ہوا تو میں مہینے میں ایک آدھ بار ان کے ہاں ضرور جانے لگا، کیوں کہ اس گاؤں میں حسین قدرتی مناظر کی فراوانی تھی۔"

جاوید نے رک کر پر خیال انداز میں پائپ کا ایک طویل کش لیا اور کچھ دیر سوچنے کے بعد اپنی داستان پھر شروع کی......

"حال پور چھوٹا سا گاؤں تھا۔ یہی کوئی تیس چالیس گھروں کی بستی تھی۔ میں نے وہیں تین چار دنوں میں ہی وہاں کے قابل دید مناظر فلموں میں محفوظ کر لیے۔ پھر آدمیوں کی باری آئی۔ پردہ نشین عورتوں کی تو خیر بات ہی جدا ہے ورنہ حال پور میں مشکل ہی سے کوئی فرد بشر بچا رہ گیا ہوگا جس کی تصویر نہ کھینچی ہو میں نے۔۔۔۔

ایک دن اپنی انہیں خالہ کے گھر میں پالتو کتے کو بٹھا کر تصویر لینے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ کمبخت کیمرے کی طرف دیکھتا ہی نہ تھا۔ بار بار اس کا سر گھما کر ایک خاص پوز لینے کی کوشش کرتا لیکن عین موقع پر وہ دم گھما کر کیمرے کی طرف کر دیتا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے میرا پسندیدہ پوز دیا اور میں بٹن دبانا ہی چاہتا تھا کہ نگہت نے آ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔۔۔۔"

"یہ نگہت کون تھی بھائی صاحب!" شاہد نے اس امید پر دریافت کیا کہ شاید کہانی یہاں سے رومانٹک موڑ لے گی۔

"میری انہیں رشتے کی خالہ کی لڑکی۔۔۔۔" جاوید نے سرسری انداز میں جواب دیا اور کہتا چلا گیا "تو اس نے عین موقع پر میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے جھنجلا کر کہا۔ کیا بات ہے نگہت؟ کیوں پریشان کرتی ہو۔ میں خالہ جان سے کہہ دوں گا۔

ارے لو آپ تو بگڑنے لگے۔ وہ بولی میں نے سوچا آپ کی ریل کی آخری فلم ہے کیوں کتے پر ضائع ہو۔ گجی کا پوز نہ لے لیجیے۔

کون گجی۔۔۔۔ میں نے دریافت کیا۔

ارے اپنے شکور کا لڑکا۔ نگہت نے جواب دیا۔۔۔۔ وہی جو اپنے یہاں کام کرتا ہے۔

کہاں ہے لے آؤ دیکھوں۔ میں نے اس سے کہا۔ وہ کمرے میں جا کر ایک پانچ سالہ بچے کو لے آئی۔ بچہ واقعی بہت حسین تھا۔ بھولا بھالا۔ بھولے بھولے سرخ گال چھوٹا سا منہ پتلے پتلے لال لال ہونٹ، گھنگھریالے سنہرے بال جو اس وقت الجھے ہوئے تھے۔ کشادہ پیشانی، کپڑے گرد میں اٹے ہوئے تھے۔ میں نے اسے ناقدانہ نظروں سے دیکھا اور ایک کرسی پر مناسب انداز میں بٹھا کر تصویر لینا ہی چاہتا تھا کہ میرا ہاتھ پھر پکڑ لیا گیا۔

جھنجلا کر میں نے کیمرہ قریب پڑے ہوئے پلنگ پر ڈال دیا۔ اس بار میرا ہاتھ شکور یعنی اس بچے کے باپ نے پکڑا تھا۔ وہ مجھے ناراض دیکھ کر کچھ سہم سا گیا۔

بابو جی ناخوش ہو گئے کیا؟

ناراض ہونے کی بات ہی ہے۔ میں نے غرا کر جواب دیا۔ ہر بار عین موقع پر کوئی نہ کوئی ہاتھ پکڑ لیتا ہے آ کر۔۔۔۔ یہ کوئی تک ہے؟

جی بات یہ کہ۔۔۔۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا میرے گجی کی یہ پہلی تصویر کھنچی جا رہی ہے کیا معلوم پھر اس کی نوبت آئے یا نہیں۔ میں نے سوچا ذرا سلیقے سے کھنچ جائے۔ اس کے کپڑے میلے ہو رہے ہیں۔ بال بھی الجھے ہوئے ہیں۔ اگر آپ پانچ منٹ ٹھہر جائیں تو میں منہ ہاتھ دھلا کر اور کپڑے بدلوا کر لیے آتا ہوں۔

میں اس کے بھولے پن پر دل ہی دل میں مسکرا کر بولا ——

اچھا لے جاؤ بھائی۔ لیکن ذرا جلدی کرنا۔

وہ بچے کو گود میں لے کر چلا گیا۔ نگہت سے معلوم ہوا کہ اس کی شادی کو سات سال ہو گئے لیکن گجی کے بعد اور کوئی اولاد نہیں ہوئی دونوں میاں بیوی بچے پر جان چھڑکتے ہیں۔"

جاوید نے رک کر پائپ کا ایک کش لیا لیکن وہ بجھ چکا تھا۔ راکھ جھاڑتے ہوئے اس نے پھر کہا۔

"ہاں تو میں پانچ کے بجائے پندرہ منٹ انتظار کرتا رہا لیکن شکور گجی کو لے کر نہ آیا۔ میں نے تنگ آ کر اپنی توجہ پھر کتے کی طرف مبذول کی اور وہ حرام زادہ اس بار پہلی ہی کوشش میں دونوں ٹانگیں کرسی کے ہتھے پر رکھ کر کیمرے کی طرف نیم باز آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ میں نے پوز لے لیا اور ٹھیک اسی وقت شکور گجی کو گود میں لیے ہوئے اندر آ گیا۔

تم نے بہت دیر کر دی شکور! میں نے سرد مہری سے کہا۔

جی وہ۔۔۔۔ شکور نے اداس ہو کر کہا اس کی ماں بش شرٹ میں بٹن ٹانکنے لگی تھی۔

مجھے افسوس ہے۔۔۔۔ میں نے جواب دیا، یہ میری آخری فلم تھی جو ختم ہو گئی —

وہ منہ لٹکا کر پلنگ کا پایہ کریدنے لگا مجھے رحم آ گیا —

خیر کوئی بات نہیں — میں نے اسے تسلی دی۔ اگلے ہفتے پھر آؤں گا اور اس بار تمہارے گجی کی بہت سی تصویریں لوں گا۔

شکریہ بابو جی! بڑی مہربانی ہوگی آپ کی۔ شکور کا چہرہ پھول کی طرح کھل گیا۔

لیکن حالات کچھ ایسے پیش آئے کہ میں مکمل تین ماہ تک حال پور نہ جا سکا میرے سالانہ امتحانات شروع ہو گئے تھے۔ ان سے فراغت پا کر حال پور پہنچا تو میرے پاس کوڈاک فلم کی تین ریلیں تھیں لیکن اسے شکور کی بدقسمتی کہیے یا میری حماقت کہ گجی کی تصویر کھینچنے کی نوبت پھر بھی نہ آئی اور تینوں ریلیں ختم ہو گئیں۔ دراصل ان دنوں گھر میں نگہت کی شادی کا ہنگامہ برپا تھا۔ نئی نئی دلچسپ شکلیں دیکھ کر طبیعت ہی نہ مانی اور میں نے اپنی سیدھی تمام ریلیں ختم کر دیں۔

اسی دن شام کو شکور نے مجھے آ گھیرا۔

بابو جی! آپ نے پچھلی بار وعدہ کیا تھا۔ نجمی کو لاؤں گا؟ تصویر کھینچیں گے؟ مجھے بڑی شرم محسوس ہوئی۔ بولا۔

بھئی اس بار نگہت کی شادی کے جھمیلے میں ہی سب فلمیں ختم ہو گئیں۔ اب اگلی بار ضرور کھینچوں گا۔

جی آپ ہی نے کہا تھا کہ — اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں نم ہو گئیں میں نے سوچا دیکھو پاگل کو۔ بھولے پن کی انتہا ہے۔ بچے کی تصویر کے لیے اتنا اداس ہو رہا ہے۔

اس بار اطمینان رکھو شکورا! بہت جلد آؤں گا اور نجمی کی بہت ہی اچھی اچھی تصویریں کھینچوں گا۔

ضرور — اس نے مزید اطمینان کے لیے پوچھا۔

ضرور — ضرور۔ مجھ پر یقین کرو

اور اس بار میں واقعی ایک ہفتہ بعد ہی خالو پور جا پہنچا لیکن ساتھ میں فلم کی صرف ایک ہی ریل تھی کیوں کہ ان دنوں میں پیسوں سے تنگ تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ جب میں خالہ کے گھر پہنچا۔ اتفاق سے شکورا اس وقت نجمی کے ہمراہ گھر میں موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر اسکا چہرہ پھول کی طرح کھل گیا۔ میرے مکان میں داخل ہوتے ہی سلام مسنون کے بجائے اس نے پوچھتے ہی کہا —

بس بابو جی! آپ اسی وقت نجمی کی تصویر لے لیجیے ورنہ صبح پھر فلم ختم ہو جائے گی — میں نے مسکرا کر کہا —

یہ بھی کوئی وقت ہے تصویر کھینچنے کا، سورج غروب ہو چکا ہے صبح نجمی کی تصویر لوں گا، اسی لیے آیا ہوں تم اطمینان رکھو۔

میں تھوڑی دیر تک خالہ سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا پھر شکورا نے مجھے اشارے سے باہر چلنے کو کہا۔ ایک بار تو جی میں آئی کہ گھڑک دوں۔ نچلے طبقے کے لوگوں کو زیادہ منہ لگانے سے وقار کو دھکا پہنچتا ہے پھر اس کے چہرے سے ٹپکنے والی معصومیت دیکھ کر دل پسیج گیا۔ اٹھ کر اس کے ساتھ باہر چلا گیا۔

کہنے لگا

بابو جی ایک بات کہوں —

ہاں ہاں۔ کہو —

آپ خالہ جان سے تو نہیں کہیں گے؟

ایسی کیا خاص بات ہے بھئی —؟

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں —

دراصل میں یہ چاہتا ہوں کہ صبح نجمی کے ساتھ میں اور اس کی ماں بھی تصویر میں شریک ہو جائیں۔

خیال تو ٹھیک ہے۔ میں نے قہقہہ لگا کر کہا۔

جی — وہ ہکلا کر مسکرانے لگا۔

ہاں ہاں۔ کوئی ہرج نہیں۔ کھینچ دوں گا۔

اس رات میں نے کیمرہ کھول کر اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ اس میں کوئی خامی نہیں ہے پھر فلم لوڈ کی اور سرہانے کھونٹی پر لٹکا کر سو گیا۔

صبح بیدار ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کیمرہ غائب ہے!

خالہ جان! میرا کیمرہ کہاں گیا —

اوہ رے لڑکے! تجھے کیمرہ کے علاوہ اور بھی کچھ کام ہے۔ رات کو خواب بھی کیمرے کے ہی دیکھتا ہوگا!

نہیں واقعی — میں نے انہیں معاملے کی سنجیدگی کا احساس دلایا۔

میں نے رات کو فلم چڑھا کر کیمرہ کھونٹی پر لٹکا دیا تھا اب وہاں نہیں ہے۔

تو اتنا گھبرائے کیوں جاتے ہو؟ انہوں نے ہنس کر کہا۔ وہ ذرا اپنا خالو اٹھا لے گیا ہے۔ دالان میں کھیل رہا ہے۔

میری جان ہی تو نکل گئی۔ خالو نگہت کا چھوٹا بھائی تھا۔ بلا کا شیطان لپکا ہوا دالان میں گیا تو دیکھتا ہوں کہ حضرت آئینہ سامنے رکھے کیمرہ ہاتھ میں لیے اپنی تصویر کھینچ رہے ہیں۔ جھپٹ کر کیمرہ ہاتھ سے چھینا لیکن افسوس وقت گزر چکا تھا، تمام فلمیں ختم تھیں۔

"جی چاہا خالو کو پکڑ کر زمین پر پٹک دوں اور ناک پر اتنے گھونسے ماروں کہ کمبخت کا دم نکل جائے لیکن افسوس کہ وہ میرا سگا بھائی نہ تھا۔ پھر بھی چند چپت تو ضرور رسید کرتا لیکن یہ حسرت بھی دل ہی میں رہ گئی کیوں کہ اسی وقت شکورا بلانے کے لیے آ گیا اب اسے کیا جواب دیتا۔ بار بار انکار کرتے ہوئے شرم آتی تھی۔ اس بار یقیناً وہ یہی سمجھتا کہ میں تصویر لینا ہی نہیں چاہتا، اسے یونہی ٹرخا رہا ہوں۔ سوچا چلو اس مرتبہ اسے یونہی بہلا دو۔ کیمرے کے سامنے ان لوگوں کو کھڑا کر کے تصویر کھینچنے کا بہانہ کروں گا بعد میں آ کر کہہ دوں گا کہ وہ تصویر خراب ہو گئی اور دوسری تصویر کھینچ لوں گا۔ دل میں یہ منصوبہ گھڑ کر میں نے اس سے کہا۔

ذرا ٹھہرو۔ میں ناشتہ کر لوں پھر چلتا ہوں۔

جی وہ — وہ ہکلانے لگا اور پھر یہ اطمینان کر کے کہ خالہ جان ہماری گفتگو نہیں سن رہی ہیں بولا — دراصل ناشتے کا انتظام تو نجمی کی ماں نے کر لیا ہے۔

اچھا — میں نے ہنس کر کہا — تو چلو؟

میں اپنا کیمرہ، جس کی فلم ختم ہو چکی تھی، بغل میں لٹکا کر اس کے ہمراہ ہو لیا۔ اس نے اپنے شکستہ مکان کی ڈیوڑھی پر مجھے رکتا ہوا دیکھ کر ایک معصوم مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

آ جائیے بابو جی! اب آپ سے کیسے پردہ کرے گی؟ آپ تصویر جو کھینچیں گے اس کی — میں اندر چلا گیا۔ مکان چھوٹا سا تھا لیکن بہت صاف

گھر کی ہر چیز اپنی جگہ پر سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ آنگن میں ایک ٹوٹی پھوٹی کرسی پر تجی دولہا بنا سرخ ساٹن کا بش شرٹ پہنے آنکھوں میں گہرا کاجل لگائے ہوئے بیٹھا تھا۔

میں نے ناشتے میں جلدی جلدی دو چار لقمے لئے سیدھے حلق سے اتارے اور چائے پینے لگا۔ ان بھولے بھالے لوگوں کو اس طرح فریب دیتے ہوئے میرا ضمیر بھی ملامت کر رہا تھا لیکن ہو کیا سکتا تھا، مجبوری تھی وہ چائے پی چکا تو شکور نے کہا۔

پھر بابو جی! اب تصویر کھینچنے کی تیاری کریں

تیاری کیا کرنی ہے۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ کوئی دو چار گھنٹے کا کام تھوڑی ہے۔

اس کی بیوی باورچی خانے میں گھسی بیٹھی تھی وہ جا کر اسے پکڑ لایا۔ وہ بیس سالہ خوش شکل معصوم حسینہ تھی۔ کسی سہمائی بلی جیسی آ گئی اور کرسی پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ دوسری طرف ہاتھا پکڑ کر شکور کھڑا ہوا۔ میں نے کہا۔

شکورن سے کہو کیمرے کی طرف دیکھیں—

عورت نے نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ بڑی بڑی بوجھل اور شرمائی ہوئی آنکھیں۔ مجھے وہ اپنے دل پر چھلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ شکور گردن اکڑائے چلا جاتا تھا لیکن مجھے سچ مچ تصویر تو لینی نہ تھی۔ محض رسماً ان لوگوں کو ٹھیک طرح کھڑے ہونے کی ہدایات دیں ریڈی کیا اور بٹن دبا دیا۔

تینوں کے چہرے پھول کی طرح کھلے ہوئے تھے۔ باہر آ کر شکور نے کہا۔

بابو جی تصویر کب دھل جائے گی—

میں اگلے ہفتے تیار کروا کر ساتھ لیتا آؤں گا۔

اس نے دو روپیہ کا نوٹ میرے ہاتھ میں دے کر کہا۔

فریم بھی کرواتے لانا بابو جی۔

اچھی بات ہے۔ میں نے جواب دیا۔ لیکن یہ پیسے تم اپنے پاس رکھو واپس آ کر لے لوں گا۔

لیکن روپے اس نے نہیں لیے۔

اس بار مجھے سات دن شہر میں گزارنے محال ہو گئے۔ بے چینی سے اتوار کا منتظر تھا۔ بار بار نگاہوں کے سامنے چھوٹے سے کنبے کے تین فرد کے بشاش و شگفتہ چہرے گھوم جاتے۔ سوچتا تھا اس بار قرض لے کر ہی سہی۔ چار پانچ فلمیں لے کر جاؤں گا اور ان تینوں کی بہت سی تصویریں کھینچوں گا۔

اتوار کو حسبِ معمول پہنچا۔ دن بھر شکور گھر میں نظر نہ آیا تو میں نے خالہ سے دریافت کیا۔

کیا بات ہے خالہ جان! آج شکور کام پر نہیں آیا؟

بیچارہ شکور! خالہ جان نے سرد آہ بھری۔ میرے کان کھڑے ہو گئے

کیوں کیا ہوا اسے

اسے تو کچھ نہیں ہوا۔ خالہ جان نے دوسری سرد آہ بھر کر کہا۔ لیکن اس کی بیوی بیچاری پرسوں مر گئی۔

ارے! جیسے کسی نے میرے دل میں خنجر بھونک دیا۔

ہاں بیچاری کسی کام سے کوٹھری میں گئی تھی وہیں سانپ نے ڈس لیا۔

شکور بیچارہ بہت دوڑا دھوپا لیکن دو گھنٹے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

اسی وقت کسی نے شکور کو میری آمد کی اطلاع دے دی اور وہ روتا ہوا میرے پیروں سے لپٹ گیا

ہاں بابو جی! وہ مر گئی۔ منی کی ماں مر گئی۔ اپنی تصویر اپنے منی کی تصویر دیکھنے کا ارمان دل میں لیے ہوئے چل بسی۔ روز رات کو مجھ سے دیر تک تصویر کی باتیں کرتی تھی۔ اب وہی تصویر اس کی اکلوتی یادگار میرے پاس رہ جائے گی۔ آپ لے تو آئے ہیں نا اسے—؟

میرے دل پر چھریاں چل رہی تھیں۔ آواز پر قابو پا کر میں نے کہا۔

ابھی دھلی نہیں تھی۔ میں اگلے ہفتے اسے ضرور لیتا آؤں گا۔ شکور نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا—

ہاں بابو جی! ضرور لیتے آئیے گا۔ اب وہی آخری نشانی ہے اس کی، دیکھ کر دل کو تسکین ہو گی۔ خیال رکھنا، ہو سکے تو بڑی کروا لیجیے گا۔

اچھی بات ہے— میں نے رندھے ہوئے گلے سے جواب دیا۔

دوسرے دن صبح ہی میں حال پور کو آخری سلام کر کے رخصت ہو گیا اب دوبارہ شکور کو منہ دکھانے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔

تین سال تک میں حال پور نہ گیا۔ اس دوران میں رہ رہ کر مجھے شکور والا واقعہ یاد آتا رہا۔ میں دل ہی دل میں قدرت کی ستم ظریفی پر کڑھتا رہا اور جب وقت کی رفتار سے یہ زخم مندمل ہو چلا تھا کہ اچانک اس پر ایک ایسا بھرپور وار پڑا جس نے اس زخم کو زندگی بھر کے لیے ہرا کر دیا اور تب ہی سے میں نے کیمرہ نہ چھونے کی قسم کھا رکھی تھی—"

ایک طویل آہ بھر کر جاوید خاموش ہو گیا اور زمین کریدنے لگا اس کی پلکوں پر ستارے جھلملا رہے تھے۔

"کیوں—؟ پھر کیا ہوا بھو جان—" سلمیٰ نے رندھی ہوئی آواز میں پوچھا

"ہوا یہ کہ ایک رات میں اپنے کمرے میں سو رہا تھا کہ ملازم نے آ کر مجھے بیدار کر دیا۔"

"کیا بات ہے؟" میں نے آنکھیں ملتے ہوئے دریافت کیا۔

باقی صفحہ ۴۴ پر ملاحظہ فرمائیں

”محبت کے حق میں دعا کیجیے“

فُضیل مظفر (دہلی بھارت)

پروفیسر احتشام حسین

مظفر حنفی موجودہ اردو ادب کی دنیا میں اپنی چیختی لہجہ والی شاعری اور افسانہ نگاری کے ساتھ داخل ہوئے ہیں اور غالباً ”عکس ریز“ کے روپ میں اپنی پہلی شعری تصنیف پیش کر رہے ہیں۔ اس وقت جب شعر و فن میں انسانی قدروں کی اہمیت شدید فردیت اور لاانائیت کی وجہ سے بالکل اضافی ہو گئی ہے ان کی یہ طویل نظم زندگی کے کھوکھلے پن کی طرف ایک خاص انداز میں متوجہ کرتی ہے۔ شاعری اپنے وجود میں آنے سے آج تک محض تفریح ہی کا نہیں، عبرت انگیزی کا ذریعہ بھی سمجھی جاتی رہی ہے اور ہر شاعر نے اس کے لیے کوئی نہ کوئی اسلوب اختیار کیا ہے تا کہ وہ اپنے خیالات کی پرش کو دوسرے ذہنوں کی کسوٹی پر آزما سکے۔ مظفر حنفی نے اس کے لیے طنز کا انتخاب کیا ہے جو اس نظم کا بنیادی عنصر ہے۔ یوں تو ”عکس ریز“ ایک ہی جذبہ اور تاثر کے تحت تخلیق کی ہوئی ایک طویل نظم ہے لیکن درحقیقت یہ چھوٹے چھوٹے مرقعوں کا ایک البم ہے جس میں بہت سی تصویریں یکجا کر دی گئی ہیں۔ مظفر حنفی نے یہاں نہ تو ناصح مشفق بننے کی کوشش کی ہے اور نہ اپنے کو ایک معلم اخلاق ہی کی حیثیت سے پیش کیا ہے بلکہ ایک شاعر کی طرح پڑھنے والوں کی رگِ احساس کو چھیڑا ہے تا کہ وہ بھی سماج کی ان گندگیوں کو دیکھ لیں جنہیں انہوں نے دیکھا ہے اور جو اوپر سے صاف ستھرا دھلا دھلایا اور منظم نظر آ رہا ہے۔ شاعر اور ادیب کی حیثیت سے وہ یہیں تک جا بھی سکتے ہیں وہ احساس کا بیدار کرنا ہی اگلے قدم کی دعوت دینا ہے اور خاص کر اس کو جو ان آلودگیوں سے نکلنا بھی چاہتا ہو۔ جب آپ مرقعوں کے اس دلچسپ مجموعے کو شروع سے آخر تک دیکھ لیں گے تو شاید میری ہی طرح حیرت بھی کریں گے کہ مظفر حنفی نے گرد و پیش کو کتنی گہری نظر سے دیکھا ہے اور اتنے خاکے جن میں اوچھا پن، تصنع اور عدم توازن ہے کس طرح اکٹھا کر لیے ہیں۔ غور سے دیکھیے تو ان میں اشخاص اور افراد پر نہیں، اطوار اور اعمال پر، خام کاریوں اور نقائص پر طنز ہے۔ ان اداروں کا خاکہ اڑایا گیا ہے جو صدیوں سے اپنے مفید اور کارآمد ہونے کا کھوکھلا ڈھول پیٹ رہے ہیں اور اب جدید انسان نے ان کے کھوکھلے پن کا راز فاش کرنے کا عہد کر لیا ہے۔ مظفر حنفی نے اس کے لیے جو بول چال کی زبان اور محاورات جیسی انداز اختیار کیا ہے اس سے تاثر کا رنگ اور زیادہ گہرا کر دیا ہے۔

کرشن چندر

مظفر حنفی کو بات کہنے کا ڈھب آتا ہے اور افسانے کی تخلیق کے سارے لوازم معلوم ہیں۔ کون سی بات قاری سے کس وقت کہنا ہو گی، کون سی چھپا کر رکھنا ہو گی اور صرف آخری سطر میں مٹھی کھول دینا ہو گی۔ حالانکہ آج کل کا قاری بہت ہوشیار ہو چلا ہے۔ اکثر اوقات افسانہ ختم ہونے سے پہلے ہی اس کا انجام معلوم کر لیتا ہے مگر مظفر حنفی، مصنف اور قاری کی اس شطرنج بازی میں اکثر و بیشتر اپنے قاری کو مات دے جاتے ہیں۔ بالخصوص ”افلاس کا محبوب“ کا انجام مصنف کی فن شناسی اور تخلیق کاری کا عمدہ نمونہ ہے۔ ان افسانوں میں ظلم کوئی حادثہ نہیں ہے روزمرہ کی حقیقت ہے۔ مصنف اس ظلم پر خود چونکتا ہے نہ پڑھنے والے کو چونکاتا ہے۔ ظلم، افلاس، بیکاری، ناامیدی، قلاشی، دھوکا، فریب، جعلسازی جیسے موجودہ زندگی کے شب و روز ہوں۔ ان کا وجود اتنا ہی ناگزیر ہے جتنا ماہ و سال کا چکر۔ مصنف کہیں پر احتجاج کرتا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔ یہی اس کی فنکاری کی دلیل ہے کہ احتجاج نہ کرتے ہوئے بھی پورا افسانہ بولتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اسی احتجاج کی داستان جس کا سارے افسانے میں ذکر نہیں۔ بات کہنے کا یہ بھی ایک انداز ہے اور بہت مشکل ہے یعنی یوں کہ بات ہی لے جائیں اور آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہ ٹپکے لیکن افسانے کے آخر میں قاری دل مسوس کر رہ جائے۔ ایک اداس کیفیت محسوس کرنے کے بعد تشنگی کا احساس بھی ہوتا ہے کچھ اور کہا ہوتا۔ زیادہ مکمل کر دیا ہوتا مگر اسی تشنگی پر ہے افسانے کا مدار۔ یہ کمی نہ ہو تو دوسرے مجموعے کا انتظار بھی ہو گا۔ لگتا ہے کہ مصنف نے اس زندگی کو خود جھیلا ہے۔ اس زندگی کے بیچ میں بیٹھ کر یہ افسانے لکھے ہیں۔ کسی اوپر کے ٹیلے پر بیٹھ کر نیچے بہنے والی زندگی کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ صرف اس کا خار خوں چکاں نہیں ہوا ہے اس کی انگلیوں کی پوروں سے لہو بہا ہے۔ خود اس کا دل چھلا ہے۔ ممکن ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہو مگر زندگی پر حنفی کی بے تکان گرفت کچھ یہی کہتی ہے۔ مظفر حنفی نے اندھیرے کنویں میں ڈول نہیں ڈالے ہیں۔ لاشعوری بھول بھلیوں میں گم نہیں ہوا ہے۔ حد سے بڑھی ہوئی دروں بینی کا شکار نہیں ہوا ہے۔ تجریدی ٹامک ٹوئیوں میں الجھ کر نہیں رہ گیا ہے۔ وہ زبان و بیان کے الجھاوے سے زندگی سے آنکھیں چرانے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ آنکھیں چار کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ایک عجب لاپرواہی کے ساتھ۔ بظاہر ایک سنگدل قریب قریب خوش ہو بیان کے ساتھ جیسی ہوتی ہے زندگی میں۔

فراق گورکھپوری

مظفر حنفی کے افسانے اردو کے کئی اچھے رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان افسانوں کو بہ ہر حال شائقین ادب کی مقبولیت حاصل ہو چکی ہے۔ مطالعہ زندگی میں جس اور جتنی مدد افسانوی ادب سے ملتی ہے اتنی مدد اور اس قسم کی مدد دوسری اصناف سخن سے نہیں ملتی۔ اگر کافی تعداد میں اچھے افسانے ہمارے ہزاروں ہم وطن پڑھیں اور پڑھتے رہیں تو ہمارے معاشرے اور ہماری زندگی کے مصائب اور ان کی پیچیدگی کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔ ایسا مطالعہ حقیقی تعلیم ہے اور یہ قومی ذہنیت کی تخلیق اور تعمیر میں غیرمعمولی طور پر کارآمد ثابت ہو گا۔ مظفر حنفی صاحب ہمارے نئے افسانہ نگاروں میں ایک ہونہار ادیب ہیں۔ یہ ان کا پہلا مجموعہ ہے

ان کے افسانوں میں زندگی کے کئی پہلوؤں کی عکاسی ہے۔ بیان نہایت سلجھا ہوا ہے۔ ان میں نیا پن ہے۔ ان کا انداز دلکش ہے۔ مکالمے فطری ہیں اور پلاٹ میں جدت ہے۔ پڑھنے والوں کو یہ افسانے کہیں سے گراں نہیں گزریں گے۔ ان افسانوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اگر نوجوان مصنف نے اپنی کوششیں جاری رکھیں تو وہ ترقی کی نئی منزلیں کامیابی سے طے کرتے جائیں گے۔

محمد محی الدین

"پانی کی زبان" ہاتھ آتے ہی میں نے کلام کا بڑا حصہ پڑھ ڈالا۔ کتاب کے ہر صفحے سے تازگی اور نئے پن کی مہک لی۔ میں اس سے پہلے مظفر حنفی کا کلام رسالوں میں بھی شوق سے پڑھتا رہا ہوں۔ وہ ان معدودے چند لکھنے والوں میں سے ہیں جو مجھے بہت پسند آتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن

نئے شاعروں میں مظفر حنفی نے ندرت اظہار اور ادبی سنجیدگی میں ایک پروقار توازن برقرار رکھا ہے۔ ان کا نیا پن محض ہیئت پرستی نہیں بلکہ شگفتہ اور منفرد طرز بیان کی کوشش ہے۔ نئی تکنیک محض دھرے اور بکھرے ہوئے تاثر پاروں کو ایک رشتے میں پرو کر وحدت میں تاثر پیدا کرنے کا ہنر نہیں آتا ہے اور یہ ہنر سماجی معنویت اور کیفیت کے ساتھ ابھرتا ہے۔

کنہیا لال کپور

مظفر حنفی کا کلام دیکھا تھا، اس کے افسانے پڑھ کر میری نظروں میں اس کی توقیر دو چند ہو گئی۔ میں نے سوچا اس ادبی اجارہ کی نیام میں دو تلواریں ہیں اور دونوں کی آبداری ثابت ہوتا ہے۔ مسودہ ختم کرنے کے بعد مجھے بے اختیار اسی کی غزل کے دو شعر یاد آ گئے:

اس کے دل و دماغ کی دنیا ہی اور ہے
ظالم کے سوچنے کا طریقہ ہی اور ہے
مرتے ہیں لوگ زلف و لب و رخ کے نام پر
حالات کا اگرچہ تقاضا ہی اور ہے

میری دانست میں اس کے افسانوں پر جو صحیح ترین تبصرہ کیا جا سکتا ہے وہ ان اشعار میں مرکوز یا مرقوم ہے۔ واقعی اس کے سوچنے کا طریقہ نرالا اور جداگانہ ہے کیونکہ وہ زندگی کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کا عادی ہے۔ چاہے وہ ظریف ہے یا شاعر، اس کے سر پر یہ دھن سوار ہے کہ زندگی کی تمام عریانیوں کو بے نقاب کرے۔ اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لیے وہ اکثر افسانے کے اختتام کو ایک ایسا گھمایا موڑ دیتا ہے جسے غیر متوقع سے مشابہت دی جا سکتی ہے۔

ماہر القادری

جناب مظفر حنفی شعر و سخن کی بزم میں کچھ اتنا زمانہ اور دن بسا طا ہوئے دل ہیں مگر ان کی شاعری کا تعارف شہرت کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ مظفر صاحب کا کلام ---- پانی کی زبان ---- ہمارے سامنے ہے جس کا پروفیسر احتشام حسین سے انتساب کیا گیا ہے۔ "پیش لفظ" شاعر کا اپنا ایک شعر ہے:

عظمت سے ہٹ کے ندرت و جدت کو ناپئے
ہم اور چیز، غالب و میر و فراق اور

ناپئے اس شعر میں غلط استعمال ہوا ہے۔ شعر و سخن کی ندرت و جدت اور محاسن کو ناپا نہیں جاتا، دیکھا، جانچا، پرکھا اور سمجھا جاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوا ہے کہ شاعر اظہار خیال میں زبان و روزمرہ کی پروا نہیں کرتا۔ مظفر حنفی کی غزلوں میں اچھا چونکا دینے والے اشعار ملتے ہیں۔ بعض شعر ایسے بھی ہیں جو خیال و اظہار کے اعتبار سے اچھوتے ہیں ان میں خاصی کشش اور تاثر پائی جاتی ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی

گزشتہ چند برسوں میں اردو کے جن شعراء کی غزل میں ایک نیا ذائقہ محسوس ہوتا ہے ان میں مظفر حنفی کا نام خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ ان کی غزل کی نمایاں خصوصیت اس کا غیر رومانی لہجہ ہے۔ انہوں نے نئے دور کی حقیقت پیش کرنے کے لیے کھردرے اور درشت لہجے کو اپنایا ہے اور انفعالی جذبات نگاری کے بجائے ایک طنز آمیز جارحیت سے کام لینے کی کوشش کی ہے جو اس دور کے مزاج سے ہم آہنگ ہے جہاں زندگی کی تمام قدریں اور سماجی و معاشرتی ادارے انحطاط و پیچیدگی کا شکار ہیں۔ مظفر کے شاعرانہ مزاج کو شاد کے شاعرانہ مزاج سے ایک فطری مناسبت ہے اور اس نوع کی ہم آہنگی اور مماثلت مجھے اردو شاعری میں بہت کم دکھائی دیتی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

"تیکھی غزلیں" مظفر حنفی کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ایسا مجموعہ جس کے لب و لہجہ کو فی الواقع صرف تیکھے اور ترچھے لب و لہجہ کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ان کی غزلوں کو صرف اس لحاظ سے روایتی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بحر و وزن اور ردیف و قافیہ کی پابند ہیں ورنہ اپنی معنویت، اسلوب اور مزاج کے لحاظ سے یہ اردو غزل کی مروجہ ڈگر سے بہت الگ ہیں۔ ان میں غزل کا وہ لسانی اور معنوی لہجہ کہیں نظر نہیں آتا جو اردو غزل کو "سخن با زنان گفتن" اور "تصوف برائے گفتن خوب است" کے طفیل ملا تھا اور جسے لگے وقتوں کا مزاج رکھنے والے شعراء آج بھی سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ ان غزلوں میں تخیل اور رومان کی وہ رنگینیاں نہیں ہیں جو فسانے کو حقیقت اور حقیقت کو فسانہ بنا دیتی ہیں اور جنہیں آج بھی بعض حضرات غزل کا طرۂ امتیاز خیال کرتے ہیں۔ اس فرسودہ روش کے برعکس زیر نظر مجموعہ کی غزلوں کا لہجہ آج کی زندگی کی طرح پرشور، تند و تلخ، درشت اور حقیقت پسندانہ ہے۔ یہ غزلیں پرانے خیال اور رسمی مضامین سے بہت دور ہیں۔ یہ دراصل شاعر کے حقیقی اور سچے تجربات و مشاہدات کا آئینہ ہیں۔ ایسا آئینہ جس میں ہمارے اس عہد کی زندگی اپنی جملہ رعنائیوں اور ریاکاریوں کے ساتھ صاف نظر آتی

ہے۔ زندگی کی یہی روش جو خود کو بے نقاب کر کے ان غزلوں کے ذریعے ہمیں اپنی جھلک دکھاتی ہے اس مجموعے کو ایسے مردانہ لب و لہجے سے ہمکنار کرتی ہے جس کا واضح نشان اس سے پہلے صرف شاد عارفی کے یہاں ملتا ہے۔ غزل کی شاعری سے شعوری طور پر طنز کے نشتروں کا کام لینے کا آغاز اردو میں مظفر کے استاد شاد عارفی نے کیا تھا۔ مظفر حنفی نے ان نشتروں کو کچھ اور آبدار بنانے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں وہ ہر طرح کامیاب ہوئے ہیں۔

پروفیسر ظ۔ انصاری

"طلسم حرف" کے شاعر نے شاد عارفی مرحوم کے رنگ سے شروعات کی تھی۔ بے رحم چٹکیاں، کمروچی، بیباکی، بے تعلقی، بے لطفی کی حد تک والے طنز، گلی کے کنکر نیچے پر کنکروں میں کرکراہٹ چلنے کی آوازیں۔ شاد کی بازگشت سے نکل کر وہ یگانہ چنگیزی کے تیکھے لہجے، داغ از ترنم اور اکبر تغزل تک آیا۔ زندگی کے وسیع مشاہدے اور شدید تر تجربے نے اسے خاص اپنے زمانے کی کھردری حقیقتوں، روزمرہ کی ناہمواریوں اور بیان کی آڑی ترچھی لکیروں کا پتا دکھلایا۔ غزل تیار کرتے وقت لب و لہجوں کو کھرل اور رنگینیوں کو کبھی بھی نہیں کرتا۔ درد واپس رہنے دیتا ہے تا کہ آپ ایک گھونٹ میں حلق سے نہ اتار لیں۔ چکھیں، اٹکیں، چبائیں اور تب لطف لیں۔ غزل کے بعض مصرعوں کا "تو" حالانکہ "یوں گیا" "چناں چہ" وغیرہ الفاظ سے شروع ہونا، دانستہ شروع ہوا، اس دور سے پن کا ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو لفظوں سے وہ بے تکلفانہ برتاؤ کہ علاقائی، مقامی اور انگریزی وغیرہ کے کام آنے والے الفاظ اور علامات (کرفیو، اسپیڈ، لائٹر، بلب، کباڑی، استھیاں، جیپ، انجینئر، ڈائری، فوٹو وغیرہ) آلتی پالتی مار کر جا بجا بیٹھے ہیں۔ اور ایک تیسرا پہلو بھی ہے۔ وہ بھی اب سے پہلے جاں نثار اختر کے ہاں نظر آتا تھا۔ مرحوم نے کم و بیش چالیس برس کی مشق سخن اور ہر میدان میں بھٹکنے کے بعد یہ صفت اپنائی اور اپنے کلام میں رچائی بسائی تھی۔ پچھلے بیس پچیس سال کی غزل کا جائزہ لینے والے نہ جانے کیسے بھول جاتے ہیں کہ غزل میں (کم از کم ہی نہیں) اردو میں جاں نثار نے عام کیا اور اسے قبول عام "دلوایا"۔ جدید اور بامعنی غزل کے چند بہترین نمونے مرحوم کے "پچھلے پہر" میں موجود ہیں۔ قدرت کلام، کلاسیکی ورثے پر بھرپور گرفت، طبیعت کا رچاؤ، سہاؤ اور سبھاؤ۔ پھر ماضی کی صفوں سے ایک چھلانگ میں بے نیازانہ باہر نکل پڑنے کا دم خم جب یکجا ہو جائے تب کہیں جا کے ایسی مدوّل اور خوشگوار غزل ہوتی ہے جس کی اٹھان جاں نثار اختر سے ہوئی تھی اور شباب مظفر حنفی کے قلم میں نظر آتا ہے۔

پروفیسر وہاب اشرفی

"عکس ریز" مظفر حنفی کی طویل طنزیہ نظم ہے جس میں ۱۴۲ خاکے یا کردار ہیں۔ طنز نگاری مظفر حنفی کا عمومی مزاج ہے۔ ویسے جدید شاعروں میں ان کی آواز اپنے تیکھے انداز کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے۔ ان کے پہلے مجموعہ کلام "پانی کی زبان" کے مطالعہ کے بعد تو یہی رائے قائم کرنی پڑتی ہے اور موصوف بے حد بیباک اور خطرناک طنز نگار تھے۔ مظفر حنفی کی طنز نگاری محض تقلیدی نہیں ہے۔ شاد عارفی کے یہاں ایک قسم کا کھردرا پن ہے۔ نکتہ چینی کا تیور اور لڑائی جھگڑے کی کیفیت ہے۔ لیکن مظفر حنفی لب و لہجہ کی متانت انتہائی سنگین موقعوں پر بھی نہیں کھوتے۔ اس لیے ان کے طنز پر غصہ نہیں آتا بلکہ سوچنے سمجھنے کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ "عکس ریز" کے کردار ہماری دیکھی اور محسوس کی ہوئی دنیا کے لوگ ہیں۔ یہ اپنی اپنی جگہ پر بہت دلچسپ ہیں اور اپنی کمزوریوں کے باعث عجیب و غریب بھی ہیں۔ مظفر حنفی نے ان کی دکھتی رگوں پر انگلی رکھ دی ہے۔ پہلے اور آخری مصرعہ کو بطور ٹیپ کے لیجیے تو ہر ہر کردار کے لیے ساڑھے تین اشعار کہے گئے ہیں۔ اتنے اشعار کی پابندی کے بعد بھی ہر خاکہ مکمل ہے۔ پوری تصویر صاف ابھر آتی ہے۔ یعنی شاعر نے کردار تخلیق نہیں کیے ہیں بلکہ چاول پر قل ھو اللہ لکھا ہے۔

پروفیسر شکیل الرحمان

جدید اردو غزل میں مظفر حنفی اپنے منفرد رویے اور منفرد اسلوب اظہار سے پہچانے جاتے ہیں۔ نئی اردو غزل کے ایک ممتاز شاعر ہیں۔ ان کی تخلیقی شخصیت کا کرشمہ ہے کہ اشعار کی تاثیر اور دلکشی دیر تک قائم رہتی ہے۔ "یا اخی" ان کی غزلوں کا نیا مجموعہ ہے جو تجربے کی توانائی اور تازگی لیے ہوئے ہے۔ مظفر حنفی حیات اور گہرے مشاہدے کے ایک معتبر شاعر ہیں۔ حقائق کے شعور اور مشاہدات سے ان کے باطن میں ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ جمالیاتی انکشافات کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا ہے۔ تجربے کے حسن کو پیش کرنا آسان نہیں ہوتا، مظفر حنفی نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے جس کی وجہ سے اپنے ہم عصر غزل نگاروں کی صف میں ان کو امتیازی درجہ حاصل ہوا ہے۔ انہوں نے مشاہدوں اور تجربوں سے جو پایا اسے احساس اور جذبے سے ہم آہنگ کیا اور پھر اپنے منفرد رنگ اور انداز میں پیش کر دیا:

لہو کی بوند ہر اک لفظ کو عطا دل کی
نتیجہ سب مری طبع رواں کا حصہ ہے

"یا اخی" کا شاعر سنجیدہ اور مہذب ہے۔ اس نے شاعری کی روایات کو جانا پہچانا اور ان کے رس کو بھی پایا لیکن خود بینی کی لذت کو سب سے اہم جانا۔ تلخ سچائیوں نے جو بصیرت عطا کی وہ شعری تجربوں کی روشنی بن گئی۔ مظفر حنفی کی تیز کاٹنے والی اور چوٹ سے کھینچے میں بچھ جانے والی شاعری ان کے احساس جمال اور سوز و گداز، ان کی دردمندی اور آرزومندی کا عطیہ ہے۔

پروفیسر سلیم اختر

شاد عارفی نے طنز میں جو ممتاز حیثیت حاصل کی اور غزل کو جس

اسالیب و مفاہیم سے روشناس کرایا وہ بذات خود ایک علیحدہ داستان ہے۔ ان کے شاگردوں کی کمی نہیں۔ لیکن مظفر حنفی ایسے شاگرد کم ہی نکلے ہوں گے۔ مظفر حنفی صرف طنز کا شاعر نہیں بلکہ کیفیات عشق میں جدید طرز احساس کا ترجمان بھی ہے۔ اس کا عشق روایتی نہیں اور نہ ہی آج کی غزل اور اس کے قاری کا روایتی عشق سے گزارا ہوتا ہے۔ مظفر کی ان غزلوں میں روایت سے بچنے کی شعوری کوشش کا احساس ہوتا ہے اور جہاں اسے مظفر نے مہلت دی ہے وہیں اس نے واردات عشق میں بیان حسن سے جذبات کے تموج کی تصویر کشی کی ہے اور خوب کی ہے۔

پروفیسر محمد حسن فاروقی

میری رائے براہ راست صرف اس مجموعے سے ہے جس میں کثرت سے چھوٹی بڑی رائیں جمع کردی گئی ہیں۔ شاد صاحب کے خطوط بھی دے گئے ہیں اور اس طرح مظفر حنفی صاحب نے اپنے استاد کے لیے ایک مستقل یادگار بنادی ہے۔ ان کے مقاصد میں خلوص ہے اور یہ کتاب ان کو ضرور پورا کرے گی۔ حنفی صاحب کی یہ کتاب ایک مثال سامنے لاتی ہے جس پر اس دور میں چلنے کی بڑی ضرورت ہے۔ اگر جدید وقدیم معروف شعرا پر اس قسم کی کتابیں تالیف ہوتی رہیں تو عام قاری کو ہمارے ادب اور تہذیب سے آسانی کے ساتھ مانوس ہونے رہنے کا موقع ملتا رہے گا نیز طالبان ادب کے لیے بھی ضروری مواد کیا ملتا رہے گا اور اس طرح ہماری کلچر ایک زندہ چیز رہے گی۔

ڈاکٹر خلیق انجم

مظفر حنفی کو نظم اور نثر دونوں پر قدرت حاصل ہے۔ انہوں نے ایسی کہانیاں لکھی ہیں جن کی اہل ادب نے کھلے دل سے پذیرائی کی ہے اور ایسی تنقیدیں بھی لکھی ہیں جن سے اردو تنقید میں اضافہ ہوا ہے۔ گویا وہ افسانہ نگار بھی ہیں، نقاد بھی اور شاعر بھی۔ ان کی ایک اور اہم حیثیت بھی ہے اور وہ ہے مترجم کی۔ انہوں نے چھ سات کتابوں کا انگریزی اور ہندی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو مختلف اصناف ادب میں طبع آزمائی کرتے ہوں اور ایسے تو اور بھی کم ہوتے ہیں جنہیں مختلف اصناف ادب پر واقعی عبور حاصل ہو، اور جس میدان میں بھی جائیں اپنی انفرادیت اور امتیاز برقرار رکھیں۔ مظفر حنفی انہیں بہت کم لوگوں میں سے ایک ہیں۔

حسن نعیم

ڈاکٹر مظفر حنفی صنف غزل کے ان خوش بخت فنکاروں میں ہیں جو جدت وجدیدیت کی کشادہ راہوں سے گزر کر سچی تقاضوں کی خاطر نکھارے غزل میں داخل ہوئے تو اپنے ساتھ طرز بیان کی نو بہ نو شگفتگی، خیالات کی وسیع دامانی اور لہجے میں ایک دل پسند سرکشی لے کر داخل ہوئے۔ آج کی غزل میں ان کا اپنا ایک الگ رنگ و آہنگ ہے۔ وہ اپنے مشاہدے اور مطالعے کو ایسے بیباک اور تیکھے انداز میں پیش کرتے ہیں کہ بعض عاشقان غزل کو ان کا رویہ کافرانہ نظر آتا ہے۔

ساقی فاروقی

مظفر حنفی کے مطالعہ اور مشاہدے نے ان کے مصرعوں اور شعروں کو ایسی تشریحیت عطا کی ہے جس کے ابعاد شاد عارفی سے مختلف ہیں۔ ان کی ہر غزل میں ایک دو مصرعے یا ایک دو اشعار ایسے ہوتے ہیں کہ مجھ جیسا کٹر شاعر بھی (شاید بارث ناتم فادی بھی) ان کی ہنرمندی کی داد دیے بغیر نہیں رہتا۔ زبان و بیان پر ان کی گرفت اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ اچھے اچھے شاعروں کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیتی ہے۔

علی جواد زیدی

موجودہ دور کی سختیاں انسان سے بڑی قربانیاں مانگتی ہیں ایسے میں تعجب نہ ہونا چاہیے اگر مظفر حنفی کربلا اور شہادت کی تلمیحوں اور استعاروں میں قربانیوں کی حمایت اور زمانے کی شقاوت بیان کریں۔ دشت، خانہ ستان، نیزہ، لہو اور شہادت ہی نہیں کربلا، فرات، علی اصغر اور اسی طرح کے دوسرے اشارے بھی ان کے یہاں جا بجا ملتے ہیں۔ اسی کے ساتھ عہد حاضر سے تعلق رکھنے والی چھٹی حس، چوتھی سمت اور ساتواں در بھی ہے۔ کہیں مناظر قدرت سے چاند، تتلی، غنچے، خیاباں، پھلواری، جگنو، برگد، پربت، چوٹی مستعار لے لیتے ہیں اور کہیں مشین، بس، ریل بھی اکا دکا نظر آجاتی ہے۔ غرض ان کے یہاں ایک شعوری تلاش، ایک شعری تجربہ ایک پہلے سے طے کی ہوئی کوشش کے آثار صفحہ بہ صفحہ ملتے ہیں اور پھر ایک سنبھلا ہوا شعری ذوق اور منجھا اور رچا ہوا لہجہ ان تجربات کی سطح کے اوپر اوپر تیرتا رہتا ہے۔ ان معنوں میں ''یم بہ یم'' ایک خوشگوار اضافہ ہے اور اس کا ادبی حلقوں میں گرمجوشی سے استقبال ہونا چاہیے۔ مظفر حنفی اب اردو کی محفل میں اپنے لیے مستقل جگہ بنا چکے ہیں اور سمت متعین کر چکے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ سمت درست ہے اور وہ اپنی منزل کی طرف ایک جادہ شناس کی طرح قدم بڑھا رہے ہیں۔ ہم ان کی ترقی کے ہر سنگ میل کا مشتاقانہ مشاہدہ کرتے رہیں گے۔

عمیق حنفی

مظفر کے اشعار میں نئی زبان کا نشانہ ہی نہیں ہمارے آپ کے بہت سے ایسے تجربات ہیں جو ان کے طنزیہ شعروں کا حیرانی عنصر بن گئے ہیں۔ ایک فکر ونظر آزادگی ہے، ایک بھکو پن ہے، ایک حاضر جوابی کا سا ردعمل ہے۔ بازار اور بے لطف احباب کی محفل کی گرمی، خلوص میں تپ کر حرارت و حرکت سے بھرپور زبان کا جادو ہے اور ترسیل کی کامیابی کا طرہ بھی ہے۔ مظفر کے یہاں پاس روایت ہے لیکن وہ روایت پرست نہیں ہیں۔ سماجی معنویت اور زندگی کے تقاضے ہیں لیکن وہ ترقی پسند نہیں ہیں۔ عصری حسیت اور ذات کے حوالے سے

اپنے تجربے کا اظہار ہے لیکن وہ 'جدیدیے' نہیں ہیں۔ اس طرح جو اپنا انفرادی رنگ و آہنگ قائم کرکے یگانہ اور شاد عارفی کے سلسلے کے تیسرے اچھے اور اہم شاعر کے روپ میں سامنے آئے ہیں اور ہمیں شاعری کے ایک نئے ذائقے سے آشنا کرتے ہیں جسے نہ میٹھا کہا جا سکتا ہے نہ پھیکا، نہ کھارا نہ کڑوا، نہ کھٹا نہ پھیکا۔ روایت کا احترام کرنے والا کوئی شاعر شعور و بلاغ کی سطح پر عصری حسیت اور نئے تجربے کو شعری صورت دینے میں مظفر سے بہتر طریقے پر زبان کو شاید ہی برت سکے۔ تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے لیکن مظفر حنفی کی شاعری کو بغیر کسی لیبل کے نہ صرف پسند کیا جا سکتا ہے بلکہ پہچانا بھی جا سکتا ہے۔ یہ سعادت کم شاعروں کو اس دور میں نصیب ہوتی ہے۔

پروفیسر عنوان چشتی

مظفر حنفی کے یہاں صحت زبان و بیان کا خاص اہتمام ہے اور ان کی شاعری میں انفرادیت کے آثار بھی پائے جاتے ہیں اور مظفر حنفی کے اشعار پہچانے جاتے ہیں۔ مظفر حنفی نے اگرچہ اپنی ایک کتاب کا نام "تیکھی غزلیں" رکھا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ مظفر حنفی کے یہاں کھردرے پن سے زیادہ سڈول انداز بیان ملتا ہے۔ انہوں نے نئے فکر و احساس کو اردو شاعری میں سمونے کے لیے نئے الفاظ بھی برتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی غزلوں پر کھردرے پن کا گمان ہوتا ہے۔ کہیں میں نے کہا ہے کہ مظفر حنفی کے یہاں لسانی، فنی اور عروضی چابک دستی ملتی ہے۔ اس چابک دستی اور قادر الکلامی کا راز یہ ہے کہ انہوں نے یگانہ اور شاد عارفی سے اکتساب فیض کیا ہے اور اپنے مشاہدہ اور مطالعہ سے اس خاکہ میں رنگ بھرا ہے۔ میں نے یہ بھی کہا ہے کہ پروفیسر مظفر حنفی کے یہاں انفرادیت کا ایک رنگ جھلکتا ہے۔ یہ انفرادیت ایک طرف نئے فکر و احساس کی دین ہے اور دوسری طرف اظہار کے عناصر کے متناسب تال میل سے پیدا ہوئی ہے۔

شمیم رومانی

مظفر حنفی: جدید کلاسکس کا شاعر ہے

جدید ہونے کے لیے قدیم ہونا بہت ضروری ہے۔ وہ جو اسما اور اشیا کی ماہیت کو سمجھتے ہیں اور حیات و کائنات کو ان کے سیاق و سباق میں دیکھنے والی نظر رکھتے ہیں، ان کے ہاتھ بے شک آسمانوں کو چھو رہے ہوں، وہ اپنے پاؤں مضبوطی سے زمین پر جمائے رکھتے ہیں۔ مظفر حنفی ایک ایسے ہی جدید کلاسیکی شاعر ہیں۔ مظفر حنفی شاعر ہونے کے علاوہ بھی بہت کچھ ہیں۔ ناقد، محقق، افسانہ نگار، مترجم، معلم، ماہر ادبیات اطفال اور ریسرچ اسکالر۔۔۔ شاد عارفی پر ان کا کام معرکے کا ہے۔ یہی ان کی تحقیق کا موضوع بھی تھا۔ وہ خود بھی تحقیق کا موضوع بن چکے ہیں اور ڈاکٹر محبوب راہی نے ۱۹۸۲ء میں ان پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ناگپور یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ یہ مقالہ کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ مظفر ڈھیروں ایوارڈ اور انعامات پا چکے ہیں۔ اور ان دنوں کلکتہ یونیورسٹی میں پروفیسر اقبال چیئر ہیں مگر یہ سب زیب داستان کے لیے ہے۔ ان سب چیزوں کی اہمیت ان کی زندگی تک ہے۔ ہمیشہ رہنے والی چیز تخلیق ہوتی ہے اور تخلیقی نقطۂ نظر سے مظفر حنفی اول و آخر شاعر ہیں۔ شاعری میں انہوں نے جدید طرز احساس کو قادر الکلامی کے ساتھ اور کلاسیکی رکھ رکھاؤ کے ساتھ جدید شعری لفظیات میں پیش کیا ہے۔ از آدم تا ایں دم غزل اتنی کہی جا چکی ہے اور اتنے پہلوؤں سے اور اتنے آسنوں سے برتی جا چکی ہے کہ اب غزل کہنا کار فرہاد کے مماثل ہے۔ اس کے باوجود مظفر حنفی تازہ تر غزل کے شاعر ہیں اور اس باب میں مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے ہنر و فن اور اعجاز سخن سے اس زلیخا کو نئے سرے سے جوان کر دیا ہے۔

اختر سعید خاں

میرے نزدیک اظہار و اقرار سے زیادہ جرأت کا کام ہے۔ باغیانہ اور منحرفانہ رویے کی اپنی اہمیت ہے۔ فرد، سماج اور نظام حکومت سے تحریری انحراف و احتجاج تاریخ ساز تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا ہے۔ آج جس دور میں ہم جی رہے ہیں اس عہد کی پوری زندگی میں یہی احتجاجی لہر کارفرما ہے اور مظفر کی شاعری کا بڑا حصہ اسی احساس کی صدائے بازگشت ہے۔ مظفر نے زندگی کی ناہمواریوں کو قریب سے جھانک کر دیکھا ہے اور اس کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ کبھی طنز کا وار کیا ہے، کبھی فکر و تدبر سے جائزہ لیا ہے اور کبھی دردمندانہ آہ کی ہے۔ ان کی غزلوں کا بڑا حصہ طنز سے عبارت ہے اور دنیائے ادب میں وہ اپنے تیوروں سے پہچانے جاتے ہیں۔ غزل میں طنز کی روایت نئی نہیں ہے لیکن ابتدا میں اس کا دائرہ شکایتِ یار و رقیب تک محدود تھا۔ غزل میں جب سیاسی اور سماجی موضوعات نے اپنا اعتبار قائم کر لیا تو طنز کا نشانہ بھی بدل گیا۔ مظفر کی غزل اسی سلسلے کی ارتقائی کڑی ہے۔

پروفیسر عتیق اللہ

مظفر حنفی کی موجودہ غزل کا سارا سیاق و سباق بڑا شور آگیں، کٹا پھٹا اور جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا ہے۔ تمام منظر و پس منظر نوحوں اور فریادوں سے لبریز ہے۔ کہیں دھواں ہے کہیں آگ ہے کہیں بگولے گردش میں ہیں تو کہیں خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ گنبد و مینار فریاد کناں ہیں تو محرابیں دعا بہ لب۔ مظفر حنفی کی غزل کا یہ وہ چہرہ ہے جو خاصا مسخ ہے۔ یا اُنہی سے پہلے کی غزلوں میں مظفر حنفی کے لفظوں نے اس شور و شیون اور شر سے کم ہی واسطہ رکھا ہے۔ چونکہ طنز بلکہ ہجو ان کے اسلوب میں ایک خاص اہمیت کا حامل تھا اس لیے موجودہ وحشتناکیوں کو زیادہ موثر اور بے باکانہ طریقے سے ادا کرنے میں طنز کا جوہر بڑی خوبی سے کام آیا ہے۔ اسی اسلوب میں ان کی انفرادیت کا راز بھی مضمر ہے۔ مظفر حنفی بلاشبہ ہمارے عہد کے ان قلیل ترین ناموں میں سے ایک ہیں جن کی غزل اپنے مفاہیم میں وسیع، اسلوب میں کاری اور تشنیع میں قطعی مختلف و منفرد ہے۔

محمود ہاشمی

اگر عوام سے نزدیک ہوں مظفر میں
تو اک خفیف سا کج بھی مری کلاہ میں ہے

غزل کا مقطع صرف شاعر کے تخلص کا اعلان نہیں، بلکہ شاعر کی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ مظفر حنفی کی غزل کا مقطع ایک ایسے شاعر کی داخلی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے جو جبر و اختیار کی کشمکش میں شامل ہے۔ عوامی اور اجتماعی احساس سے پوری طرح وابستہ رہ کر اپنی انفرادیت اور کج کلاہی کو قائم رکھنا چاہتا ہے جو خلا سے گزر کر احتجاج اور اجتماع کی منزل تک پہنچا ہے۔ زندگی اور زندگی کے درمیان، اظہار کا معرکہ جاری رکھنے والا یہ شاعر اپنی حقیقت پسندانہ شعوری تخلیقی روش سے، اس امکان کی منزل پر ہے جو نئی ترقی پسندی یا زندگی آمیز تخلیق کی منزل ہے۔

پروفیسر انوار صدیقی

ہندوستان میں فانی کے بعد مظفر حنفی اور محمد علوی ایسے دو شاعر ہیں جنھیں ہم اعتماد کے ساتھ پاکستانی غزل کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں۔ علوی کے مقابلے میں لسانی اور فنی مہارت کے اعتبار سے مظفر زیادہ پختہ اور زیادہ قادر الکلام شاعر ہیں۔ غزل کی جمالیات کو دونوں نے ہی Solemnise De کیا ہے مگر میرے خیال میں مظفر حنفی نے یہ کام بھرپور شعوری رہنمائی میں انجام دیا ہے۔ اس سے غزل کا رویہ کمزور پڑ گیا ہے اور ایک نئی سنجیدگی اور خلوص اظہار کی ایک نئی جمالیات جنم لے رہی ہے۔ جو روایتی غزل کی اکڑ، لگاوٹ اور شیر و نواز جمالیات سے ذرا ہٹ کر اپنے آپ کو سنوار رہی ہے۔

عالم شبلی

ہم مظفر حنفی کی رباعیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ وہ اس پل صراط سے سلامتی کے ساتھ گزرے ہیں اور ان کی رباعیوں میں اس فن کی امتیازی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مظفر حنفی ایک سچے تخلیقی فنکار ہیں اس لیے جس طرح موضوع کا تنوع، بول چال کی زبان کا کھردرا پن، بے باک لہجہ اور طنزیہ کاٹ ان کی غزلوں کی خصوصیات ہیں، اسی طرح یہ ان کی رباعیوں کو بھی جاندار اور پرکشش بناتی ہیں اور ہم ایک حیرت انگیز اور خوشگوار جمالیاتی تجربے سے دوچار ہوتے ہیں۔ طنز مظفر حنفی کی شاعری کا نمایاں وصف ہے۔ انھیں زندگی کی ناہمواریوں، گرد و پیش کی کھردری حقیقتوں اور معاشرتی کجیوں اور خامیوں کا گہرا احساس ہے۔ وہ طنزیہ پیرایہ بیان میں ان کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ شدت مشاہدہ اور نفاست طبع نے اسے تلوار کی دھار بنا دیا ہے جس کا نشانہ دوسرے ہی نہیں، خود شاعر بھی ہیں۔

رشید امجد

مظفر حنفی شاعر کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں لیکن ان کے افسانوں کا یہ مجموعہ دیکھ کر احساس ہوا کہ ان کے اندر ایک بہت اچھا کہانی کو بھی چھپا بیٹھا ہے۔ مظفر حنفی کے افسانے موضوعاتی طور پر اپنے گرد و نواح سے بحث کرتے ہیں۔ متوسط طبقہ کی سماجی، معاشرتی اور معاشی تناؤ کے مسئلے کے نتیجے میں اس طبقے میں جو الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں، مظفر حنفی نے انھیں موضوع بنایا ہے۔ چنانچہ ان کے افسانوں میں موضوعاتی تنوع افسانہ کے دیگر لوازمات پر حاوی رہتا ہے۔ فنی طور پر یہ افسانے کہانی سے زیادہ قریب ہیں۔ اکثر افسانوں میں کہانی کہنے کا انداز داستانی سا ہے۔ اردو افسانے میں اس دوران جو نئے رجحانات آئے ہیں یہ افسانے ان سے متاثر نظر نہیں آتے۔ مظفر حنفی نے ان افسانوں کے توسط سے زندگی کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور جس سیدھے سادھے انداز میں زندگی کو دیکھا ہے اسی طرح بیان کر دیا ہے۔ ان کے کردار زبان و بیان کی الجھنوں میں پڑنے کی بجائے راست عمل پر گامزن نظر آتے ہیں۔ یہ کردار ایک عام انسان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے غیر معمولی بنا کر پیش نہیں کیا گیا ہے۔ مظفر حنفی کے افسانوں میں ساری باتیں وضاحت سے بیان ہوتی ہیں۔ اس سے ایک فائدہ یہ ضرور ہوا ہے کہ قاری چیزوں کو بآسانی سمجھ لیتا ہے اور ابہام کا خدشہ نہیں رہتا لیکن بعض اوقات یہ وضاحت افسانے کے تحیر اور تجسس کو نقصان بھی پہنچاتی ہے اور بعض چیزیں جنھیں اوجھل رہنا چاہیے، کھل کر سامنے آجاتی ہیں۔

شمس الرحمان فاروقی

مظفر حنفی کی شرافت سے میں اتنا ہی ڈرتا ہوں جتنا رامپوری حضرات ان کے استاد شاد عارفی کے طنز سے خوف کھاتے ہوں گے۔ چند اکل استاد کے طور پر یہ کہتا ہوں کہ مظفر حنفی نظم میں تھوڑے بہت متاثر مہذب دکھائی دیتے ہیں لیکن غزل میں وہ تمام حربے برت لیتے ہیں جن سے ان لوگوں کو گھبراہٹ ہونے لگتی ہے جو غزل کو گھر بیٹھی والی کنواری کی طرح منہ پر سوئی اوڑھنی ڈالے ہوئے پردہ و عفت کا معاملہ یا عشق و محبت کی چھپی چھپی ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر لطف یہ ہے کہ ان سب بے باکیوں کے باوجود مظفر حنفی غزل کے شاعر نہیں بلکہ غزل ہی کے شاعر رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی بے باکیوں کو اظہار تضحیک و رنج کے بجائے اظہار برہمی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ خصوصیت انھیں اکثر سے زیادہ سودا کے نزدیک لے جاتی ہے:

بجا نہیں یہ تکلف اگر حقیقت ہو
تو صاف کہہ کر طبیعت اچٹ گئی مجھ سے

ٹھونک دے سلاخ کے ماتھے پہ اسے قصر پاک
آخری کیل کو تابوت میں جڑنا کیا ہے

دوسری بات یہ ہے کہ مظفر حنفی غزل کے ان اسالیب کو بھی آزادی سے

بہت لیتے ہیں جو نسبتاً زیادہ معروف اور قابل قبول ہیں۔ عشق اور زندگی کے وہ تجربات جنہیں انسان فرد واحد کی طرح جھیلتا ہے سماجی یا انسانی نیوکلس انسان کی طرح نہیں، وہ بھی مظفر حنفی کی شاعری کا طرہ امتیاز ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھیے تو مظفر حنفی نے انتہائی شگفتہ زمینوں میں رواں دواں شعر کہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ نئے نئے ردیف و قافیہ کا ایک ذخیرہ ہے جو دہلتا جا رہا ہے۔ ان کی شاعرانہ چابک دستی کہیں مات نہیں کھاتی۔ طنزیہ شاعری، بے خوفی اور حاضر جوابی بھی ان کے یہاں موجود ہے۔ مختلف باتوں کو ایک ہی طرح اور ایک ہی بات کو کئی طرح کہنے کا ڈھنگ انہیں خوب آتا ہے۔ شاد عارفی کے بعد ان کا دم غنیمت ہے۔

انور صدیقی

ایک عرصے تک ڈاکٹر مظفر حنفی کو شاد عارفی کے قبیلے کا شاعر سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ شاد عارفی کے عقیدت مند تلامذہ میں سے ہیں اور بات کو کھری کھری سچائی سے کہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں تاہم اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ ایک طویل عرصے تک شاد عارفی کے سائے تلے سفر طے کرنے کے باوجود مظفر حنفی نے اپنی الگ انفرادیت نکھاری ہے۔ ان کی شاعری کا ذائقہ الگ ہے اور وہ اپنی ایک الگ پہچان بھی رکھتے ہیں۔ وہ اپنی تازہ ترین کتاب "طلسم حرف" میں انبوہ میں گم نہیں ہو جاتے بلکہ اپنا تشخص اپنی شاعری کے حوالے سے قائم کرتے ہیں۔ مظفر حنفی نے قدیم سچائی کو جدید اسلوب میں پیش کیا ہے۔ وہ نہ تو خود نمائی سے خوف کھاتے ہیں اور نہ جذبے پر بند باندھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ زمانے کے گرم سرد کو چکھنے اور اس سے نبرد آزما ہونے کے باوجود مظفر حنفی کے یہاں تلخی یا زہر ناکی پیدا نہیں ہوتی۔ ان کی یہ خوبی انہیں شاد عارفی سے مختلف مزاج کا شاعر ثابت کرتی ہے۔

پروفیسر شمیم حنفی

مظفر حنفی کا پہلا عشق بھی شاعری ہے اور شاعری کے واسطے سے ان کا نام و مقام محفوظ ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ تنقید و تدوین اور تحقیق کی وادیوں سے بھی گزرتے آئے ہیں۔ معلمی کا پیشہ اختیار کرنے سے پہلے بھی ان کی کئی مرتبہ کتابیں اور تنقیدی تحریریں سامنے آئیں اور مقبول ہوئیں۔ اب کہ انہوں نے باقاعدہ طور پر تدریس کا منصب سنبھال رکھا ہے انہوں نے کئی ایسے تنقیدی اور تحقیقی کارنامے انجام دیے ہیں جن سے ان کے مطالعے کی وسعت و تنظیم اور نظر کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ زیر نظر کتاب ان کے گیارہ تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔ پہلا تاثر تو فہرست پر نظر پڑتے ہی قائم ہوتا ہے کہ اپنی ادبی روایت سے مظفر حنفی کا شغف یک رخا اور محدود نہیں ہے۔ اردو نثر و نظم کے مختلف ادوار و اصناف سے ان کی دلچسپی یکساں ہے۔ میرا خیال ہے کہ کسی بھی ادبی روایت کا ہمہ گیر شعور اسی رویے کے بغیر مشکل ہی سے پیدا ہوتا ہے۔

پروفیسر علیم اللہ حالی

عکس ریز اپنی نوعیت کی اردو میں پہلی تخلیق ہے۔ یہ ایک طویل نظم ہے جو کم و بیش سوا سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ ہر صفحے پر ایک ایک بند ہے۔ ان بندوں کا آپس میں کوئی ایسا رشتہ نہیں ہے۔ اپنے طور پر سب آزاد اور خود مختار بند ہیں لیکن معنوی ربط کی مضبوطی نظم میں حسن تشکیل پیدا کرتی ہے۔ ان ٹکڑوں میں کہیں طنز آمیز ہمدردی ہے کہیں چھپا چھپا طنزیہ تبسم ہے کہیں رکا رکا خندہ ملامت، کہیں دشنام طرازی ہے کہیں اصلاح کا جذبہ ہے کہیں تحمل ہے کہیں سنجیدگی ہے کہیں بے احتیاطی۔ غرض ان تمام ٹکڑیوں کی اجتماعی تنظیم سے ہمیں فرد، سماج، رسم و رواج، تہذیب، سائنس، علم، جہل، دولت اور مفلسی وغیرہ موضوعات کے سلسلے میں مختلف احساسات ملتے ہیں۔ مظفر حنفی کے یہ احساسات ردعمل کے طور پر پیش ہوئے ہیں اور یہ بات ایک ثابت حقیقت ہے کہ ردعمل عموماً پیچیدہ، شدید، قدرے تخریب کارانہ اور متنوع ہوتا ہے۔ محترم ہما انصاری نے اس تخلیق کے سلسلے میں مصنف سے مخاطب ہو کر کچھ اچھی رائے کا اظہار نہیں کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ان احساسات میں ردعمل کی پیچیدگی، شدت، تنوع اور تخریب کی رعایتوں کا خیال کیا جائے تو ایک خاص حیثیت سے یہ تخلیق بڑی گراں بہا نظر آئے گی۔

پروفیسر مظہر مہدی

مظفر حنفی کا خاندان کا تصور اتنا وسیع ہے جتنا ہمارے ملک اور ہماری پرانی تہذیب میں تھا۔ یہ تصور جو اب خواب و خیال ہو گیا ہے وہ انہیں نارمل اور نیچرل لگتا ہے اس لیے نہ وہ اس کی افادیت پر گفتگو کرتے ہیں نہ اسے رومینٹی سائز کرتے ہیں۔ مظفر حنفی ایک اچھے استاد ہیں۔ ایسے استاد جو واقعی پڑھاتے ہیں۔ جنہیں پڑھانا اچھا لگتا ہے۔ جو علم کے بوجھ کے نیچے دبے نظر نہیں آتے مگر طالب علموں سے ضروری فاصلہ رکھتے ہیں۔ ان کو سختی سے ڈانٹتے ڈپٹتے بھی ہیں مگر لگاوٹ اور اپنائیت کے ساتھ۔ جو لوگ کلاس لینے میں سنجیدہ نہیں ہوتے اور طالب علموں کی ناواقفی کا رونا روتے نظر آتے ہیں یہ کبھی سنجیدگی اور کبھی زہر خند کے ساتھ ان کی سرزنش بھی کرتے ہیں۔ ہمیں بڑا عجیب لگتا تھا کہ ان جیسا کھرا انسان اور جس طالب علم کو دیکھو ان ہی کی تعریف کر رہا ہے۔ مظفر حنفی نے افسانے بھی لکھے ہیں، تنقیدی مضامین بھی۔ کتابیں بھی ایڈٹ کی ہیں۔ ہم ان کی علمیت، ان کی ادبی اور تنقیدی صلاحیتوں کے دل سے قائل ہیں مگر پھر بھی ہم ان کو اچھے شاعر ۔۔۔ صرف شاعر ہی نہیں بڑے اچھے اور انوکھے شاعر ۔۔۔ لیکن ان کی انفرادیت ہے ان کے سارے طور طریقے شاعروں والے ہیں۔ ان کی شخصیت پر میر کا یہ مصرعہ خوب چسپاں ہوتا ہے "ٹک بات ہو گئی تو کڑی چال تیز تھی"۔ دوسرا مصرعہ یوں نہیں کہ انہیں میر کی طرح کسی سے نہ سمجھا کم سمجھنے کا شکوہ نہیں۔ ان کی تو کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ۔

''نفسِ شیشہ گراں''

محمود الحسن

(راولپنڈی)

موجۂ ابر رواں ہیں ہم لوگ
جانے کیوں سب پہ گراں ہیں ہم لوگ

ہُو بہُو مہر و وفا کی تصویر
ہمہ تن آہ و فغاں ہیں ہم لوگ

نرم و نازک کبھی شبنم کی طرح
اور کبھی شعلہ بجاں ہیں ہم لوگ

یہ نہیں اہلِ خرد کو معلوم
واقفِ سرِّ نہاں ہیں ہم لوگ

لُطفِ آوارگیِ شوق نہ پُوچھ
ذرّہ ریگِ رواں ہیں ہم لوگ

لاکھ بے یارو مددگار سہی
صاحبِ شانِ شہاں ہیں ہم لوگ

خرقۂ فقر ہماری زینت
رونقِ بزمِ جہاں ہیں ہم لوگ

ہم سے کیوں آئینۂ دل پہ ہو میل
نفسِ شیشہ گراں ہیں ہم لوگ

آگ میں پڑ کے بَراہیم کی صفت
واردِ کوئے جناں ہیں ہم لوگ

اب تو مائل بہ کرم ہو تُم بھی
اب نہ پوچھو کہ کہاں ہیں ہم لوگ

ہے وہی مالک و مختار جہاں
جس کی جانب نگراں ہیں ہم لوگ

کرشن کمار طور

(دھرم شالہ بھارت)

میں کس سے کرتا یہاں گفتگو کوئی بھی نہ تھا
نہیں تھا میرے مقابل جو تو کوئی بھی نہ تھا

یہ عجز ذات تھا یا ارتفاعِ حسنِ نظر
کبھی کبھی تو مرے چار سو کوئی بھی نہ تھا

عجیب اس کی محفل، کہ اس کی محفل میں
پُر امتیاز تھے سب سرخرو کوئی بھی نہ تھا

میں کیا بتاؤں کہ اس خاک سے ہوں وابستہ
زمینِ دل میں جہاں نم نمو کوئی بھی نہ تھا

یہ کیسی بستی ہے وارد کہاں ہوا ہوں' جہاں
نظیرِ سلسلۂ ہاؤ ہو کوئی بھی نہ تھا

چلو چلیں کہ یقین و گماں کی دنیا میں
نفس نفیس سبھی' دل لہو کوئی بھی نہ تھا

میں خود ہی اپنے برابر کھڑا ہوا تھا طورؔ
بھرے جہان میں میرا عدو کوئی بھی نہ تھا

○

مشکور حسین یاد
(لاہور)

داد گر یہ اسے جم کر دیجے
دل کو پانی پہ رقم کر دیجے

دیکھیے پھر تب و تاب تعبیر
خواب پر خون کو دم کر دیجے

لا یئے کھینچ کے خود کو باہر
زعم کو ذات میں ضم کر دیجے

آپ دریا ہیں تو میرے دل کو
بہتے بہتے ہی بہم کر دیجے

دُور تک دیکھیے اپنے جلوے
ہیبتِ حول کو کم کر دیجے

رات دن دیکھتے ہیں ایک اگر
خطِ خورشید کو خم کر دیجے

یادؔ اتر جائے گا سیلاب الم
اشک کو ناظم نم کر دیجے

○

جمیل یوسف (مری)

اور کوئی نہیں تھا میرے خلاف
میں تو خود ہی رہا ہوں اپنے خلاف

وہ حقیقت میں تھا خود اپنے خلاف
جو کیا میں نے دوسروں کے خلاف

میں نہیں تھا اگر کسی کے خلاف
کوئی ہوتا بھی کیسے میرے خلاف

جو بُرے تھے وہ خیر تھے ہی بُرے
کر لئے ہم نے اچھے اچھے خلاف

ہر کوئی دوسرے کی فکر میں ہے
ہر کوئی ہے یہاں کسی کے خلاف

عُمر دوروزہ میں یہی دیکھا
کبھی اپنے، کبھی پرائے خلاف

ایک ماں باپ کے جو بچے تھے
ہو گئے ایک دوسرے کے خلاف

جس کی آغوش میں پلے پھولے
اُسی ماں کے ہوئے ہیں بچے خلاف

کیا یہی زندگی کا حاصل ہے
باپ بے زار اور بیٹے خلاف

جن کو ہم اپنی جان کہتے تھے
وہ ہوئے ہیں ہمارے کتنے خلاف

کیا شکایت کریں زمانے کی
وہ تو ہوتا ہے ہر کسی کے خلاف

وقت کی کج ادائیوں پہ نہ جا
کبھی میرے، کبھی ہے تیرے خلاف

کیا شرف آدمی کو حاصل ہے
آدمی جب ہے آدمی کے خلاف

دنیا داری جمیلؔ مجھ میں کہاں
میں تو دنیا کے تھا شروع سے خلاف

بی ایس جین جوہر

(میرٹھ۔بھارت)

کسی غریب کی کھولی میں ہو کوئی بیمار
دوائی دارو کو پیسے جٹانا ہو دُشوار

پچاس علاج بتائیں گے دس طریقہ کار
کوئی مدد کو نہ آئیگا اپنا رشتہ دار

علاج ڈٹ کے کرائیں کسی سے لے کے اُدھار
کوئی بھی شرح ہے سود کی' کہ ہیں لاچار

جو اپنے سیٹھ سے مانگیں گے پیشگی یا اُدھار
کہے گا تجھ کو ہے پینے کے واسطے درکار

پئے گا کیسے وہ کھوسٹ نہ سوچ پاتا ہے
کہ جس کی بیوی ہوئی ہی ہے مرنے کو تیار

اُجڑ ہی جائے گا خوابوں کا حسیں تاج محل
نصیب میں ہے نہ جس کے کوئی کتبہ نہ مزار

سڑک پہ چیختے، چلاتے جا رہے ہیں لوگ
کہ پانچ سال میں باقی رہے گا کوئی نہ روگ

○

سرور انبالوی

(راولپنڈی)

آرزوؤں کی جسے اک کہکشاں سمجھتا تھا میں
زندگی اِک ڈھلتا سایہ تھا کہاں سمجھتا تھا میں

ابر کی صورت جو میرے ذہن پر چھایا رہا!
اُس کو بھی خود اپنی آہوں کا دھواں سمجھتا تھا میں

حُسنِ جاناں کی تجلّی مہر و مہ بن کر رہی!!
حسن کی تابانیوں کو کہکشاں سمجھتا تھا میں

زیست کے صحرا میں تیری ذات تھی بادِ نسیم
اور سر کی دھوپ کو اِک سائباں سمجھتا تھا میں

خارزاروں سے رہا ہے واسطہ اک اک قدم
اس جہانِ بے رِدا کو گُلستاں سمجھتا تھا میں

خود فریبی اس سے بڑھ کر اور ہو سکتی ہے کیا
راہزن تھا جس کو میرِ کارواں سمجھتا تھا میں

اُلجھنوں میں مجھ کو رکھا عمر بھر احباب نے
اور اس کو بھی عطائے دوستاں سمجھتا تھا میں

خود جبینِ شوق میری ہو کے بے خود جھک گئی
تیرے نقشِ پا کو سنگِ آستاں سمجھتا تھا میں

گامزن راہِ وفا پر تھا سُرور انبالوی
کارواں تھا جس کو گردِ کارواں سمجھتا تھا میں

عبدالاحد سازؔ

(ممبئی بھارت)

کھلے ہیں پھول کی صورت ترے وصال کے دن
ترے جمال کی راتیں، ترے خیال کے دن

نفس نفس نئی تہہ داریوں میں ذات کی کھوج
عجب ہیں تیرے بدن، تیرے خط و خال کے دن

یہ ذوقِ شعر، یہ جبرِ معاش یکجا ہیں
مرے عروج کی راتیں، مرے زوال کے دن

خرید بیٹھے ہیں دھوکے میں جنسِ عمرِ دراز
ہمیں دکھائے تھے کاتب نے کچھ مثال کے دن

نہ حادثے، نہ تسلسل، نہ ربطِ عمر کہیں
بکھر کے رہ گئے لمحوں میں ماہ و سال کے دن

میں بڑھتے بڑھتے کسی روز تجھ کو چھو لیتا
کہ کس کے رکھ دیئے تو نے مری مجال کے دن

یہ تجربات کی وسعت، یہ قیدِ صوت و صدا
نہ پوچھ کیسے کڑے ہیں یہ عرضِ حال کے دن

○

نصرت زیدی

(راولپنڈی)

ہم نے لے لیا آخر خود ہی امتحاں اپنا
چشمِ خونفشاں اپنی دل دُھواں دُھواں اپنا

ہم تو لہر کی صورت ختم ہوئے ہیں دریا میں
کیا کسی کو بتلائیں نام اور نشاں اپنا

اُس کو اک تعلق تھا ہم سے کچھ دِنوں پہلے
ذکر اُس حوالے سے ہے کہاں کہاں اپنا

کچھ ہمیں بھی بتلاؤ آبدیدہ تم بھی ہو
مختلف تھا کیا سب سے طرزِ داستاں اپنا

ہر کسی سے پوچھوں تھا کون میرا قاتل ہے
نام لے لیا اُس نے آج ناگہاں اپنا

شعر کہہ کے لائے ہیں کیا خبر کہ ہم نصرتؔ
کس کے ہاتھ بیچیں گے حرفِ رائیگاں اپنا

○

اسلم راہی

(اسلام آباد)

پھول بکھرے ہیں خاروخس کی طرح
آج گلشن بھی ہے قفس کی طرح

رات آکاش کی عمارت سے
اک ستارہ گرا کلس کی طرح

آسماں پھوٹ پھوٹ کر رویا
اس برس بھی گئے برس کی طرح

کوئی مجھ کو صدائیں دیتا ہے
دور سے نغمۂ جرس کی طرح

اپنی آواز میرے کانوں میں
گھول جاتا ہے کوئی رس کی طرح

کوچۂ دلبراں میں بھی راہی
چاہتیں ہوگئیں ہوس کی طرح

○

فیصل عظیم

(کینیڈا)

یہ جوالا خاک میں کیسے دبائیں
کہاں تک آخر اپنا جی جلائیں

زمیں لاوا اُگلنا چاہتی ہے
پہاڑ اب اپنے اپنے سر بچائیں

بہت پتھر پڑے ہیں خواہشوں کے
ہم اس ملبے کے نیچے دب نہ جائیں

یہ روز و شب جو بے چینی بہت ہے
تو کیا ہم اپنے خیمے پھر اُٹھائیں

ہر اک جانب سے حملے ہو رہے ہیں
پلٹ آتی ہیں خود اپنی صدائیں

پناہیں ڈھونڈتی ہے خود کلامی
کہ اندیشوں کی آوازیں نہ آئیں

کوئی کرتب ہے گویا زندگی بھی
کہ رسی پر چلیں اور ڈگمگائیں

میں اب جو منہ چھپائے پھر رہا ہوں
تو کیا میں واقعی چہرہ نما تھا

برف باری کا ایک یادگار دن

اختر جمال (کینیڈا)

برف باری کی وہ صبح اتنی خوبصورت تھی کہ میری روح اپنے اردگرد پھیلی ہوئی خوبصورتی میں جذب ہوگئی۔

کئی دن سے برف کے طوفان آ رہے تھے اور چار سو برف کی دھول اڑتی رہی پھر برف کی تیزی اور رفتار کم ہونی شروع ہوئی اور برف باری ہلکی ہوگئی۔

اس روز فجر کے اجالے میں تو یوں لگا جیسے آسمان پر بیٹھا خدا جو کئی دنوں سے برف کی روئی دھن رہا تھا اچانک موتی برسانے لگا برف میں سے نورانی سا اجالا موتی کی طرح چمک رہا تھا ننھے ننھے برف کے گالے موتیوں کی بارش بن گئے اتنی خوبصورتی سے آہستہ آہستہ کہ میں نے سوچا پیغمبروں کے دل پر وحی ایسے ہی اترتی ہوگی۔ ایسے ہی محبت کا نور انسان کے دل میں خدا کی یاد بن کر اترتا ہے اور روحِ ازل کا مکالمہ سنائی دیتا ہے اور دل کو عرفان کی دولت نصیب ہوتی ہے۔

ٹورنٹو میں سترہ سال گزار کر برف باری کے اتنے بہت سے انداز دیکھ لیے ہیں مگر ہر سردی میں وہ تھوڑا سا حیران اور پریشان کرتی ہے کینیڈا کے مقامی لوگوں کی زبان میں برف کے سو نام ہیں اور شاید ہر ایک کا اپنا حسن ہے۔

میرے سامنے والی سڑک ٹورنٹو کی بہت لمبی سڑک ہے جو کہ یہیں سے شروع ہوتی ہے اس پر دونوں طرف سے ٹریفک چلتی ہے صبح سویرے برف کی بڑی بڑی گاڑیاں چلتی ہیں اور سڑک صاف کر دیتی ہیں پھر موٹروں اور ہر طرح کی گاڑیوں کی آمد و رفت شروع ہو جاتی ہے فٹ پاتھ پر دونوں طرف ہلکی سی برف کی تہہ پر لوگ سنبھل کر چلتے ہیں اس سڑک پر ہر وقت شور رہتا ہے۔

اس سال موسم سرما شروع ہوتے ہی بسوں کی ہڑتال شروع ہوگئی جو لمبی ہوتی گئی۔ بسوں کی ہڑتال نے شہر کو بے حال کر رکھا تھا۔ شہریوں کی ہمدردیاں ڈرائیوروں کے ساتھ تھیں اس لیے وہ بڑے صبر و ضبط سے ساری تنگی جھیل رہے تھے۔ جب ہڑتال کا عرصہ لمبا ہو گیا تو دو طالب لوگوں نے تھوڑا تھوڑا بڑبڑانا شروع کیا مگر کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔ ان دنوں یہ لگتا تھا کہ سڑک پر لوگ چلنے کے بجائے دوڑ رہے ہیں۔ میں نے اپنی پڑوسی اسکول کی لڑکیوں سے پوچھا ’’یہ تم روز سڑک پر اتنی برف دوڑ لگاتی ہو کسی دن پھسل کر گر جاؤ گی‘‘۔ وہ بولیں ’’دوڑنے سے سردی کم لگتی ہے ہم گرتے بھی ہیں مگر پھر اٹھ کر دوڑنے لگتے ہیں اور وقت پر اسکول پہنچ جاتے ہیں‘‘۔

جس خوبصورت صبح کی بات میں کر رہی ہوں وہ صبح ایک تاریخی صبح تھی۔ مارٹن لوتھر کنگ کی یاد میں امریکہ کے ہونے والے صدر نے اعلان کیا تھا کہ یہ دن وہ رضاکارانہ کام کا دن منائیں گے اور کمیونٹی ورک کا دن ہوگا۔ کالے گورے سب ہی نوجوان لڑکے لڑکیاں جوش و خروش سے والنٹری ورک کر رہے تھے انہیں اوباما کے چہرے پر آنے والے دور کی بشارت نظر آ رہی تھی امید، امن، اچھی زندگی کی نوید! اوباما کے ہاتھ میں ایک بڑا سا برش تھا وہ دیواروں پر پینٹ کر رہا تھا۔ کبھی کبھی کھڑکیاں دروازے ٹھیک کرتا دکھائی دیتا اور لوگ اینٹیں ڈھو رہے تھے پتھر اٹھا رہے تھے سڑکوں کی صفائی کرتے نظر آ رہے تھے۔ لوگ اپنے ملک کو سجا رہے تھے اور بہت خوش تھے۔ ٹی وی پر یہ منظر دیکھ کر میرے دل میں یہ خواہش جاگی کہ کاش ہمارے ملکوں میں بھی ہمارے رسول محمد ﷺ کا یوم پیدائش ایسے ہی منایا جائے۔ ہمارے رسول نے تو اپنی کمر پر پتھر ڈھوئے تھے مزدوری کی تھی ہاتھ میں جھاڑو تھام کر مسجد کا فرش صاف کیا تھا۔ اپنے ذاتی کام خود کرتے تھے۔ ہمارے ہاں سیرتِ رسول پر عمل کرنے کے بجائے جلسے جلوس اور تقریریں ہی ہوتی ہیں۔ کاش ہم جو امریکہ اور مغرب کی اندھی پیروی دوسرے کاموں میں کرتے ہیں، اچھے کاموں میں بھی تقلید کریں۔ پھر ہمارے کوڑے کرکٹ کے سب ڈھیر پھولوں کی کیاریاں بن جائیں۔

کینیڈا میں بھی اس روز سب لوگ بہت پرجوش نظر آ رہے تھے۔ کینیڈا کی نوجوان نسل خاص طور پر پرجوش تھی۔ لڑکے لڑکیاں دوڑتے بھاگتے تین لفظ کہتے نظر آتے Yes we can ان تین لفظوں میں جیسے کسی نے روح پھونک دی اور سب کا مطلب سمجھا دیا۔ تین لفظوں میں عزتِ نفس، زندگی سے محبت اور جد و جہد سب ہی خوبصورت جذبے پوشیدہ ہیں۔ ترقی کی طرف خود ہی قدم اٹھانا ہے کوئی دوسرا دھکا مار کر منزل تک نہیں پہنچا سکتا۔

اس روز ساری دنیا کے مظلوم عوام سوچ رہے تھے کہ اب ظلم و ستم کا ایک لمبا دور ختم ہو کر امن و آشتی کا سورج نکلنے والا ہے آنے والا کل ساری دنیا کے لیے انتظار کا کل بن گیا تھا۔ جو سب کو یقین تھا امن و انصاف اور خوشی کا دن ہوگا۔

امریکہ کے پہلے کالے صدر کے قدم سفید ستونوں والے عالیشان سفید گھر میں مبارک قدم ہو گئے۔ امریکہ کے عوام جو ظلم کے اندھیرے میں امن کے سفید پرچم لہراتے رہے، لمبے لمبے جلوس اور جلسے کرتے رہے پھر بھی وہ جنگ کو نہ روک سکے۔ اب جنگ کے دیے ہوئے سب زخموں سے چور، بے روزگاری، بیکاری، بیماریوں اور قدرتی حادثوں اور آفتوں کے ستائے ہوئے لوگ اب ساری دنیا کے مظلوموں اور غریبوں کے ساتھ نئی صبح کا خواب دیکھ رہے تھے۔ وہ نئی صبح کا انتظار کر رہے تھے۔ امریکہ کے عوام اپنے ووٹ کی قیمت جانتے ہیں اور انہوں نے اپنی طاقت منوالی تھی اور اب انہیں یقین تھا کہ کل جب سورج نصف النہار پر ہوگا تو صدر بش اپنے دور کا سب اندھیرا سمیٹ کر سفید عمارت کے پچھلے دروازے سے باہر نکل جائیں گے اور اسی لمحے ان کا نیا صدر اوباما ان کے سب خواب حقیقت بنانے کے لیے اس سفید عمارت میں سامنے کے دروازے سے داخل ہوگا۔

مارکس نے ساری دنیا کے مزدوروں کو ایک ہونے کے لیے پکارا تھا ''ساری دنیا کے مزدورو! ایک ہو جاؤ تمہارے پاس کھونے کے لیے کیا ہے سوائے اپنی زنجیروں کے!'' ساری دنیا کے مزدور تو ایک نہ ہو سکے مگر ساری دنیا کے سرمایہ دار ضرور ایک ہو گئے۔ ان کے بڑے بڑے کلب بن گئے اور چوٹی کے سرمایہ دار دنیا کے سب بڑے بن گئے ظلم اور نا انصافی کا اندھیرا اتنا بڑھا کہ انہیں بھی نگلنے لگا تو وہ گھبرا گئے اب وہ اپنی بوئی ہوئی کی فصل کا بیا کاٹنے کی بھی طاقت نہیں رکھتے۔ امریکہ کے عوام نے انہیں کرسی چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور دنیا میں ہر ایک زبان پر Change کا لفظ ابھر آ رہا ہے۔ ساری دنیا اس تبدیلی کی طرف دیکھ رہی ہے۔

کینیڈا کی ملکہ تو برطانیہ کی ملکہ ہی ہیں اور دولتِ مشترکہ کے تمام ممالک کے مقابلے میں کینیڈا اور برطانیہ ایک دوسرے کے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ لیکن جغرافیہ اور تہذیب و معاشرت کی یک رنگی نے شمالی امریکہ کی وحدت کا ایک حصہ بنایا ہے اور عوام ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ امریکن الیکشن سے کینیڈا میں اتنی ہی دلچسپی لی جا رہی ہے جتنی امریکہ کے عوام کو ہے کینیڈا کی حکومت تو قدامت پسند ہے اس لیے عوام اس سے بیزار ہو کر پرجوش طریقے سے اوباما کی حمایت کر رہے ہیں۔ ترقی پسند جماعتوں کے ووٹ بٹ جانے سے کلیتی پارٹی نے اکثریت حاصل کر لی ہے۔ اوباما کی حمایت سے عوام خوشی محسوس کر رہے ہیں۔ اس لیے اس گرمجوشی سے جس کو اوباما جنون (Obama mania) کہا جا رہا ہے۔

میرے پاس ایک لڑکی ہفتے میں ایک دن صفائی کرنے آتی ہے جس کے آباؤ اجداد کسی زمانے میں امریکہ سے بھاگ کر کینیڈا آ بسے تھے اور غلامی کے پھندے سے نکل کر آزادی حاصل کی تھی۔ اس نے گھنٹی بجائی تو میں نے دروازہ کھولا وہ بھاری کوٹ اور برف کے لیے جوتوں کے ساتھ داخل ہوئی اور بولی ''میں تمہارے گھر آنے کے لیے ڈیڑھ گھنٹہ برف پر دوڑتی ہوئی آئی ہوں راستے میں دو دفعہ پھسل کر گری''۔

''چوٹ تو نہیں آئی'' میں گھبرا گئی۔

وہ مسکرا کر بولی ''مجھے برف پر گرنے کی پریکٹس ہے میں گرتے وقت اپنا پورا خیال رکھتی ہوں''۔

میں نے اس کے لیے چائے بنائی چائے کے دوران وہ باتیں کرتی رہی۔

''سچ پوچھو تو آج میری آنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی پھر میں نے اوباما کو ٹی وی پر دیکھا اور میں نے کہا Yes I can اور میں نے باہر نکل کر دوڑنا شروع کیا''۔ پھر اس نے بیگ سے اوباما کی سوانح نکالی اور کہا ''میں پڑھ چکی ہوں سوچا تم بھی پڑھنا پسند کرو گی۔ جب تم ختم کر لو گی تو پھر میں اپنی ماں کو پڑھنے کے لیے دوں گی''۔ میں نے کتاب لے لی اور کہا ''میں ان شاء اللہ چند دن میں ختم کر لوں گی''۔ وہ ہنس کر بولی ''تم ایک ماہ بھی رکھ سکتی ہو۔ میری ماں تو بہت آہستہ پڑھتی ہے وہ تو کئی مہینے میں ختم کرے گی''۔ میں نے کہا ''اسے شاید اور بھی کام کرنے ہوتے ہوں گے۔'' ''ہاں وہ سلائی کڑھائی بھی کرتی ہے، کسی دکان پر بھی جاتی ہے کپڑوں پر بٹن ٹانکتی ہے''۔ ''آج کل اس سردی میں اس کی بڑی ہمت ہے کہ باہر جاتی ہے''۔ ''دکان گھر کے قریب ہے'' اس نے کہا۔

شام کو میں نے سوچا آج لانڈری کر لوں تو پھر کل سارے دن اطمینان سے ٹی وی دیکھوں گی۔ کینیڈا کی بسوں کی طرح لانڈری روم میں بھی ہر رنگ و نسل اور زبان کے لوگ نظر آتے ہیں، اکثر مذہب، زبان اور وطن کی یکسانیت انہیں قریب کر دیتی ہے، دوستیاں یہیں سے شروع ہوتی ہیں۔ ہندوستانی اور پاکستانی خواتین ایک دوسرے کو اکثر لانڈری روم میں دریافت کرتی ہیں یا پھر بچوں کے پارک میں جان پہچان ہوتی ہے۔

میری پڑوسنیں عراقی، فلسطینی، لبنانی اور صومالیہ کی عورتیں ہیں اور ان سب سے ہلو ہائے کا رشتہ ہے، ان میں سے اکثر کو بچپن سے بڑوں کی عزت کرنا سکھایا گیا ہے، اس لیے بڑھاپے کا یہ فائدہ ہے کہ یہ سب میری لانڈری کرنے میں مدد کرنا چاہتی ہیں۔ اصرار کرتی ہیں کہ کپڑے وہ مشین میں ڈالیں گی اور نکالیں گی۔ کبھی کبھی جب میں تھکی ہوئی ہوتی ہوں تو انہیں مدد کرنے دیتی ہوں۔ ''جزاک اللہ خیر'' دعا سن کر وہ خوش ہو جاتی ہیں۔ اور مجھے بھی اچھا لگتا ہے کہ جیسے اپنوں کے درمیان ہوں۔

میں نے عراقی پڑوسن سے پوچھا ''آپ کی بہن کا پتا چل گیا؟'' وہ بہن کی خیریت کے لیے پریشان تھیں۔ انہوں نے بتایا ''ہاں میری بہن کا کیمپ اردن میں ہے مگر ہمارے خاندان کے دوسرے لوگوں میں سے کوئی زندہ نہیں بچا، میرے چچا کا سارا خاندان بمباری میں ختم ہو گیا تھا''۔ میں نے کہا ''امید ہے اب حالات بہتر ہو جائیں گے، اوباما عراق سے فوجیں واپس بلانے کی بات کر رہا ہے''۔ وہ بولیں ''ہاں وہاں تو لوگ بجلی، پانی اور ضروریاتِ زندگی کے لیے بھی اب تک پریشان ہیں۔ خدا کرے اب امن ہی قائم ہو جائے''۔

فلسطین کی رہنے والی لڑکی جو تعلیم کے لیے کینیڈا آئی تھی اب تعلیم مکمل کر کے کینیڈا کی شہریت لے چکی ہے مگر ابھی تک نوکری کی تلاش میں ہے۔ وہ بولی ''دیکھیے اوباما تو ایک انسان ہے اس کے پاس الہ دین کا چراغ نہیں ہے۔ ان حالات کو بدلنے کے لیے اب تو حضرت عیسیٰ کو آ ہی جانا چاہیے''۔

صومالیہ کی خاتون مجھے سب سے زیادہ پر امید اور خوش نظر آئیں ''وقت تو لگے گا مگر ان شاء اللہ حالات ضرور بدلیں گے اوباما فلسطین کے مسئلہ کی اہمیت سمجھتا ہے کہ یہ مسئلہ ختم ہوئے بغیر امن قائم نہیں ہو گا''۔

میں سوچنے لگی کہ یہ سب لوگ جو دور دراز ملکوں میں اپنے اپنے عزیزوں اور پیاروں کا غم لے کر جی رہے ہیں شاید صدر بش کو کبھی معاف نہ

کر سکیں۔ ہزاروں بے گناہ لوگ جن کا ان لیڈروں سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا اس طرح ہلاک ہوئے کہ ان کے خاندانوں کا بھی نشان مٹ گیا۔ ان کے کتنا دکھی اور تہذیبی ورثے تباہ ہو گئے۔ یہ لوگ سارے غم بھول کر کل کی امید اتنی جلدی کیسے کر سکتے ہیں۔ صرف حرفِ دعا کے ان کے پاس کل کے لئے کیا ہے؟“۔

میں نے رات کو ٹی وی کھولا تو عراق کی تاریخ کی بھیانک ترین رات نظر آئی۔ بش کے عہد کی آخری رات جب سارا عراق خون میں نہا گیا تھا ہر طرف لاشیں ہی لاشیں، معصوم بچوں، عورتوں اور جوان اور بوڑھے ہر عمر کے لوگوں کی لاشیں۔۔۔! مسجد، عمارتیں ہر طرف دھواں اور سڑکوں پر لال لال خون جو پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ ظالم طاقتوں نے سوچا کہ اس دن کو ظلم کی انتہا کا دن بنا کر یاد رکھیں۔ اس دن مجھے لگا کہ میں خود بھی کہیں عراق میں سانس لے رہی ہوں۔ اور ساری فضا سرخ ہو گئی ہے۔!

خدایا یہ رات ظلم کی آخری رات ہو اور کل نیا دن ہو جس کی تاریخ رقم ہو اوباما کے قدم اس عالیشان سفید گھر میں مبارک ہوں۔

اس رات ہر دکھی دل سے یہی دعا نکل رہی تھی وہ امریکی مائیں جن کے جوان بیٹے جنگ میں مارے گئے تھے، وہ مائیں جن کے بیٹے اپاہج ہو کر آئے تھے، کچھ جسمانی طور پر، کچھ ذہنی طور پر ہمیشہ کے لیے محرومی کا شکار ہو گئے تھے۔ وہ لوگ جو معاشی بدحالی کا شکار ہو کر بے گھر ہو گئے تھے۔ وہ جو بھاری قرضوں کے بوجھ تلے ضروریاتِ زندگی کے لیے پریشان تھے۔ اور ان امریکی شہریوں کے ساتھ ساتھ ساری دنیا کے غریب جن کا سب سے بڑا مسئلہ پانی، بجلی، دو وقت کی روٹی اور دوا علاج۔۔۔ اور روزگار کی تلاش ہے۔ یہ سب لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ اب برسوں پر پھیلا اندھیرا دور ہوگا اور اجالا آئے گا۔ کم از کم انھیں امن تو ملے گا۔

دوسرے دن برف باری تھم گئی صبح کی روشنی میں برف سے ڈھکے ہوئے سب درخت چاندی کے سے لگ رہے تھے۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں ٹی وی کے آگے بیٹھے تھے۔ ڈاؤن ٹاؤن میں جہاں جہاں بڑے اسکرین تھے لوگوں کا وہاں ہجوم غفیر تھا۔

سورج جب نصف النہار پر پہنچے گا تو ایک کنبہ پیچھے کے دروازے سے واپس جائے گا اور اسی لمحہ امریکہ کا ایک نیا صدر اوباما سفید گھر کے سامنے کے دروازے سے اندر داخل ہوگا۔ لوگ ساری دنیا میں اپنے اپنے ٹی وی کے آگے بیٹھے یہ محسوس کر رہے ہیں کہ اندھیرا جا رہا ہے اور اجالا آ رہا ہے۔! مگر کیا بش اپنے دور کا سارا اندھیرا سمیٹ کر لے جا سکیں گے؟۔

وہ بھیانک مسائل جو وہ چھوڑ کر جا رہے ہیں ان کے ساتھ ساتھ رخصت ہو سکیں گے؟ وہ تو اپنا ذاتی سامان ہی لے جائیں گے۔

وہ تاریخی لمحہ آ گیا۔۔۔ امریکہ کا نیا صدر اوباما اپنے کنبے کے ساتھ سفید عمارت میں داخل ہو رہا تھا۔ ساری دنیا کے لوگ اپنے اپنے ٹی وی سیٹ کے آگے خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ امریکہ کے جوان کالے اور گورے خوشی سے رقص کر رہے تھے۔ گا اور بجا رہے تھے۔

اس لمحہ میرے احساس کی آنکھوں کو سفید عمارت کے باہر خوفناک زہریلی سازشی مکڑیوں کے جالے نظر آئے اور میں نے ڈر سا محسوس کیا کہ ساری دنیا کے امن، آزادی، انصاف اور خوشی کے وہ خواب جو وہ ساتھ لے کر جا رہا ہے۔۔۔ ان مکڑیوں کے جالوں میں نہ پھنس جائیں۔

میں نے دعا کی کہ خدایا ان بچوں جیسی معصوم مسکراہٹ والے صدر کے قدم اس سفید گھر میں مبارک کرنا۔۔۔! اور اس کی حفاظت کرنا۔ مجھے لگا کہ میرے دل کے ساتھ مشرق اور مغرب کے سب دلوں کی دھڑکن اس دعا میں شامل ہے۔ وہ سب جو مشرق اور مغرب میں امن کا خواب دیکھ رہے ہیں اور زیتون کی شاخوں کو امن کی فاختاؤں کا انتظار ہے۔

(جنوری ۲۰۰۹)

☆

—بقیہ—

تیرگی کے سیلاب میں

ہماری محنت بھی ٹھکانے لگے۔ صاحب جی آپ کا مال تو کچھ ڈوب گیا۔ مگر اب ہم اس ادبی کشتی کو نکالیں گے ضرور“ آنکھ میچ کر مسکراتے ہوئے اس نے مطالبہ کیا۔

”کل پانچ سو روپے ہیں میرے پاس۔ تو وہ آپ لے لیں“۔ میں نے کوفت کو چہرے پر طاری نہ کرتے ہوئے جیب سے کچھ نوٹ نکالتے ہوئے ان سے جان چھوڑنے کیونکہ یہ کہاوت مجھے یاد تھا کہ

”ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی“

مگر بڑے صاحب نے نہایت حقارت سے میرا نوٹوں والا ہاتھ پرے کرتے ہوئے اور میری مٹھی بند کرتے ہوئے کہا۔ ”بابا پانچ لاکھ کا زیور اور نقدی کی قیمت پانچ سو روپے؟ واہ صاحب واہ“ اس نے انتہائی کڑوے لہجے میں تمسخرانہ انداز میں میری طرف دیکھا۔

”ایک لاکھ سے کم پر معاملہ نہ ہوگا۔ پروفیسر صاحب ابھی تو رات پڑی ہے۔ جائیے اطمینان سے سوچیے اور کل رقم لے آئیے۔ ورنہ ہم کھاتہ بند کر دیں گے“ اس نے اپنا ڈنڈا اپنے ہاتھ میں گھمایا۔

میں گھر لوٹ آیا۔ ابھی دن چڑھا تھا کہ میں بینک کے لاکر میں زیور رکھ آؤں اور نقدی جمع کرا دوں۔ مگر دن کی روشنی میں بھی مجھے بینک جانے سے خوف لگ رہا تھا۔ میرے ارد گرد لاقانونیت اور ناانصافی کی تیرگی کا سیلاب تھا اور میں۔۔۔ ایک انتہائی کمزور شہری۔۔۔ اس میں ڈوب رہا تھا۔

تیرگی کے سیلاب میں

سلطانہ مہر (برمنگھم، برطانیہ)

میں اخبار کے صفحوں کی سرخیاں دیکھنے کے بعد سنڈے میگزین میں اپنا پسندیدہ کالم ——— "ستاروں کی روشنی میں آج کا دن" پڑھنا چاہ رہا تھا کیونکہ یہ کالم میں ہمیشہ سب سے پہلے پڑھتا ہوں۔ لیکن آج چونکہ عراق کے سابق صدر صدام حسین کی گرفتاری کی خبر شہ سرخیوں کے ساتھ نمایاں تھی چنانچہ میں پہلے سرخیاں پڑھنے میں محو ہو گیا۔ گو میں نے گزشتہ شام اور پھر رات کی خبروں میں تفصیل جان لی تھی کہ وہ کس طرح گرفتار کیا گیا تھا۔ لیکن اخبار کی خبروں میں تصاویر کے ساتھ خبر پڑھنے کی نوعیت کچھ اور ہوتی ہے ——— چنانچہ صدام کی گرفتاری کی خبروں کا صفحہ پلٹ کر میں اپنے پسندیدہ کالم والے صفحے پر پہنچا اور فوری طور پر میری نظر aries یعنی برج حمل پر پڑی۔ میرا اور میری اماں کا برج بھی حمل ہی ہے۔ "آج کا دن آپ کی ذہانت کا دن ہے۔ ذہانت استعمال کریں گے تو آنے والی بلائیں ٹل جائیں گی ——— خوش خبری ملے گی لیکن ایک حادثہ ———"

ابھی میں پوری پیش گوئی پڑھ نہیں پایا تھا کہ اماں جو بہت دیر سے مجھے پکار رہی تھیں مجھ تک آن پہنچیں۔

"ارے میاں! سارا شہر ٹھنڈا ہو رہا ہے اور تم ابھی تک اخبار میں ہی منہ دیے بیٹھے ہو ———"

"اماں۔ منہ کہاں دیے بیٹھا ہوں۔ بس آج کی پیش گوئیاں پڑھ رہا تھا۔ کہ آپ نے حکم فرما دیا ہے۔ سو اب حکم حاکم کے مطابق ———" میں خاموش ہو گیا اور اخبار بند کر کے ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اور پھر جملہ پورا کیا۔

"میں اب حکم اماں کے مطابق حاضر ہوں۔"

"کتنی بار کہا ہے کہ ان پیش گوئیوں کو مت پڑھا کر۔ خواہ مخواہ آدمی بدگمان ہوتا ہے ——— ان موئی پیش گوئیوں نے بڑے بڑے خانے خراب کیے ہیں میاں۔ کوئی ان کے لکھنے والوں سے پوچھے کہ کم بختو اپنا حال جان کر خود تم نے اپنا بھلا کر لیا ———!"

"اماں ———" میں نے پیار میں ان کے کندھے ہولے ہولے دباتے ہوئے کہا "ہم کون سا ان پیش گوئیوں پر یقین رکھتے ہیں۔ بس دل بہلانے کو دیکھ لیتے ہیں۔ لیکن اماں قسم سے ——— کبھی کبھی تو ان میں سے بہت سی باتیں سچ نکلتی ہیں۔ جیسے آج آپ کے اور میرے ستاروں کے کالم میں لکھا ہے کہ "آج کا دن ذہانت استعمال کرنے کا دن ہے۔""

"ارے میاں ذہانت استعمال کرنے پر یاد آیا۔ میں نے بھی آج صبح ایک کام ذہانت کا کیا ہے" اماں تفصیل بتانے لگیں "بیٹو تو بیٹھے نہیں گھر میں۔ تمہاری آپا عابدہ اپنے زیور میرے پاس چھوڑ گئی تھی کہ میں سنبھال لوں۔ اور تم جو ہر ماہ جیب خرچ دیتے ہو اور کچھ بٹیا عابدہ دیتی ہے سو میں نے اس میں سے اچھی خاصی رقم جوڑ رکھی ہے وہ بھی میں نے ———"

اماں کا جملہ پورا ہونے سے پہلے میں نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور دوڑ میں آ کر ان کے کندھے چھوڑ کر انہیں گود میں اٹھا لیا ——— اور کہا۔

"اماں ——— میری اماں ——— آپ کب تک بچت کرتی رہیں گی۔ اب تو وقت آ گیا ہے کہ آپ دل کھول کر خرچ کریں۔ جو جی چاہے اور جس طرح چاہے۔ دیکھیے آپ کے ہاتھوں میں کانچ کی پرانی چوڑیاں ہیں۔ سونے کی بنوالیں اماں ——— عابدہ آپا بھی اسی شہر میں ہیں ان کو ساتھ لے جائیں یا پھر اپنی بھتیجی ثریا کو پکڑیں۔ کل پرسوں میں وہ میکے سے آ جائے گی۔ اسی شہر میں تو ہے وہ بھی۔ کون سا دور ہے" میں بولے جا رہا تھا اور اماں میری گود میں کسمسا رہی تھیں۔

"ارے اچھا پہلے مجھے گود سے اتار تو ——— اللہ تیرے بازو رہ جائیں گے۔ ڈیڑھ من کا وزن اٹھا رکھا ہے" وہ بہت پیار میں "تم" سے "تو" پر آ گئیں۔

میں نے انہیں گود سے اتارا اور ان کی چاندی روشن پیشانی کو بوسہ دیا اور لاڈ کرتے ہوئے کہا۔

"اماں آپ ڈیڑھ من کی کہاں ہیں ——— آپ تو پھول سی ہیں۔ میری اماں تو گلاب کا ——— نہیں نہیں جوہی کا ——— نہیں تو موگرا کا سا گجرا پھول بھی نازک ہیں" میں کہے جا رہا تھا اور اماں ماتھے پر ہاتھ دھر کر سوچ رہی تھیں۔ پھر ہنس کر بولیں۔

"دیکھو میں کیا کہہ رہی تھی۔ سب بھلا دیا تم نے" انہوں نے میری طرف دیکھا اور پھر ہنس کر بولیں۔ اب میں "تو" سے "تم" ہو گیا تھا۔

"اچھا چلو ناشتہ کر لو۔ چائے ٹھنڈی ہو گئی ہو گی۔ میں اب تازہ دم کرتی ہوں"۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور مسکراتے ہوئے ناشتے کی میز کی طرف بڑھیں۔ پھر یکا یک رک گئیں اور کہنے لگیں۔

"ارے ہاں یاد آیا گھر میں اب ایک بھی موم بتی نہیں بچی۔ روز ہی لوڈ شیڈنگ ہوتی ہے اور گھنٹوں کے لیے بجلی چلی جاتی ہے۔ یہ شہر کراچی جو کبھی روشنیوں کا شہر تھا اب تیرگی کے سیلاب میں غرق ہوتا جا رہا ہے۔ میاں آج بہت سی موم بتیاں لے آؤ۔ دن تو گزر جاتا ہے مگر رات کو بڑا خوف آتا ہے۔"

انہیں باورچی خانے کی طرف جاتے دیکھ کر میں نے کہا۔

"اماں ابھی چائے نہ بنانا۔ میں نہا کر آ جاؤں۔ پھر اکٹھے بیٹھیں گے۔ آج جمعہ بھی ہے۔ مجھے مسجد میں جمعہ پڑھنے جانا ہے ———" میں غسل

خانے کی طرف بڑھا۔

"ارے بیٹا" اماں نے میرا راستہ روک لیا اور گھبرا کر بولیں۔

"نہ نہ۔۔۔ بیٹا مسجد نہ جیو۔ گھر میں ہی جمعہ پڑھ لیجیو۔ کچھ بھروسہ نہیں۔ کوئی اور بم پر کسی کا نام نہیں لکھا ہوتا۔ آج کل مسجد میں نمازیوں پر بم پھینکے جا رہے ہیں۔"

"اماں۔۔۔" میں نے اماں کے الفاظ کو کھینچتے ہوئے کہا۔

"آپ تو اللہ پر یقین رکھتی ہوں۔۔۔ موت جہاں آنی ہے سو تو آئے گی اماں"۔

"ہاں بیٹا مگر۔۔۔" اماں نے میری بات کاٹ دی اور سمجھانے والے انداز میں کہنے لگیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہی کہا ہے کہ جہاں خطرہ ہو وہاں جان جوکھوں میں نہ ڈالو۔۔۔ بیٹا۔۔۔ میں تیری طرف سے اللہ میاں سے معافی مانگ لوں گی۔ ماں ہوں میں تیری۔ تو جمعہ گھر میں پڑھ لے بیٹا۔ مسجد نہ جانا۔۔۔" اماں گڑگڑانے لگیں۔۔۔"

"اچھا اماں۔۔۔ نہیں جاؤں گا۔۔۔ نہیں جاؤں گا۔ اتنی گھبراؤ مت میری اماں جانی۔۔۔" میں نے انہیں دلاسہ دیا۔ وہ چپ ہو گئیں۔ انہیں پتہ تھا ان کا بیٹا ان کے حکم سے باہر نہیں۔ ان کا کہا میرے لئے خدا کے فرمان سے کم نہ تھا۔ بھری جوانی میں بیوہ ہو جانے والی میری ماں نے میری بڑی بہن عابدہ اور میری پرورش جی جان سے محنت کر کے کی تھی۔ وہ تھوڑی بہت پڑھی لکھی تھیں۔ سلائی کا ہنر جانتی تھیں۔ اپنی جوانی اور آنکھوں کی جوت جلا کر انہوں نے ہمیں ایک کامیاب زندگی دی۔ انہوں نے زندگی کی کڑی دھوپ خود سہی اور ہمیں چھاؤں میں لا بٹھایا۔ آج میں اپنے وطنِ عزیز کے ایک علمی ادارے میں معزز عہدے پر تھا۔ اور یہ عزت میری اماں کی محنت اور دعاؤں نے عطا کی تھی۔ عابدہ بھی ایک اچھے گھر میں بیاہی گئی تھی۔

غسل کرتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اخبار کی پیش گوئی کے مطابق آج میری ذہانت کا امتحان تھا اور آنے والی بلا ٹل سکتی تھی۔ اور۔۔۔ لیکن وہ بلا کیا ہو سکتی تھی۔۔۔؟

میں نے پوری پیش گوئی پڑھی ہی نہ تھی۔۔۔ اماں کے بلانے پر اخبار لپیٹ کر نکل پڑا تھا۔ اب نہا کر ناشتہ کرتے ہوئے میں وہ پوری پیش گوئیاں پڑھ لوں گا۔۔۔ میں نے خود سے کہا اور پھر آپ ہی آپ ہنسا۔

میں یونیورسٹی کا پروفیسر۔۔۔ کن لغویات میں پڑا ہوں۔ یہ پیش گوئیاں بھلا کیا رہنمائی کرتی ہیں۔۔۔؟"

"لیکن میں بھی رہنمائی کے لیے نہیں کب پڑھتا ہوں۔۔۔؟" میں نے خود ہی اپنا دفاع بھی کیا۔

"یہ تو دل بہلاوے کے لیے تھوڑی سی تفریح اور توجہ ہٹانے کے لیے بہ موثر ہتھیار ہیں۔ ورنہ اب اخبار میں ہوتا کیا ہے پڑھنے کے لیے۔ خون خرابے کی خبریں۔ قتل و غارت گری اور ڈاکوؤں کے ہولناک واقعات۔ آج اتنے لوگ قتل کر دیئے گئے۔ اتنی لاشیں اٹھیں۔ میرے وطن کا کوئی شہر اور کسی بھی شہر کا کوئی گلی کوچہ اب محفوظ نہیں تھا۔ ہم کس سے فریاد کریں اور کس سے منصفی چاہیں۔ دکھ بھری خبروں کو ذہن سے جھٹک کر میں نہا کر باہر نکلا تو باہر میرا اچھا یار شعیب بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا۔

"میں اس لئے آیا ہوں کہ آج جمعہ کی نماز ساتھ پڑھیں گے۔۔۔"

"نہیں شعیب۔ آج نہیں۔ میں جمعہ گھر میں پڑھ لوں گا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ مجھے گھر واپس آنا ہے۔ مجھے گھر پر کچھ ضروری کام بھی ہے۔ میں باہر نہیں جانا چاہتا۔۔۔" میں نے اسے ٹال دیا۔ میں اماں کی پریشانی کا اس سے ذکر کرنا نہیں چاہتا تھا۔۔۔

"تو پھر اجازت دو۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اماں نے اسے چائے کے لیے پوچھا مگر اس نے معذرت کر لی۔ میں نے اماں سے کہا۔ میں شعیب کو سڑک تک رخصت کر کے آتا ہوں۔ اماں نے مجھے دیکھا۔ ان کی نظریں کچھ کہہ رہی تھیں۔۔۔ اور میں ان نظروں کا مفہوم سمجھ رہا تھا۔۔۔ میں نے انہیں اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

"اماں میں بس ابھی آیا۔ فکر نہ کرنا اماں۔ نماز میں گھر آ کر ہی پڑھوں گا۔۔۔" اور میں شعیب کے ساتھ باہر نکل گیا۔ وہ مجھے کچھ پریشان نظر آ رہا تھا۔ میرے پوچھنے پر شعیب نے مجھے بتایا کل اس کی گلی میں ڈھاٹا باندھے ہوئے دو آدمی اسے پستول دکھا کر خاموشی سے گھر لے آئے اور جو کچھ زیور اور ایک لاکھ روپے گھر میں رکھے تھے سب سمیٹ کر لے گئے۔۔۔

"تم نے پولیس کو خبر کیوں نہیں کی؟"

"فائدہ کیا؟" وہ بے بسی اور کمزوری سے بولا۔ "پولیس تو مزید دہشت کا تقاضا کرتی اور سراغ بھی لگاتی تو یہ کہ۔۔۔ اور کیا کچھ ہمارے پاس گھر میں ہے۔۔۔" اس نے دکھ سے کہا۔

مجھے یہ سن کر بالکل حیرت نہ ہوئی۔ ہم لاقانونیت کے اندھیروں میں اس طرح گزر بسر کر رہے تھے کہ مجبور تھے۔ جاتے کہاں؟

"تم نے اتنی نقدی گھر میں کیوں رکھی تھی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ارے بھائی۔ شام تمہاری بھابھی سلمیٰ نے محلے کی عورتوں کے لئے کمیٹی کی تقریب رکھی تھی۔ آخری کمیٹی تھی۔ سلمیٰ نے کہا تھا۔ رات رات گھر میں رقم رکھی رہے گی۔ پھر اس وقت تو بینک بھی بند ہو گئے تھے۔ میں نے سوچا صبح ہی بینک میں جمع کرا دیں گے۔۔۔ اور صبح صبح جب ڈاکو لوٹنے نکلا تو یہ حادثہ

پیش آ گیا۔" شعیب بہت رنجیدہ ہو رہا تھا۔ ہم مڈل کلاس لوگ آنہ پائی جمع کر کے اپنی خوشیوں کا گھروندا تیار کرتے ہیں کہ کوئی آ کر لوٹ لے جاتا ہے اور آناً فاناً ہمارا گھروندا ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔

ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے دور تک نکل آئے۔ ایک گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا مگر باتوں میں وقت کا پتہ نہ چلا۔۔۔ میں نے گھڑی دیکھی اور شعیب کو مسجد والی گلی میں چھوڑ کر اپنے گھر کی طرف چلا۔۔۔

میرا فلیٹ پہلی منزل پر تھا۔ دروازے پر پہنچ کر میں نے گھنٹی بجائی۔ ایک دو تین۔۔۔ اور پھر کوئی جواب نہ پا کر میں نے دروازے کو دھکا دیا۔ دروازہ بھڑا ہوا تھا فوراً کھل گیا۔۔۔ میں گھبرا کر اندر داخل ہوا۔ ڈرائنگ روم سے اندر کی طرف آیا تو عجیب سی اتھل پتھل نظر آئی۔ آگے بڑھا تو بستر کے گدے مڑے ہوئے اور تکیے ادھڑے ہوئے تھے۔ الماریاں کھلی ہوئی تھیں اور کپڑے بکھرے ہوئے۔۔۔ اور اماں؟

میری اماں زمین پر اوندھی پڑی تھیں۔ میں بدحواس ہو گیا۔ اماں کو میں نے ہوش میں لانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ انھیں بروقت گاڑی میں ڈال اسپتال بھاگا۔ ڈاکٹروں نے بتایا ان پر دل کا دورہ پڑا ہے۔ میں نے ثریا اور عابد کو فون کیا۔ وہ اسپتال دوڑی آئیں۔ اماں کو "آئی سی یو" میں رکھا گیا تھا۔ میں پریشان تھا کہ اب تو شہر کراچی کے دن بھی تیرگی کے سیلاب میں ڈوب چلے تھے۔

کیسا اندھیر تھا۔ کوئی فریاد سننے والا نہ تھا۔ حاکم شہر بھی کیا بے خبری میں لمبی نیند سو رہا تھا۔

ثریا نے گھر جا کر چیزیں سمیٹیں۔ ڈاکوؤں نے مال غنیمت سمیٹنے کے لیے سب کچھ ادھیڑ دیا تھا۔ میں حیران تھا کہ ایک گھنٹے میں وہ آئے اور چلے بھی گئے۔ گھر کی بڑی چیزیں جیسے ٹی وی، وی سی آر، ڈی وی ڈی اور کیسٹ پلیئر سب محفوظ تھے۔ ہاں الماری میں اماں کے ہاتھ کا رکھا ثریا کا زیور غائب تھا اور نقد رقم بھی۔ ثریا ہاتھ مل رہی تھی کہ اس نے زیور اماں کو کیوں دیا کہ سنبھال لیں۔ بینک لاکر سے وہ صرف ایک دن کے لیے شادی کی تقریب میں پہننے کے لیے لائی تھی۔۔۔ اس کی بری اور جہیز کے دو سیٹ، منہ دکھائی میں ملنے والی ہیروں کی انگوٹھیاں۔۔۔ شادی کی پہلی سالگرہ پر میری طرف سے دیا گیا خوبصورت کنگن جیسی سیٹ اور قیمتی دو چوڑیاں۔۔۔ اور چھوٹے موٹے زیور جو عام طور پر عورتیں روزمرہ پہننے کے لیے گھر میں رکھتی ہیں۔

میں بھی جانتا تھا کہ ہم سفید پوش لوگ پیٹ کاٹ کر بہانے بہانے چھوٹا موٹا زیور بنا لیتے ہیں جو زندگی بھر ہمارے پاس رہتا ہے اور یہی زیور گھر عورتوں کے بچوں کی شادیوں پر چڑھاوے کے کام بھی آتا ہے۔ اتنا زیور بنانے کیلئے برس چاہئیں اور کئی خوشیوں اور خواہشوں کی موت بھی۔۔۔ لیکن اب تو وہ دولت ہوا ہو چکی تھی۔

ثریا نے خود سے عہد کر لیا تھا کہ اب کبھی سونے کے زیور نہیں بنوائے گی اور وہ ملمع کاری کا زیور ہی پہنے گی۔ اس کا یہ عہد اس لاقانونی معاشرے میں رہنے کے خلاف صرف احتجاج ہی نہ تھا "مجبوری" بھی تھی۔۔۔

ہمیں اماں کی فکر تھی۔ میں جانتا تھا کہ مال و زر کی اس چوٹ سے میں جلد جانبر ہو سکوں گا مگر میں اماں کو اس نقصان سے آگاہ نہ کر کے انھیں اس صدمے سے بچائے رکھنا چاہتا تھا۔ انسان جب ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے تو اپنے خدا کی رحمت کے دامن میں پناہ گزیں ہو جاتا ہے چاہے اس کا تعلق کسی مذہب سے ہو۔۔۔ میں نے بھی اس کی رحمت کو پکارا۔ کچھ دیر بعد میری اماں ہوش میں آ چکی تھیں۔

اور آج ان کے اسپتال سے رخصت ہو کر گھر آنے کا پہلا دن تھا۔ میں ان کی پائنتی بیٹھ کر ان کے تلووں کو سہلاتے ہوئے ان کے پیروں کے نیچے جنت میں اپنا گوشہ تلاش کر رہا تھا کہ چونکا۔

ثریا اماں کے سرہانے کان لگائے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوشی رقص کر رہی تھی۔۔۔ پھر وہ دوڑ کر گئی۔۔۔ اور تھوڑی دیر بعد جب وہ لوٹی تو اس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی۔۔۔

اماں نے اسے بتایا تھا انھوں نے چاولوں کے بڑے کنستر میں سارا زیور اور نقدی ایک پوٹلی میں باندھ کر چھپا رکھی تھی۔

"اماں۔۔۔ وہ چیز کوئی یاد ہے۔ ذہانت والی۔۔۔" میں نے شوخ لہجے میں پوچھا۔

"ارے ہٹ۔۔۔" اماں مسکرا کر بولیں۔ "وہ علم تو بے ثمر تھی۔ ویسے ذہانت بڑی نعمت ہے بیٹا۔ اگر وقت پر اس نعمت سے کام لیا جائے تو۔۔۔"

اس طرف سے اطمینان ہونے پر میں نے سوچا پولیس میں رپورٹ ضرور لکھوا دی جائے کیونکہ یہ قانون کا تقاضا بھی تھا اور ایک امید بھی کہ پولیس کے تعاون سے اس شہر کی رعایا لوٹ مار کے عذاب سے محفوظ رہے گی۔ چنانچہ میں نے محلے کے تھانے میں جا کر رپورٹ لکھوا دی۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ میری اماں نے اپنی ذہانت سے کام لے کر زیور اور نقدی چھپا کر رکھ دی تھی۔ جو محفوظ رہی۔ پولیس اسی دن میرے گھر آئی۔ انھوں نے ایک ایک چیز کا جائزہ لیا۔ اعمال نامہ لکھا اور دوسرے دن مجھے تھانے بلا لیا۔

"چوروں کا تو ہم نے سراغ لگا لیا ہے" ان کے آفیسر نے مجھ سے کہا کہ اب پولیس پارٹی جلد ان تک پہنچے گی اور ان سے مال بھی حاصل کر لے گی۔ مگر بابو جی۔۔۔ وہ کچھ دیر رکے اور بولے۔ کچھ نذر ہمیں بھی تو دیں کر

باقی صفحہ نمبر ۶۸ پر ملاحظہ کیجیے

سمتوں کا تعین

نسیم احمد (حیدرآباد دکن)

مہمانوں کی آمد شروع ہو چکی تھی۔

سب سے پہلے بیگم عرفان آئی تھیں۔ اُن کے ساتھ اُن کی جواں سال خوبصورت بیٹی شبانہ بھی تھی جو اُن کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ بیگم عرفان کی کاٹھی غضب کی تھی' وہ شبانہ کی ماں نہیں بہن لگتی تھیں' اس وقت بھی ہمیشہ کی طرح شاہانہ طمطراق اُن کی چال ڈھال سے جھلک رہا تھا۔

انھوں نے کیمبرج ڈائزائن کی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی' جس کا نچلا حصہ ہلکا سیاہ تھا اور اوپری حصہ سرخ زردوزی کا اعلیٰ کام بڑی نفاست اور نزاکت سے کیا گیا تھا۔ خصوصاً ساڑھی کے پلو پر بنا ہوا مور جو کام تھا کہ نقوش ابھر رہی تھی۔ اپنے دائیں ہاتھ کو ذرا سا پھیلا کر انہوں نے ساڑھی کے پلو کو تھام رکھا تھا جیسے کسی فیشن شو میں کوئی ماڈل گرل چلتے چلتے رک گئی ہو۔

کسی گوشے سے نکل کر مسز سریتا سنگھ اُن کے قریب چلی آئیں۔

''بیگم عرفان آپ تو غضب ڈھا رہی ہیں۔ اتنی عمدہ ساڑھی کہاں سے خریدی؟''

''جیا ایکسکلیوژن سے'' وہ فوراً بولیں۔ لیکن قدرے انھیں ملامت کا احساس ہوا' ''یونہی ادھر اُدھر چلی گئی تھی۔ یہ ساڑھی شوکیس میں لگی تھی۔ عرفان کو بھی اچھی لگی۔ انہوں نے فوراً خرید لی۔''

سریتا سنگھ توصیفی نظروں سے اُن کو دیکھتی رہیں۔ سریتا سنگھ ایک بہت بڑے اسکول کی مالک تھیں۔ طلباء کی تعداد ہزاروں میں تھی کئی سال پہلے مسٹر سنگھ نے جب اپنا ملازمت کا عہدہ' ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر کا عہدہ ترک کر کے اسکول کھولا تھا تب طلباء کی تعداد سینکڑوں میں بھی نہیں تھی۔ مسٹر سنگھ اب دنیا میں نہیں رہے لیکن اسکول ترقی کر گیا تھا۔

اس پارٹی کا اہتمام مسز علی عباس نے کیا تھا۔ مسز علی عباس معمر تھیں اور کافی دولت مند تنہائی' اکیلے پن سے اکتا جاتیں تو اکثر ایسی پارٹیوں کا اہتمام کر لیتیں۔ مدعوین کی تعداد محدود ہوتی لیکن سب کا شمار معززین میں ہوتا۔ اکثریت خواتین کی ہوتی۔ مرد خال خال نظر آتے۔

مسز علی عباس نے ایک اجنبی عورت سے ان دونوں کا تعارف کرایا اور بولیں۔ ''یہ مسز فرنڈلیس ہیں۔ مسز جارج فرنڈلیس۔''

سریتا سنگھ نے مصافحہ کیا اور مسکرائیں۔ ''جارج فرنڈلیس وہی تو نہیں جو منسٹر رہ چکے ہیں۔''

''ارے نہیں بھئی۔'' مسز جارج فرنڈلیس نے انکساری سے جواب دیا۔ ''وہ تو بہت بڑے آدمی ہیں۔ میں تو ایک بیوٹی ہوم چلاتی ہوں۔''

''ہاں نام تو سنا ہے'' بیگم عرفان بولیں۔ ''لیکن کبھی دیکھا نہیں۔''

''نام ہی سنا ہوگا'' مسز جارج فرنڈلیس بذلہ سنجی پر اتر آئیں۔

''اب اس عمر میں کسی بیوٹی ہوم جانے کی ضرورت کہاں پیش آتی ہے''

سب نے ایک دبا دبا سا قہقہہ لگایا۔ بیگم عرفان پہلے ذرا جھینپیں اور پھر وہ بھی ان قہقہوں میں شامل ہو گئیں۔

وہ سب جانے کا سوچ رہے تھے کہ محفل منعقد ہوئی تھی اس موقع کو گنوائیں۔

مسز فرنڈلیس بولیں۔ ''میں اپنے بیوٹی ہوم کو وسیع کر رہی ہوں۔ نئی عمارت تعمیر ہو چکی ہے۔ جس میں (۴۰) رومس اور (۱۰۰) کاسمیٹیکس ہیں۔ عنقریب افتتاح ہونے والا ہے۔ میں آپ لوگوں کو مدعو کروں گی۔ ضرور تشریف لائیے۔''

''ضرور آئیں گے'' سریتا سنگھ نے جواب دیا۔ ''اپنی تجارت کو وسعت دینا کا حق صرف بڑے لالا یا شیم پریم جی کو نہیں ہم سب کو ہے۔ ہم دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت میں سانس لے رہے ہیں۔ میں بھی اپنے اسکول کے لیے عمارت تلاش کر رہی ہوں۔''

شبانہ ایک جھٹکے سے اپنا پرس اٹھا کر کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب تک اُن لوگوں کی گفتگو شبانہ نے سنی تھی اور بور ہو رہی تھی۔ ایسی باتوں سے اس کو الجھن ہوتی تھی۔ وہ بہت کم ایسی محفلوں میں دکھائی دیتی تھی۔ آج بھی کچھ اور وجہ سے یہاں آئی تھی۔

دراصل شبانہ کو اُس نوجوان کی تلاش تھی جس کو کچھ دن پہلے اس نے مسز علی عباس کے ساتھ دیکھا تھا وہ کون تھا؟ مسز علی عباس سے اُن کا کیا رشتہ تھا؟ شبانہ نہیں جانتی تھی۔ شبانہ نے دونوں دفعہ مسز علی عباس کو سلام کیا تھا تو اُس نے بھی جھٹ شبانہ کو سلام کر دیا تھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ اس وقت اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ چہرے پر مسکراہٹ تھی' آنکھوں میں مسکراہٹ تھی' ایسی سحر انگیز مسکراہٹ جس کی تہہ سے محبت کی شعاعیں طلوع ہو رہی تھیں۔

اب شبانہ کو اسی کی تلاش تھی۔

ٹہلتے ٹہلتے وہ کھلے حصے میں نکل آئی جہاں سے آسمان صاف نظر آ رہا تھا وہ ایک چھوٹا مختصر سا برآمدہ تھا جس کو باغیچہ میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ نیچے ہری ہری دوب بچھی ہوئی تھی۔ ہرے بھرے خوبصورت پودوں کو قطار کی صورت میں سلیقہ سے رکھا گیا تھا۔ جون کا مہینہ چل رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی تیز ہواؤں نے جس کا گھونٹ دیا تھا۔ لیکن وہ شادابی نے اپنے پاؤں دھرتی پر ابھی نہیں رکھے تھے۔ بادلوں کے جھنڈ کے جھنڈ کہیں سے امنڈ آتے اور پھر کہیں چلے جاتے۔ آسمان کچھ دیر کے لیے بجھتا اور پھر روشن ہو جاتا۔ شبانہ کو موسم کی ایسی آنکھ مچولی اچھی لگتی تھی۔

شبانہ نے اپنے سینڈل اتار دیے اور ننگی دوب پر چلنے لگی۔ ایک

خوشگوار ٹھنڈک کا احساس سارے بدن میں سرایت کر گیا۔ اسی لمحے ایک بہت بڑا غبارہ اڑتا ہوا ادھر آیا۔ غبارے کے پیچھے سات آٹھ سال کا لڑکا لپکا۔ لڑکے نے غبارے کو اپنے دونوں ہاتھوں سے اٹھایا۔ اندر واپس جاتے جاتے وہ شبانہ کو دیکھ کر رکا اور حیرت سے بولا۔ "آپ یہاں کھڑی ہیں۔ اندر لوگ کھانے کے لیے جا رہے ہیں۔"

شبانہ کے جواب دینے سے پہلے ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ "میں بھی یہی کہنے کے لیے آیا ہوں۔"

سامنے وہی کھڑا تھا جس کو شبانہ کی نگاہیں تلاش کر رہی تھیں۔ چہرے پر وہی مسکراہٹ جو دل کے نازک گوشوں کو کریدتی ہے۔

شبانہ مسکرائی۔ "یہاں پر بہت سکون محسوس ہو رہا تھا۔ اس لئے ادھر چلی آئی۔"

"غلط" وہ اعتماد سے بولا۔ "آپ کی آنکھیں بتا رہی ہیں کہ آپ کسی کو تلاش کر رہی ہیں۔"

عورتیں کبھی دھنک پر اپنے دل کا دروازہ نہیں کھولتیں۔ شبانہ اعتراف کر لیتی تو اس کی کمزوری ظاہر ہو جاتی۔ اس لئے بیان نہیں کیا اور کہا۔ "آپ نے کس بنیاد پر ایسی بات کہی ہے؟ یا پھر یوں ہی اندھیرے میں تیر چھوڑا۔"

"اندھیرے میں تیر چھوڑنے کا فن مجھ کو نہیں آتا۔" اس نے جواب دیا۔ "لیکن میری قیاس آرائیاں بہت کم غلط ثابت ہوتی ہیں۔ تھوڑا بہت چہرہ شناس بھی ہوں۔"

کچھ کہنے کے بجائے شبانہ نے اس کو سلام کیا اور بولی۔ "میرا نام شبانہ ہے۔"

وہ فوراً بولا۔ "میں جانتا ہوں۔ آپ شبانہ عرفان ہیں گریجویشن کر چکی ہیں اور اب ایم اے کرنا چاہتی ہیں۔ عباس آنٹی نے مجھ کو سب کچھ بتا دیا ہے آپ کے بارے میں۔ آپ کے ڈیڈی کے بارے میں۔ آپ کی ممی کے بارے میں۔۔۔!"

شبانہ لرز کر رہ گئی۔ یکلخت اس کا ضمیر بیٹھ سا گیا۔ آخر کار وہی ہوا جس کا اسے خدشہ تھا۔ جس ماضی سے وہ فرار چاہتی تھی وہی ماضی بار بار کسی نہ کسی موڑ پر آن کھڑا ہوتا تھا۔ لگتا تھا کہ صرف شبانہ بن کر جینا اس کے لیے دوبھر ہے۔ اس کے نام پر، اس کی شخصیت پر، اس کے وجود پر "عرفان" کا لفظ یوں رقم کر دیا گیا تھا جیسے پرانے زمانے میں جابر حکمراں اپنے غلاموں کے جسموں پر، اپنے پالتو جانوروں کی کھال پر دہکتی ہوئی آہنی سلاخوں سے نشانیاں کندہ کر دیا کرتے تھے۔

شبانہ کے منہ پر تالا سا پڑ گیا۔ اس کے بعد وہ اس سے دور دور ہی رہی اور جلدی ہی پارٹی سے لوٹی۔

گھر پہنچ کر بستر پر لیٹتے ہی شبانہ کا موبائل بجا۔ موبائل پر وہی بول رہا تھا۔ "میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟"

"نہیں" شبانہ نے کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد جواب دیا۔ شبانہ کو احساس ہوا کہ وہ مسز علی عباس کے توسط سے اس کے بارے میں بہت کچھ جان گیا ہے۔ موبائل نمبر بھی مسز علی عباس نے دیا ہوگا۔ شبانہ نے پوچھا۔ "آپ آنٹی کو کب سے جانتے ہیں؟"

اس نے جواب دیا۔ "شاید آپ جانتی ہوں گی کہ آنٹی کا بڑا بیٹا ظہیر عباس کینیڈا میں مقیم ہے۔ جب آنٹی اپنے بیٹے سے ملنے کینیڈا جا رہی تھیں تب میں ہوائی جہاز میں ان کا ہمسفر تھا۔ وہ پہلی بار کینیڈا جا رہی تھیں اس لئے کچھ پریشان تھیں۔ میں نے تھوڑی بہت مدد کر دی تو وہ مہرباں ہو گئیں۔ جب تک کینیڈا میں رہیں مجھ سے اکثر ملتی رہیں۔ میں جب واپس آ رہا تھا تب اتفاقاً وہ بھی میرے ہمسفر تھیں۔ یہاں آنے کے بعد بھی میں ان سے اکثر ملتا رہتا ہوں۔ میری ماں نہیں ہے اور ان کا بیٹا یہاں نہیں رہتا۔ اس لئے وہ میری ماں بن گئیں اور میں ان کے لیے ظہیر عباس۔۔۔"

وہ فقرہ پورا کر گیا اور شبانہ دم بخود سی رہی۔ اس نے مزید کہا۔ "سوری میں نے آپ کی نیند اڑا دی۔ میں پھر فون کروں گا۔" موبائل خاموش ہو گیا۔ شبانہ دیر تک موبائل ہاتھ میں لئے بیٹھی رہی۔ "میں پھر فون کروں گا" اس کا یہ آخری فقرہ بہت معنی خیز تھا۔ وہ کچھ لمحوں کے بعد فون کر سکتا تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد فون کر سکتا تھا۔ ایک دن، ایک ہفتہ یا پھر ایک ماہ کے بعد فون کر سکتا تھا۔ شبانہ نے اس کے فون کا انتظار نہیں کیا۔ کیونکہ وہ بہت تیز رفتاری سے اس کی زندگی میں داخل ہو رہا تھا اور شبانہ کو تیز رفتاری پسند نہیں تھی۔ اس کے مزاج میں ٹھہراؤ تھا۔ عجلت پسندی نہیں تھی۔ پھونک پھونک کر، سوچ سوچ کر قدم اٹھاتی تھی۔ تیز رفتاری میں سمتوں کا تعین غلط بھی ہو سکتا تھا۔ بہت پہلے اس کے ماں باپ نے تیز رفتاری سے کام لیا تھا جس کے نتائج شبانہ بھگت رہی تھی۔

۲۵/۲۶ سال پہلے چندر موہن اور ریشماں قریشی نے نظام کالج کے کلاس روم میں، وہاں کی لائبریری کے ہال میں، وہاں کے کھلے میدان میں اپنی محبت کی دنیا بسائی تھی اور پھر چندر موہن عرفان احمد بن گیا اور ریشماں قریشی بیگم عرفان اور دونوں کی محبت کا ثمرہ تھی شبانہ۔ آج اس کو احساس ہو رہا تھا کہ ماں باپ نے اس کی زندگی میں زہر گھول دیا ہے۔ وہ اپنے معاشرے، اپنے اطراف و اکناف کی دنیا سے کٹ کر رہ گئی تھی۔ وہ اپنے ننھیال میں مکمل اجنبی تھی اور ددھیال میں۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔

اس کا فون تو نہیں آیا وہ خود اچانک چلا آیا۔ مسز علی عباس کے ساتھ۔ اتفاقاً شبانہ کے والدین گھر پر نہیں تھے۔ مسز علی عباس کچھ افسوس سے کہنے لگیں۔ "غلطی میری ہے۔ میں اچانک چلی آئی۔ مجھ کو پہلے فون کر لینا چاہیے تھا۔"

شبانہ نے اخلاقاً کہا۔ ''آپ اطمینان سے تشریف رکھیں۔ یہ گھر آپ کا ہے اور گھر والوں کو اپنے گھر آنے فون کی ضرورت نہیں رہتی۔ میں ممی اور ڈیڈی کو فون کر کے بلا لیتی ہوں۔''

''نہیں۔ تم ان کو ڈسٹرب مت کرنا۔'' مسٹر علی عباس نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں اس کو تمہارے ماں باپ سے ملانا چاہتی تھی۔ یہ میرا بیٹا نہیں ہے لیکن ظہیر عباس کی طرح مجھ کو عزیز ہے اور ـــــــ''

اس نے فوراً مسٹر علی عباس کی بات کاٹ دی۔ ''آنٹی پلیز ہم لوگ عرفان انکل اور آنٹی کی موجودگی میں گفتگو کریں گے۔'' وہ رک گیا اور کچھ کاغذات شبانہ کے ہاتھ میں تھما دیے۔ ''میں یہ فارمس آپ کے لیے لایا ہوں پوسٹ گریجویشن کورس کے لیے فارم داخل کرنے کی آخری تاریخ قریب آ چکی ہے اس میں دو یونیورسٹیوں کے فارمس ہیں۔ ایک عثمانیہ یونیورسٹی اور دوسری JNTU کے ہیں۔ مناسب رہیگا کہ آپ JNTU میں فارم داخل کریں اور میرا مشورہ ہے کہ آپ انگلش لٹریچر یا پھر سائیکالوجی سے ایم اے کریں۔ آج کل ان سبجکٹ کی طرف طلبا توجہ نہیں دے رہے ہیں۔''

ایک دوستانہ انداز میں اس نے مشورہ بھی دیا اور اپنی خواہش بھی ظاہر کر دی تھی۔ شبانہ کاغذات لے کر پڑھنے لگی۔

وہ دونوں چلے گئے۔

رات کو فارم پُر کرتے وقت اچانک اس کا قلم رک گیا۔ فارم میں اس کا اپنا نام درج کرنے کے بعد باپ / شوہر کا نام لکھنا تھا۔ شبانہ کو یاد آیا کہ اب تک اس نے اس کا نام بھی نہیں پوچھا تھا۔ شبانہ نے موبائل اٹھایا اور اس کا نمبر ملایا اور بولی۔ ''اب تک آپ نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ میں آپ کا نام تک نہیں جانتی۔''

''تعجب ہے'' حسب عادت وہ ہنستا گیا۔ ''میں تو سمجھ رہا تھا کہ میرا سارا تاریخ جغرافیہ آنٹی نے بتا دیا ہوگا۔ چلئے میں اب بتا دیتا ہوں۔ تین سال پہلے میں نے ایم بی اے کیا تھا۔ کینیڈا میں میرا اپنا چھوٹا سا کاروبار ہے آپ نے JNTU کے انگریزی کے ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ ودیہ پرکاش کا نام سنا ہوگا۔ میں ان ہی کا لڑکا ادتیہ پرکاش ہوں میں نے آنٹی کو بتا دیا ہے کہ میری شادی اسلامی طریقے سے ہوگی۔ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔''

شبانہ کے ہاتھ سے قلم اور کاغذات چھوٹ گئے۔ کمرے میں بڑی تیز رفتاری سے ایک بھونچال سا آ گیا تھا۔ ٹیبل لیمپ بجھ گیا تھا۔ سامنے کی میز سرکتی ہوئی دور نکل گئی تھی۔ کمرے کے ایک کونے میں رکھا ہوا پنکھا گردش کرنے لگا۔ اسی نے کام کرنا بند کر دیا اور اس فرتھری میں وہ مفلوج سی کچھ دیر تک بیٹھی رہی۔ دوسری طرف آدتیہ پرکاش مسلسل ہیلو کہے جا رہا تھا جو اس کے پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ بہت دیر بعد شبانہ کی حالت نارمل ہوئی۔ تب وہ سنبھلے ہوئے لہجے

میں بولی۔ ''مسٹر آدتیہ پرکاش میری آپ سے گذارش ہے کہ آئندہ سے آپ مجھ سے نہ ملیں۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' آدتیہ نے تعجب سے دریافت کیا۔ ''اس کی وجہ آپ بتائیں گی۔ میں نے آپ کو بتا دیا ہے کہ میں مسلمان ہو جاؤں گا اور پھر آپ کے والدین نے بھی اس رشتے کا سنہرا تاج کی ہے۔''

''میں اپنے بزرگوں کی غلطی کی سزا بھگت رہی ہوں۔'' شبانہ پرسکون لہجے میں بولی۔ ''میں نہیں جانتی کہ میرے بطن سے پھر ایک اور شبانہ جنم لے۔ دنیا کے ہر مذہب نے محبت کی تعلیم دی ہے لیکن اسی محبت نے اپنی بارگاہ میں مذہب کی بلی چڑھائی ہے ایسا سودا مجھے منظور نہیں۔''

شبانہ نے اپنا موبائل بند کر دیا اور موبائل کے سینے سے آدتیہ کا نمبر نکال دیا۔

☆

-بقیہ-

کہانی عنوان چاہتی ہے

کی چادر میں لپٹی' چاند پری کی مانند ہمہ تن گوش جبکہ میری ساری توجہ اس کے ڈھلکے ہوئے آنچل کی محرابوں پر تھی۔ وہ اپنی ناآسودہ زندگی کے رازوں میں جی کھول کر مجھے شریک کر رہی تھی اور میں اس سے شریک بدن ہونے کے لئے پرتول رہا تھا۔ باہر کے مہذب انسان پر اندر کا شیطان پوری طرح قابو پا چکا تھا۔ میں نے صاف صاف لفظوں میں آ جا یا پھر کبھی نہیں کے انداز میں دھمکی آمیز مطالبہ پیش کر دیا۔

گھبراہٹ' شرمندگی' رسوائی......سب خوف عارضی مزاحمت ثابت ہوئے......ایک طوفان گھر کے باہر بپا تھا اور ایک گھر کے اندر۔ باہر کے طوفان کی شدت نے بادلوں کو پانی کی شکل میں برسا کر زمین کا سینہ ٹھنڈا کر دیا تھا مگر اندر کا طوفان کسی کو سیراب کئے بغیر ماند پڑ چکا تھا......میرے اندر کا شیطان مجھے اکیلا چھوڑ کر نہ جانے کہاں غائب ہو چکا تھا؟ چند لمحے قبل کا وحشی انسان یکایک معصوم بچے میں تبدیل ہو چکا تھا' جسے صادقہ کی بھرپور اور بردبار رچھاتیوں میں دنیا جہان کی آسودگی میسر آ گئی تھی؟؟؟

☆

کھیل کھیل میں

انجم جاوید (کراچی)

جب اس نے پہلی بار مجھ سے یہ کہا کہ وہ ایک کم سن لڑکی سے عشق کرتا ہے جو اس کا آئیڈیل ہے تو میں ہنس پڑا تھا مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ سے مذاق کر رہا ہے دل لگی کر رہا ہے لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا یہ کم سن آئیڈیل اس کے ہاتھوں میں سلگتا ہوا سگریٹ دے دے گی۔

آج وہ بہت یاد آ رہی ہے اس نے گہرا کش لے کر کہا اس کے منہ سے نکلنے والے دھوئیں سے اس کا چہرہ چھپ گیا آج اس کا چہرہ بہت تاریک سا لگ رہا تھا۔

تو کیا وہ جب بھی یاد آتی ہے تم سگریٹ پینے لگتے ہو؟

ہاں! اس نے گہرا سانس لے کر کہا اس کی یاد آتی ہے اور خوب آتی ہے میں اپنے آنسو روکنے کے لیے سگریٹ سلگا لیتا ہوں اس کی تصویر دھوئیں کے مرغولوں پر رقص کرتی رہتی ہے اور یوں وہ میرے سامنے ہوتی ہے

لیکن سگریٹ تمہیں بہت نقصان پہنچا رہا ہے۔

نہیں! ایسا بھی نہیں اس کی یاد مجھے جتنا نقصان پہنچاتی ہے اتنا سگریٹ نہیں پہنچاتی سگریٹ تو سکون میسر کرتا ہے خیر! چھوڑو ان باتوں کو آج تم آ گئے ہو تو میں کچھ کھل گیا ہوں ورنہ میں باغ کے ایک کونے میں خوب روتا ہوں اور دل میں سلگتی ہوئی تپش کو اشکوں کے پانی سے ٹھنڈا کرتا ہوں۔

میں نے اس کے لہجے میں شدید کرب کی کیفیت کو دیکھتے ہوئے ہمدردی سے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

جون! اگر تم برا نہ مانو تو کیا تم مجھے یہ کمسن آئیڈیل کا قصہ سنانا پسند کرو گے؟

اس نے چند لمحوں کے لیے میری جانب غور سے دیکھا اور کہا انکل! تم ہنسو گے تو نہیں؟

نہیں۔ قطعی نہیں۔ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

اچھا چلو کسی ریسٹورنٹ میں چلتے ہیں۔ ریستوران تک پہنچنے کا سفر انتہائی خاموشی اور سنجیدگی سے طے کیا گیا۔

سنو انکل! یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں ساتویں میں پڑھتا تھا امتحان دے چکا تھا چھٹیاں تھیں انہی دنوں گاؤں سے میری ایک کزن بھی آئی ہوئی تھی جس کا نام شاکرہ تھا ایک دن میں نے اس سے کہا آؤ گولیاں کھیلو گی؟ اس نے سر ہلا دیا یہاں میں یہ بتا دوں کہ اس وقت شاکرہ چھٹی جماعت کا امتحان دے کر کراچی آئی ہوئی تھی میں اور وہ گھر سے متصل گلی میں کانچ کی گولیاں کھیلتے رہے ہمارے ساتھ عذرا، ماہین، راشد بھی کھیلا کرتے تھے بے فکری کے دن تھے ہم طرح طرح کے کھیل کھیلتے تھے یہ وقت بہت سادگی اور بچپن کا تھا آج کے بچوں کی طرح ہم میں کسی قسم کی ہوشیاری نہیں تھی خاص کر کسی قسم کے جذبات کا دور دور تک کوئی گزر نہ تھا ایک دن ہم سب مل کر چور سپاہی کھیل رہے تھے پرچیاں بانٹی گئیں ہر ایک نے ایک ایک پرچی اٹھائی اور کھول کر دیکھا میں سپاہی نکلا شاکرہ چور نکلی عذرا جج قاضی تھی بادشاہ راشد کے حکم کی تعمیل میں یہ حکم جاری کیا کہ "سپاہی! چور کو دس کوڑے لگاؤ" سپاہی یعنی میں نے چور یعنی شاکرہ کی کلائی پکڑی اور درمیان کی دو انگلیوں کی پوروں سے چور کی کلائی پر ضرب لگانا شروع کر دیے یہ کوڑے تھے ایک دو، تین چار، پانچ ابھی گنتی پانچ پر ہی پہنچی تھی کہ چور کی کلائی سرخ ہو گئی تب جانے کیا ہوا سپاہی نے کوڑے مارنا بند کر دیے۔ بادشاہ چیخا قاضی نے صدا دی بے ادب، گستاخ رک کیوں گئے ہو کوڑوں کی سزا جاری رکھو مگر سپاہی باغی ہو گیا تھا میں یک دم اٹھا اور چل دیا بادشاہ نے قاضی کی جانب دیکھا پر نگاہ سوالیہ تھی پھر کہاں کا کھیل ہوا تھا اسی شام مجھے بخار آ گیا شاکرہ میرے نزدیک ہوئی اس نے پوچھا۔

جون ایک بات بتاؤ؟

کہو! میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

تم نے مجھے کوڑے مارنا کیوں بند کر دیے تھے؟

دراصل تمہاری کلائی سرخ ہو گئی تھی میں سمجھا کہ تمہیں تکلیف ہو رہی ہے اس لیے میں رک گیا کہ میں تمہیں کسی قسم کی تکلیف میں نہ جانے کیوں دیکھ نہیں سکتا۔

کیا میں تمہیں اچھی لگتی ہوں؟ اس کا انداز بہت معصومانہ تھا۔

ہاں! میں نے بھی برجستہ کہہ دیا تھا۔ بس انکل! یہ ایک واقعہ تھا جس نے بڑھتے بڑھتے محبت کا روپ دھار لیا شاکرہ اپنے گاؤں چلی گئی اور میں حسین یادوں کے سہارے چلتا چلتا میٹرک کر گیا اس کی یاد میں دن بدن اضافہ ہوتا رہا خط کے خط آتے تو ان میں تحریر شاکرہ کے تذکرے اور سلام مجھے بے خودی کی وادیوں میں لے جاتے انہی یادوں کے سہارے میں انٹر سال دوم تک جا پہنچا اس تمام عرصے میں میرا گاؤں جانا کسی صورت ممکن نہ ہو سکا کالج میں میرا ہم سا گہرا دوست رفیع تھا جس سے میں حال دل کہہ دیا کرتا تھا وہ اکثر کہتا جون کیا تمہیں یقین ہے کہ شاکرہ بھی تمہیں اتنی ہی چاہتی ہوگی؟

نہیں! میں اس بارے میں یقین سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔

ایک دن رفیع نے کہا جون تم چھٹیوں میں گاؤں کیوں نہیں چلے جاتے میرا تو یہی مشورہ ہے کہ تم وہاں جا کر اس سے مل لو تمہیں حالات کا مکمل اندازہ ہو جائے گا میں نے مشورہ قبول کر لیا۔

گہری دھند کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا شام کا وقت تھا مگر قمقمے جل اٹھے تھے تھوڑی دیر پہلے بارش ہوئی تھی اب پھر کو تھمی تھی میں ایبٹ آباد کے فوارہ چوک پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ یہاں کے موسم کا بھی اعتبار نہیں ابھی خاصی راولپنڈی میں دھوپ تھی میری گاڑی پہنچی تو بارش ایسی ٹوٹ کر برسی کہ بے ساختہ آرزو لکھنوی کی یاد آ گئی۔

۔ انتہا سا ٹوٹ کے بادل دوب چلا ہے خانہ بھی

میرے ایبٹ آباد پہنچنے تک بارش تھم چکی تھی میں کالونی پہنچا تو مجھے مکان تلاش کرنے میں دشواری ہوئی گیارہ بارہ سال کے عرصے میں کافی تبدیلیاں آچکی تھیں۔

شوق دید اتنا شدید تھا کہ میں اگلے ہی دن اپنے ددھیال سے چھوٹے کزن کو لے کر خالہ کے گھر جا پہنچا دروازہ بند تھا میں نے دستک دی' گو دروازہ بند تھا مگر چشم شوق کے آگے اس کا عکس ابھر رہا تھا دل تھا کہ دھڑک دھڑک کر کہہ رہا تھا بس چند لمحے ٹھہر جاؤ خوابوں کی تعبیر سامنے آنے والی ہے اور پھر بند پلکوں کی طرح بند دروازہ کھل گیا ایک مدت کے بعد دیکھا سامنے وہی چہرہ تھا' وہ بھی چند لمحے حیرت سے مجھے دیکھتی رہی پھر وہ چلاتی ہوئی اندر چلی گئی جون آگیا جون آگیا۔ میں اپنے کزن کے ہمراہ اندر داخل ہوگیا سامنے سے خالو آرہے تھے خالہ بھی کمرے سے نکل آئیں مجھے انہوں نے سینے سے لگایا اور حال احوال معلوم کئے۔ میں کمرے میں بیٹھ گیا سردی کا موسم تھا ہیٹر سلگ رہا تھا ایک طرف ہیٹر سلگ رہا تھا تو دوسری سمت میرے دل میں شائلہ کے لیے عشق کی آگ جل رہی تھی میں اسے اور وہ مجھے چوری چوری دیکھ رہے تھے۔ مجھے وہاں آئے ہوئے ہفتہ گزر گیا لیکن میری اس سے کوئی بات بھی مکمل نہ ہو سکی ایک دن میں اس کے گھر پہنچا تو گھر میں سناٹا تھا چند مرغیاں برآمدے میں گھوم رہی تھیں اندر کمرے میں گیا کوئی چادر لپیٹے سو رہا تھا وہ خالہ کی طبیعت پھر خراب ہوگئی ہو میں نے سوچا اور چادر چہرے سے ہٹا دی دوسرے ہی لمحے بجلی کا کرنٹ لگا چادر کا سرا ہاتھ سے گر گیا وہ شائلہ تھی جس نے آنکھوں پر کالے چشمے لگا رکھے تھے۔

کون ہے؟ اس نے کہا اور پھر ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ تھام لیا اور اپنے بھائی کا نام لیتے ہوئے کہا۔

نواز! تم ہو جاؤ اندر کمرے سے آنکھوں میں ڈالنے والی میری دوا لا دو۔ میں خاموش اسے دیکھتا رہا تم سن نہیں رہے ہو؟ اس نے غصے سے کہا میں نے ہمت کی اور ہاتھ بڑھا کر اس کی عینک اتار لی اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں کونے سرخ ہو چکے تھے نہ جانے مجھے کیا ہوا میں نے جھک کر اس کی آنکھ کا بوسہ لیا وہ گھبرا کر آنکھیں کھول بیٹھی تم! اور پھر ہانپ گئی۔

ہاں میں! مجھے علم نہ تھا کہ تم اس مرض میں مبتلا ہوگئی ہو میری حرکت کا برا نہ ماننا سنا ہے اس طرح سے بیماریاں چوس لی جاتی ہیں میں نے تمہاری بیماری چوس لی ہے اب تم جلد صحت مند ہو جاؤ گی شائلہ تم تو کانچ کی گولیاں اور چور سپاہی میں کھیلنے والے لڑکوں کی ضرب کو بھول گئی ہو مگر میں ان لمحات کو قطعی نہیں بھول سکا پیار بھی کانچ کی طرح ٹوٹ کر بکھر نہیں گیا ہاں شائلہ اب سوچ رہا ہے تو کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ میں نے جب تمہیں پہلی بار دیکھا تب سے آج تک تم ہی تم میرے دل میں ہو اور اب تو پیار کا یہ ننھا سا پودا شجر بن چکا ہے جسے طوفان بھی نہیں گرا سکے مگر میں یہ نہیں جانتا کہ میری یہ چاہت یک طرفہ ہے یا۔۔۔؟

میں خاموش ہوگیا اسے آہستگی سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ کر کہا' جون تالی دونوں ہاتھوں سے بج رہی ہے۔ واقعی تالی دونوں ہاتھوں سے بجنے لگی تھی مجھے یقین نہ تھا کہ اپنی چاہت مجھے مل جائے گی میں تو گویا آئیڈیل کو پا کر ہواؤں کے دوش پر اڑ رہا تھا ایک دن صحن میں بیٹھے ہوئے جذبات انگیز گفتگو کے دوران اچانک شائلہ بولی' جون مجھے مہندی لگانی ہے؟ میں نے کہا یہ کوئی مشکل بات ہے میں ابھی مہندی لا دیتا ہوں اس نے مجھے روکا اور کہا کہ نہیں مجھے ابھی اور اسی وقت مہندی لگاؤ میں اسے تکنے لگا اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا میں نے اس سے کہا چند منٹ ٹھہرو اسے اسی جگہ چھوڑ کر میں غسل خانے میں گیا وہاں بلیڈ تھا اسے اٹھا کر اس سے اپنی ہتھیلی پر کٹ مارے' خون بہنے لگا تکلیف کی شدت اس وقت قدرے کم تھی میں ہتھیلی کو دبائے چلا اور اس کی ہتھیلی اپنی ہتھیلی پر رکھ کر مسلنے لگا اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی وہ اسے بھی پیار کا کوئی انداز سمجھ رہی تھی میں نے اپنی تکلیف کو چھپاتے ہوئے اس سے کہا۔

تم مہندی لگانا چاہتی ہو؟

ہاں۔ اس نے قدرے سوالیہ اور حیران نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

لو میں نے تمہیں مہندی لگا دی ہے یہ کہہ کر میں نے اپنی ہتھیلی ہٹا لی میرے خون سے اس کی ہتھیلی جگہ جگہ سے سرخ ہو گئی تھی شائلہ حیرانگی سے کبھی مجھے کبھی اپنی ہتھیلی کو دیکھنے لگی پھر اس نے یکدم ایک جھرجھری لی اور فوراً میری ہتھیلی کو پکڑ لیا خون کے ننھے قطرے اب بھی چمک رہے تھے اس نے فوراً اپنا دوپٹہ میری ہتھیلی پر زور سے باندھا اور ہاتھ کو چوم لیا' اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے وہ بالکل خاموش رہی لیکن اس کی آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔

یہ محبت تیزی سے پھلتی چلی گئی وہ کالج جاتی میں اس کا انتظار راہ میں کرتا، وہ ہوتی تھی تو گویا سارا جہاں میری دسترس میں ہوتا' ریوڑیاں اور مونگ پھلیاں' ہماری پسندیدہ خوراک تھی ایک دن چولہے کی آگ میں بھنتے بھنتے ہوئے اس نے اچانک مجھ سے سوال کیا۔

جون ارشد بھی تو ہمارے ساتھ کھیلتا تھا کہاں ہے وہ؟

کراچی ہی میں ہے۔

مجھے اگر ہو سکے تو اس کا ایڈریس دے دو۔

کیوں؟ میں یکدم چونک گیا۔

ویسے ہی امی نے انکی فرمائش کی تھی کہ جون سے ارشد کا پتہ لے لینا مگر تم اتنے سنجیدہ کیوں ہو گئے ہو؟

میرے سامنے تم کسی اور کا ذکر کرتی ہو تو مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا۔ میں نے جواباً کہا۔

ایبٹ آباد میں میرے دن اتنے خوشگوار اور مسرت آمیز گزر رہے تھے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا مگر گھر سے مسلسل خط آ رہے تھے کہ مجھے کراچی بھی جانا ہے میں بڑے افسردہ دل سے رخصت ہو جانے سے قبل رات گئے تک میں اور شاکرہ باتیں کرتے رہے ایک دوسرے کو یاد رکھنے کی، خط لکھنے کی تاکید دونوں طرف رہی میں نے اس سے کہا تم انتظار کرنا میں جلدی امی کو خالہ کے پاس بھجوا کر تم کو ہمیشہ کے لیے مانگ کر لے جاؤں گا۔

گاڑی سینکڑوں میل کا فاصلہ طے کر کے کراچی پہنچی میرا دل اداسی کے گہرے غم میں تھا میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں پھر سے سگریٹ سلگا لوں لیکن وہ عورت شدت سے یاد آئے جو کہہ رہے تھے دیکھو جون تمہیں میری قسم سگریٹ نہ پینا۔ سگریٹ پینا میری عادت میں تھا مگر شاکرہ نے منع کیا کہ میں سگریٹ پینا ہی بھول گیا تھا۔ گھر والے تو میری آمد پر خوش تھے ہی کالج گیا تو دوست بھی کافی ماہ بعد اپنے ساتھ دیکھ کر خوش ہوئے رفیع نے مجھ سے ساری رپورٹ لی اور میری خوشی کو اپنی خوشی سمجھ کر اس نے مجھے داد دی۔ میں کراچی آ گیا مگر میرا ذہن ایبٹ آباد ہی کی یادوں میں محو رہتا تھا۔ کراچی میں میرا دل نہیں لگ رہا تھا دوسری طرف کوئی ایسا بہانہ بھی سوجھ نہیں رہا تھا کہ میں امی سے شاکرہ کی بات کر سکتا۔ ایک حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ میرے کراچی آنے کے بعد شاکرہ نے کوئی خاطر خواہ سرگرمی نہیں دکھائی۔ میں نے اسے مسلسل اس کی سہیلی کے پتے پر تین خط لکھے جس میں اپنی پوری کیفیت بیان کی گویا دل کھول کر رکھ دیا مگر اس کا جواب جذبات سے عاری سرسری سے جملوں پر محیط ہوتا تھا میں اسے انکی احتیاط اور شرم سمجھتا رہا۔

انہی دنوں ارشد کا پتہ چلا کہ وہ اپنی امی کے ساتھ گاؤں جا رہا ہے۔ چچا زاد ہونے اور دوست ہونے کے ناطے گاؤں کی رسم نبھاتے ہوئے میں اس سے ملنے گیا وہاں اس نے مجھے بتایا کہ وہ گاؤں جا رہا ہے رشتے کی بات طے کرنے کے لیے اور امی بھی ساتھ ہیں بات بن گئی تو منگنی کر کے ہی یا شادی کر کے واپس آئے گا۔ مجھے ازحد خوشی ہوئی میں نے اسے مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ اس لڑکی کا نام تو بتاؤ جو میری بھابی بننے جا رہی ہے۔

شاکرہ، اس کا جواب تھا کوئی زبردست زلزلہ، میرے چہرے کا رنگ اڑ گیا ہوش ساکت ہو گئے اور میں دھم سے چارپائی پر گر گیا تمہیں، تمہیں کیا ہو رہا ہے جون؟ ارشد گھبرا کر چیخا اور پھر بھاگ کر پانی لے آیا کچھ نہیں، ویسے ہی تھکاوٹ سے چکرا گئے تھے میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا اور فوراً ہی بولا ارشد! یہ سب کب، کیسے اور کیوں ہوا اور تمہیں شاکرہ سے شادی کا خیال کیسے آ گیا؟

اس نے چہکتے ہوئے لہجے میں کہا جون! یہ محبت کی شادی ہو گی، شاکرہ کی مجھ میں دلچسپی اور پسندیدگی نے میری امی کو اور مجھے مجبور کیا ہے اسے اپنانے کے لیے، یہ خط دیکھ رہے ہو یہ اس نے مجھے لکھے ہیں۔ یہ رومال کڑھائی کیا ہوا دیکھ رہے ہو؟ اور یہ اس کی تصویر ہے جو اس نے خصوصی طور پر مجھے بھیجی ہے۔

اس کی باتیں سنتے سنتے میں نے شاکرہ کے خط لے لئے ایک ایک حرف کو میں پہچان گیا میں نے ارشد کو اسٹیشن سے رخصت کیا اور واپس گھر پہنچتے ہی شاکرہ کو قدرے غصے میں اور کسی حد تک بیچارگی کے لہجے میں خط لکھ دیا، کچھ دن گزرے پھر دو ماہ گزر گئے ارشد کی شادی شاکرہ سے ہو گئی خالہ نے ہمیں بھی دعوت نامہ بھیجا مگر ان دنوں میں مسلسل ہر روز رات کو نیند کی گولی استعمال کر رہا تھا جس سے میرا انگ انگ اکڑ گیا اور طبیعت کی خرابی کی وجہ سے میرے گھر سے کوئی بھی اس شادی پر نہ جا سکا کوئی دو ماہ کے بعد شاکرہ کا خط مجھے ملا اس نے لکھا تھا۔

جون! بچپن میں بہت کھیل کھیلے ہیں یوں سمجھ لو کہ یہ بھی ایک کھیل تھا تمہارا دل توڑنا منظور نہ تھا سو جھوٹ موٹ تم سے کھیلتی رہی لیکن میں ارشد کو پسند کرتی تھی اور میں نے کوشش کر کے اسے پا بھی لیا ہے میں بہت خوش ہوں تمہارا شکریہ کہ تم ہی نے اس کا پتہ دیا تھا اور ہاں تمہاری البم میں سے ارشد کی تصویر بھی میں نے ہی چرائی تھی امید ہے تم میری اس غلطی اور جھوٹ کو معاف کر دو گے۔

اور سہیل یوں میں نے اس کی غلطی کو معاف کر دیا ویسے یہ آئیڈیل کوئی نہ بنایا کرے کہ اس سے زندگی اجیرن ہو کر رہ جاتی ہے میں نے انکی خطا معاف کر دی اور اس سگریٹ کو پھر سے اپنا ساتھی بنا لیا سگریٹ بہت اچھا ہے دکھ بانٹ لیتا ہے بے وفائی بھی نہیں کرتا۔ ویسے ڈاکٹرز اس سگریٹ کے بھی دشمن ہیں اسے پینے سے منع کرتے ہیں کہتے ہیں تمہیں ٹی بی ہے وہ خاموش ہو گیا انکی انگلیوں میں سگریٹ جل رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

تو اگر تمہیں ٹی بی ہے تو تم سگریٹ چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟ میری بات سن کر اس نے گہری سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور ریسٹورنٹ سے باہر نکل گیا۔

سہیل ہوٹل میں اکیلا رہ گیا اسی لمحے ویٹر آ گیا اس نے حسب معمول برتن اٹھائے اور میز پر گرے ہوئے اشکوں کے پانی کو صاف کرنا چاہا۔

ٹھہر جاؤ! سہیل نے اسے روکا یہ پانی نہیں ہے قیمتی چیز ہے اسے ضائع نہ کرو۔

تو ویٹر حیرت سے سہیل کو یوں دیکھنے لگا جیسے سہیل پاگل ہو گیا ہو۔

اچھا۔ چلو صاف کر دو دنیا تو دل سے قیمتی تحفے کو توڑنے سے باز نہیں آتی چلو بے بسی سے بہایا ہوا پانی صاف کر دو۔

دادامیاں

مراق مرزا

(ممبئی بھارت)

رات کے قریب نو بجے تھے۔ جاڑے کا موسم تھا اور فضا میں تیز ہوائیں گشت کررہی تھیں جس کے باعث آج ٹھنڈک تھوڑی زیادہ تھی۔ شاید یہی سبب تھا کہ دادامیاں معمول سے کوئی ایک گھنٹا قبل ہی کمبل اوڑھ کر اپنی چارپائی پر لیٹ گئے تھے۔ مگر نیند کی دیوی ان پر مہربان نہیں ہوئی تھی۔ وہ بستر پر لیٹے تسبیح پڑھ رہے تھے۔ سونے سے پہلے تسبیح خوانی انکے معمول کا حصہ تھی۔ کمرے کے ایک کونے میں انگیٹھی رکھی ہوئی تھی جس میں لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جل رہے تھے۔ انگیٹھی ہیٹر کا کام کررہی تھی۔ کمرے میں اک روحانی سکوت کا ماحول تھا۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ دادامیاں کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری گویا انھیں پتہ ہو کہ فون کس کا ہے۔ وہ اطمینان سے اٹھ کر پاس ہی ایک پرانی میز پر رکھے فون کے قریب آئے اور ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا۔ حسب توقع دوسری جانب فون لائن پر چھوٹے نواب تھے جو امریکہ سے بات کررہے تھے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد چھوٹے نواب نے دادامیاں کی خیریت دریافت کی پھر آخر میں فون رکھنے سے قبل یہ اطلاع دی کہ اگلے ماہ وہ لکھنؤ آرہے ہیں۔ انکی آمد کی خبر سن کر دادامیاں کا دل ایکدم سے کھل اٹھا یوں جیسے کسی خزاں رسیدہ باغ میں سدا بہار آگئی ہو۔

فون پر چھوٹے نواب سے گفتگو کرنے کے بعد دادامیاں اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئے۔ یوں تو مہینے دو مہینے میں دو ایک بار چھوٹے نواب کا فون ضرور آتا تھا تاہم آج سے قبل انہوں نے لکھنؤ آنے کی بات کبھی نہیں کی تھی۔ ایک دو مرتبہ دادامیاں نے آباو اجداد کے مقابر پر قندیل روشن کرنے کی ذمہ داری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھیں آنے کے لئے کہا بھی تو وہ بڑی خوبصورتی سے اپنی بے پناہ مصروفیت کا ذکر کرتے ہوئے بات کو ٹال گئے تھے۔ پھر انکا یہ ماننا بھی تھا کہ موت کے بعد روحیں قبر میں نہیں رہتیں۔ ارواح کا ٹھکانہ کہیں اور ہے جہاں قندیل کی روشنی شاید نہیں پہنچ سکتی۔ کبھی کبھی انکی باتوں سے یہ بھی گمان گزرتا تھا کہ وہ بعد کی دنیا پر یقین ہی نہیں رکھتے۔ انکی نظر میں موت کے ساتھ زندگی ختم ہو جاتی ہے اور زندگی کے عناصر بکھر کر کائنات میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ بہرکیف، حیات اور موت سے متعلق چھوٹے نواب کا نظریہ جو بھی ہو، انکے اچانک آنے کی خبر نے دادامیاں کے احساس میں ایک عجیب سی شادمانی بھردی تھی۔ اب نیند انکی آنکھوں سے اڑ چکی تھی اور فکر کی وادیوں میں چھوٹے نواب کا چہرہ گشت کررہا تھا۔ انکا ذہن مسلسل چھوٹے نواب کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ اب کیسے نظر آتے ہوں گے؟ انکے قد و قامت میں تو اب خاصی تبدیلی آچکی ہوگی؟ وقت کے ساتھ انسان کے خد و خال اور اس کی شخصیت میں بدلاؤ آنا ایک فطری عمل ہے چھوٹے نواب بھی اب بہت بدل گئے ہوں گے!!۔

دادامیاں قدرے nostalgic ہورہے تھے اور انکی فکر کا طائر انھیں تیز رفتاری سے ماضی کی طرف اڑائے لے جا رہا تھا۔ چھوٹے نواب کو انہوں نے آج سے تقریباً بیس پچیس برس قبل دیکھا تھا جب وہ امریکن محبوبہ جولیا اسمتھ کے ساتھ امریکہ سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد لوٹے تھے۔ دراصل وہ جولیا کو اپنے ابا مرزا اصغر حیات بیگ سے ملوانے کی غرض سے لائے تھے۔ یہ چند کہ وہ جولیا کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں بندھنے کا فیصلہ پہلے ہی کر چکے تھے، جولیا کا تعارف ابا سے کرا کر وہ انکی خوشی کے لیے اپنی شادی کے فیصلے پر انکی رضامندی کی مہر چاہتے تھے جو حقیقتاً ایک بڑا مسئلہ تھا۔ مرزا اصغر حیات بیگ کا تعلق لکھنؤ کے نہایت معزز خاندان سے تھا۔ وہ خود ہائی کورٹ کے جج کے عہدے پر فائز تھے۔ علاوہ ازیں فکری اعتبار سے وہ سخت مذہبی انسان تھے۔ انکے لئے انگریز بہو کسی بھی طرح قابل قبول نہ تھی۔ وہ چھوٹے نواب کی شادی کسی باوقار مسلم گھرانے کی لڑکی سے کرنا چاہتے تھے، وہ بھی خصوصاً شیعہ لڑکی سے۔ اس کے برعکس چھوٹے نواب شیعہ سنی، ہندو مسلم اور مذہب و مسلک کی فصیلوں سے بہت اوپر اٹھ چکے تھے۔ امریکہ میں تعلیم کے دوران انکا فکر و نظر بالکل خود بخود بدل گیا تھا۔ وہ پوری طرح روشن خیال ہو گئے تھے اور دنیا کے تمام انسان اب انکی نظر میں ایک تھے۔ انکا خیال تھا کہ مذہب و مسلک انسان کا ذاتی معاملہ ہے جسے گھر کی چہار دیواری کے اندر ہی رہنا چاہیے۔ جولیا اگر عیسائی کے بجائے ہندو، پارسی یا کسی اور مذہب کی بھی ہوتی تو انھیں کوئی فرق نہیں پڑتا کیوں کہ اس کے ساتھ شادی کرنے کے لیے انھیں اپنا مذہب تبدیل نہیں کرنا تھا۔ جولیا اور چھوٹے نواب کی شادی کے راستے میں مذہب کا کوئی دخل نہیں تھا۔

مرزا اصغر حیات بیگ نے جب سختی سے اس inter-cast رشتے کو اپنی قبولیت عطا کرنے سے انکار کر دیا تو چھوٹے نواب اندر ہی اندر دل برداشتہ ہو گئے۔ انھیں ابا سے ایسی سختی کی توقع نہیں تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ابا highly educated اور وسیع النظر انسان ہیں۔ انکے سامنے ذات پات

یا مذہب کا معاملہ کوئی مسئلہ نہیں بنے گا۔ مگر مرزا منصور حیات بیگ وسیع النظر ہونے کے ساتھ کٹر مذہبی آدمی بھی تھے۔ وسیع النظری کے نام پر وہ اپنے مذہب و عقائد کی قربانی کسی بھی حال میں نہیں دے سکتے تھے۔ اس دن چھوٹے نواب کو اماں بہت یاد آئی تھیں۔ اگر اماں زندہ ہوتیں تو وہ کسی بھی طرح ابا کو سمجھا کر ضرور کوئی راستہ نکال لیتیں۔ انہیں حصول تعلیم کے لیے امریکہ بھیجنے میں بھی تو انہوں نے ہی مدد کی تھی ورنہ ابا راضی کہاں تھے۔ اماں نے ہی انہیں امریکہ میں حاصل کی گئی تعلیمی ڈگری کی اہمیت اور افادیت سے متعلق بتاتے ہوئے راضی کیا تھا۔ اور اب اماں دوسری دنیا میں جا بسی تھیں لہٰذا چھوٹے نواب ابا کو بتائے بنا جولیا کے ہمراہ لاس اینجلس چلے گئے۔ انکے سامنے کوئی اور راستہ بھی نہ تھا۔ وہ اب جان چکے تھے کہ اپنی روشن خیالی کی دلیلوں سے وہ ابا کو اس رشتے کے لیے قائل نہیں کر پائیں گے۔ اور وہ کسی بھی صورت حال میں جولیا کو نہیں چھوڑ سکتے تھے کیوں کہ جولیا انکی محبت تھی جسے وہ اپنی زندگی کا حصہ قبول کر چکے تھے۔

واپس جانے کے بعد انہوں نے لاس اینجلس میں جولیا کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ تب سے اب تک وہ کبھی لکھنؤ نہیں آئے، یہاں تک کہ ابا کے انتقال کے بعد ان کے چہلم کی مجلس میں بھی وہ نہیں آئے۔ اس کے لئے بڑی حد تک خود منصور حیات بیگ ہی ذمہ دار تھے۔ انہوں نے وصیت کی تھی کہ انکے جنازے میں انکے بیٹے کو شامل نہ کیا جائے چنانچہ انکی تجہیز و تکفین کے بعد چھوٹے نواب کو انکے انتقال کی خبر دی گئی تھی۔ پھر ابا کی وصیت والی بات بھی اڑتے اڑتے ان تک پہنچ گئی تھی جس سے انہیں شدید جذباتی صدمہ پہنچا تھا۔ وہ ابا سے نفرت تو کرتے نہیں تھے۔ انکے اور ابا کے درمیان نظریاتی فرق یا جھگڑا تھا، اس کے باوجود یہ بھی ایک سچ تھا کہ وہ ابا سے بے حد محبت کرتے تھے۔ گو کہ ابا کی مرضی کے خلاف جولیا سے شادی کرنے کے بعد ابا سے انکی کبھی بات نہیں ہوتی تھی تاہم وہ دادا میاں سے فون پر ابا کی خیریت دریافت کرنا کبھی نہیں بھولتے تھے۔ لہٰذا جب ابا کی رحلت کی خبر انہیں انکی وصیت کے مطابق انکی تدفین کے بعد دی گئی تو انکا دل اندر سے بری طرح ٹوٹ گیا۔ چھوٹے نواب کی روح پر ایک ایسا زخم تھا جو شاید اب تک نہیں بھرا تھا۔ انکا گناہ اتنا سنگین نہیں تھا جسے منصور حیات بیگ معاف نہیں کر سکتے تھے۔

چھوٹے نواب کو اب کوئی چھوٹے نواب کہہ کر نہیں پکارتا تھا۔ انکا نام مرزا اعجاز بیگ تھا لیکن امریکہ جا کر جب وہ ڈاکٹر بن گئے تو انہوں نے اپنے نام سے بیگ ہٹا دیا۔ ممکن ہے نام کی لمبائی کے سبب انہوں نے ایسا کیا ہو یا نام کے آگے بیگ لگا ہونا وہاں کے ماحول میں awkward معلوم ہوتا ہو اس لئے بیگ delete کر دیا تھا۔ اور اب وہ ڈاکٹر اعجاز مرزا کے نام سے مشہور تھے۔ اگرچہ اعجاز مرزا کا دادا میاں سے کوئی خون کا رشتہ نہ تھا لیکن وہ دادا میاں کو بالکل اپنے سگے دادا کی طرح مانتے اور چاہتے تھے اور دل سے انکا احترام کرتے تھے۔ دراصل اعجاز مرزا کا بچپن دادا میاں کی محبتوں اور شفقتوں کے سائے میں گزرا تھا۔ انہوں نے دادا میاں کی ہی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا تھا۔ انکے ابا اور دادا مرزا حیات بیگ انکے لئے کبھی وقت نہیں نکال پاتے تھے۔ ابا اپنے عدالتی کام کاج میں ہمیشہ مصروف رہتے تھے اور دادا کو شطرنج کی بازی کھیلنے اور شعری محفل سجانے سے فرصت نہ تھی۔ اماں خاتون خانہ تھیں لہٰذا گھر سنبھالنے کی ساری ذمہ داری انکے ہی کندھوں پر تھی۔ اپنے اکلوتے بیٹے کو وہ بھی بڑی مشکل سے وقت دے پاتی تھیں۔ لے دے کر دادا میاں تھے جن کے پاس چھوٹے نواب کے لئے وقت تھا۔ ایک طرح سے دادا میاں انکے دوست بھی تھے اور گائڈ بھی۔ صبح سے شام تک وہ ہی تو انکے ساتھ رہا کرتے تھے۔

دیوالی ہو یا دسہرا یا سوہودی میلہ، دادا میاں ہی انہیں شہر گھمانے لے جاتے تھے۔ انہیں اسکول لے جانا اور پھر اسکول سے واپس لانا بھی انکی ہی ذمہ داری تھی۔ یہاں تک کہ وہ محرم کے جلوس عزا میں بھی دادا میاں کے ساتھ ہی شریک ہوتے تھے۔ حالانکہ دادا میاں کا تعلق شیعہ مسلک سے نہ تھا مگر وہ چھوٹے نواب کے ساتھ محرم اور چہلم کے جلوس میں ماتم بھی کر لیتے تھے۔

مرزا منصور حیات بیگ اس حقیقت سے انجان تھے کہ اولاد کو محض دولت سے خریدی جانے والی اشیا مہیا کر دینے سے ایک باپ کا فرض پورا نہیں ہو جاتا۔ رشتہ چاہے خون کا ہو یا انسانیت کا اسے مضبوط و مستحکم بنانے کے لیے محبت اور شفقت کے جذبوں سے سینچنا پڑتا ہے۔ چھوٹے نواب کو مرزا حیات بیگ کے اندر کبھی دادا جیسی کوئی چیز نظر نہیں آئی تھی نہ ہی انہیں منصور حیات بیگ میں کبھی ایک مشفق باپ دکھائی دیا۔ انہیں ہمیشہ دادا میاں کے اندر کوئی اپنا بہت اپنا نظر آتا تھا۔ انکے سگے دادا اور باپ انکے ساتھ رشتوں کی کوئی دنیا تعمیر نہیں کر پائے تھے۔ ان دونوں کی اپنی الگ دنیا تھی جس میں وہ قید تھے۔ مرزا حیات بیگ اور منصور حیات بیگ کے درمیان بھی کبھی کبھار ہی بات ہو پاتی تھی۔ ہر چند کہ جاگیردارانہ نظام ختم ہو گیا تھا لیکن دونوں کے رکھ رکھاؤ اور برتاؤ میں جاگیردار اب بھی زندہ تھے۔

چھوٹے نواب جب چودہ پندرہ برس کے ہوئے تب ان پر یہ راز آشکار ہوا کہ دادا میاں سے انکا کوئی رشتہ نہ تھا۔ دراصل وہ انکے خاندان کے پرانے وفا پرست اور نہایت دیانت دار نوکر تھے۔ انکا اصلی نام محمد داؤد تھا۔ وہ لگ بھگ انکے ابا کی عمر کے تھے مگر گھر کے تمام لوگ انہیں پیار سے دادا میاں کہہ کر پکارتے تھے اور خاندان کا ہر فرد دل سے انکی عزت کرتا تھا یہاں تک کہ بڑے نواب یعنی مرزا حیات بیگ بھی۔ انہیں دادا میاں کا لقب مرزا حیات بیگ نے ہی دیا تھا۔ دادا میاں کی اپنی کوئی فیملی نہ تھی۔ انہوں نے شادی بھی نہیں کی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انکی ساری محبت ساری شفقت چھوٹے نواب کے لئے مختص تھی۔

وقت اپنی طے شدہ رفتار میں اپنا سفر طے کرتا رہا۔ پھر اچانک ایک

دن مرزا حیات بیگ کی حیات کا سفر تمام ہوگیا۔ دل کی دورہ پڑنے سے وہ اپنی آخری منزل کو پہنچ گئے اور ان کے خاندانی قبرستان میں مزید ایک قبر کا اضافہ ہوگیا۔ چھوٹے نواب کو حصول تعلیم کے لیے امریکہ بھیجے کے قریب ایک سال بعد ان کی ماں نے بھی اس زمین سے رشتہ توڑ لیا تھا اور دور آسمان میں کہیں آباد ہوگئی تھیں۔

دنیا کے رشتے ایسے ہی تو ہوتے ہیں جن کا کوئی اعتبار نہیں۔ کون کب بچھڑ جائے گا یہ کسی کو پتہ نہیں۔ اس حقیقت کے باوجود اس دنیا میں جینے کے لئے انسان کو ہر قدم پر رشتوں کی ایک کائنات کی ضرورت پڑتی ہے اور چھوٹے نواب کے لئے رشتوں کی کل کائنات دادا میاں تھے جن سے در حقیقت ان کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ اچانک امام باڑے والی مسجد سے اذان کی آواز فضا میں گونجی تو دادا میاں کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ان کے طائر فکر نے پرواز روک دی اور انہیں احساس ہوا کہ رات بیت چکی ہے۔ وہ بستر سے اٹھ کر وضو کرنے کے لئے غسل خانے کی طرف بڑھ گئے۔

چھوٹے نواب کا آبائی مکان ان کے دادا اور ابا کے زمانے میں کسی محل سے کم نہ تھا جہاں ہر وقت چہل پہل رہتی تھی اور ان کے ابا اور دادا حضور سے ملنے والوں کا ایک سلسلہ سا لگا رہتا تھا مگر وقت کے تھپیڑوں نے اب اس مکان کو تقریباً کھنڈر میں تبدیل کر دیا تھا۔ گزشتہ کوئی چالیس سال سے اس مکان میں کسی بھی طرح کی repairing وغیرہ کا کام نہیں کروایا گیا تھا جس کے نتیجے میں بھی حصہ کافی حد تک ڈھے گیا تھا۔ وحشت وش کوٹھی کی دیوار پر کائی پڑ گئی تھی۔ کھڑکیاں اور دروازے جگہ جگہ سے ٹوٹ کر اپنی کم مائیگی اور بے بسی کا ماتم کرتے دکھائی پڑتے تھے۔ بجلی کی لائن برسوں پہلے کٹ چکی تھی چنانچہ ایک زمانے سے اس حویلی کی راتیں بغیر روشنی کے گزر رہی تھیں۔ ویسے اب یہاں روشنی کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی کہ اس حویلی میں کوئی رہنے والا تو تھا نہیں۔ دادا میاں کا کمرہ حویلی کے باہری حصے میں تھا، گیٹ کے قریب۔ نوابوں اور زمینداروں کی حویلیوں میں نوکروں کے لیے یہی جگہ ہوتی ہے۔ دادا میاں دو تین برس میں ایک بار اپنے کمرے میں تھوڑا بہت کام کروا لیا کرتے تھے تا کہ اسے رہنے کے قابل رکھا جا سکے۔ پڑوس کے وکیل صاحب نے انسانیت کی بنیاد پر انہیں برقی کنکشن دے دیا تھا جس کے سبب ان کے کمرے میں رات کے وقت روشنی ہو جاتی تھی۔

مگر جب کبھی دادا میاں اپنے کمرے کی کھڑکی سے نواب صاحب کی حویلی کو اندھیروں کے حصار میں قید دیکھتے تو انہیں شدید ذہنی کرب کا احساس ہوتا۔ وہ سوچتے کاش چھوٹے نواب یہاں ہوتے تو یہ حویلی آج ویران نہ ہوتی۔ ماضی کی طرح یہاں آج بھی رونق ہوتی، شان و شوکت ہوتی۔ چھوٹے نواب کی فیملی یہاں آباد ہوتی ان کے بچے حویلی میں کھیلتے کودتے نظر آتے۔ وہ انہیں اسکول چھوڑنے اور اسکول سے لانے جاتے جس طرح وہ چھوٹے نواب کو اسکول چھوڑنے اور اسکول سے لانے جاتے تھے۔ ہندوؤں کے تیج تہواروں کے موقعوں پر وہ چھوٹے نواب کے بچوں کو بھی شہر گھمانے لے جاتے۔ پھر انہیں خیال آتا کہ اس میں چھوٹے نواب کا کیا قصور؟ وہ تو امریکہ سے واپس آئے تھے یہیں رہنے کے لیے مگر ان کے ابا نے ہی ان سے رشتہ توڑ لیا۔ شاید انہیں رشتوں کی اہمیت کا اندازہ نہیں رہا ہوگا کہ یہ رشتے ہی تو ہیں جن سے انسان کی شناخت ہوتی ہے۔ رشتوں ہی کی بدولت انسان اس دنیا میں مالا مال ہوتا ہے یا کنگال۔ جب بھی دادا میاں رشتوں کے بارے میں گہرائی سے سوچتے مرزا حیات بیگ اور مرزا مظفر حیات بیگ انہیں بے حد غریب نظر آتے۔ ان کا شاندار ماضی وقت کے گہرے اندھیروں میں ڈوبا ہوا نظر آتا۔ ہر برس جب وہ شب برات کی رات نواب صاحب کے خاندانی قبرستان جاتے تو انہیں بے حد تکلیف پہنچتی کیوں کہ اس قبرستان میں اب صرف دادا میاں ہی آتے تھے قندیل جلانے اور فاتحہ پڑھنے، ان کے علاوہ کوئی بھی نہ آتا تھا۔ اور آتا بھی کہاں سے۔ اس شہر میں نواب صاحب کا کوئی رشتہ دار اب تھا ہی نہیں۔ دادا میاں کی عمر بھی اسی کے آس پاس ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی وہ یہ بھی سوچتے کہ ان کے بعد یہ قبرستان تو ہمیشہ کے لیے تاریکیوں کی نذر ہو جائے گا۔ تب انہیں چھوٹے نواب کی یاد شدت سے آتی۔ مگر کچھ کر بھی تو نہیں سکتے تھے۔ ان کے اختیار میں کچھ تھا ہی نہیں۔

اب چھوٹے نواب کے آنے میں تین چار دن ہی رہ گئے تھے۔ دادا میاں نے اچھی طرح حویلی کی صاف صفائی کروائی تھی۔ چھوٹے نواب کا بچپن کا کمرہ تو ٹوٹ پھوٹ گیا تھا چنانچہ ابا والے کمرے کو انہوں نے ان کے لئے تیار کروایا تھا۔ پلمبر بلوا کر باتھ روم بھی ٹھیک کروایا تھا۔ اس کے علاوہ وکیل صاحب سے اجازت لیکر بجلی کا کنکشن بھی لگوا دیا تھا تا کہ چھوٹے نواب کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہو۔ دادا میاں کی خوشی دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے ان کا اپنا بیٹا پردیس سے واپس آ رہا ہو۔

دادا میاں تو انہیں ریسیو کرنے ایئر پورٹ بھی جانے والے تھے مگر چھوٹے نواب نے انہیں فون پر منع کر دیا تھا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں، وہ اپنے آپ آ جائیں گے۔ اور پھر ان کی ٹیکسی حویلی کے گیٹ میں داخل ہوئی۔ جب وہ ٹیکسی سے اترے تو دادا میاں کو انہیں پہچاننے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کیوں کہ چھوٹے نواب کی جسامت میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا۔ صرف پہلے سے تھوڑے موٹے نظر آ رہے تھے۔ چہرہ مہرہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا پچیس برس قبل تھا۔ ٹیکسی سے اترتے ہی چھوٹے نواب دادا میاں سے بے اختیار لپٹ گئے۔ پھر دونوں کی آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب امڈ پڑا اور بچپن کی ساری یادیں چھوٹے نواب کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئیں۔

چھوٹے نواب کو لکھنؤ آئے تقریباً پانچ دن بیت گئے تھے۔ اس دوران وہ اپنے اسکول اور کالج کے زمانے کے کئی دوستوں سے ملے۔ آس پڑوس کے انکل آنٹی، پھوپھی، دادی سے بھی ملے۔ ان کے آنے کی خبر شہر کے کئی بلڈروں تک پہنچ گئی تھی جو ان کی پراپرٹی خریدنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ایک بلڈر نے پچاس کروڑ کا آفر دے دیا تھا۔ یہ بات دادا میاں کو بھی معلوم ہو گئی تھی کہ چھوٹے نواب واپس امریکہ جانے سے قبل شاید اپنی جائداد فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ اور ایک طرح سے ٹھیک بھی ہے کہ آگے اسے سنبھالے گا کون۔ میری زندگی اور بچی ہی کتنی ہے۔ صبح کا ٹمٹماتا ہوا چراغ ہوں، کبھی بھی بجھ سکتا ہوں۔ اتنی بڑی پراپرٹی ہے اس کا کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہ رہا تو کل کو غنڈے بدمعاش آسانی سے اس پر قبضہ کر سکتے ہیں!!۔۔۔۔۔ دادا میاں نے دل ہی دل میں خود سے گفتگو کی۔

آج دادا میاں کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ شام کے وقت سینے میں درد اٹھا تھا۔ چھوٹے نواب نے فوراً ڈاکٹر گپتا، جن کی ڈسپنسری پاس ہی میں تھی، کو بلوا کر ان کا معائنہ کروایا تھا۔ ڈاکٹر گپتا نے چیک اپ کے بعد کہا تھا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے، گیس کا درد ہے۔ اور وہ گیس کی دوا دے کر چلے گئے۔

رات کا کھانا چھوٹے نواب اور دادا میاں نے ساتھ کھایا۔ اس کے بعد دادا میاں نے گیس کی دوا بھی کھائی۔ پھر چھوٹے نواب کے کہنے پر اپنی چارپائی پر لیٹ گئے۔ چھوٹے نواب ان کے قریب ہی پرانی کرسی پر بیٹھ گئے۔ دادا میاں نے لیٹے لیٹے جولیا اور بچوں کے بارے میں دریافت کیا تو چھوٹے نواب نے فوراً فون لگا کر ان سبھی سے ان کی بات کروا دی۔ جولیا اور بچوں سے باتیں کر کے دادا میاں کی آنکھیں بھر آئیں کیوں کہ ان سب نے ان سے اردو میں گفتگو کی تھی۔ یعنی جولیا اردو سیکھ گئی تھی اور اس نے اپنے بچوں کو بھی اردو سے دور نہیں رکھا تھا۔ کاش مرزا صفدر حیات زندہ ہوتے تو انہیں یہ جان کر کتنی خوشی ہوتی کہ ان کی بہو ان کی زبان اور تہذیب اپنا چکی ہے۔ دادا میاں نے دل ہی دل میں سوچا۔

دادا میاں بستر پر دراز تھے لیکن انہیں نیند نہیں آ رہی تھی۔ شاید وہ چھوٹے نواب کے ساتھ آج بہت سی باتیں کرنا چاہتے تھے اور چھوٹے نواب بھی ان کے پاس سے اٹھنے کے موڈ میں نہ تھے۔

"چھوٹے نواب،۔۔۔ آپ سے میرا کوئی خون کا رشتہ تو ہے نہیں۔۔۔۔۔ لیکن نہ جانے کیوں آج آپ سے کچھ کہنے کو جی چاہ رہا ہے، اگر اجازت ہو تو۔۔۔۔۔"

"خون کے رشتے ہی سب کچھ نہیں ہوتے دادا میاں!۔۔۔۔۔ میرے اور آپ کے درمیان جو رشتہ ہے خون کے رشتے سے بھی زیادہ گہرا اور مضبوط ہے۔۔۔۔۔ دادا میاں، میں آپ ہی سے ملنے امریکہ سے یہاں آیا ہوں! آپ کے سوا میرا یہاں ہے کون؟!"

چھوٹے نواب نے بے حد جذبات بھرے لہجے میں کہا۔ پھر دادا میاں نے اپنی بات آگے بڑھائی۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ اپنی فیملی کے ساتھ واپس ہندوستان آ جائیں اور اپنے اس خاندانی مکان میں آباد ہو جائیں، جو کھنڈر بن چکا ہے؟۔۔۔۔۔ یہ مکان آپ کے اجداد کی نشانی ہے چھوٹے نواب! اسے سنبھال کر رکھنا آپ کا فرض ہے!"

چھوٹے نواب نے اپنے جذبات میں کچھ حرکت محسوس کی مگر کچھ بول نہیں پائے۔ دادا میاں نے اپنی بات جاری رکھی۔

"ویسے آپ کی جائداد بیچنا اپنی جگہ ہے لیکن آپ کی اماں بھی تو اسی شہر میں دفن ہیں! چھوٹے نواب! کیا آپ کو اماں کی یاد امریکہ میں کبھی نہیں آتی؟!"

"آتی ہے دادا میاں، بہت آتی ہے!۔۔۔۔۔ لیکن جو کچھ بھی ہوا اس کے لیے میں اکیلا تو ذمہ دار نہیں۔ آپ تو سب کچھ جانتے ہیں۔ میں تھوڑی ہی پردیس میں آباد ہونا چاہتا تھا!!"

جذبات کی شدت بڑھ جانے کے سبب چھوٹے نواب آگے بول نہیں پائے۔ دادا میاں نے دھیرے سے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔

"پتہ ہے، مگر اب تو وہ رہے ہی نہیں، جن سے جھگڑا تھا۔ اب تو وہ ہر برس شب برات کی رات اپنے آبائی گورستان میں آپ کا انتظار کرتے ہیں۔ موت کے ساتھ زندگی ختم نہیں ہوتی چھوٹے نواب۔ روحیں دوسری دنیا میں زندہ رہتی ہیں!! انہیں اپنی اولاد سے تبدیلی کی روشنی اور فاتحہ کی طلب رہتی ہے۔"

چھوٹے نواب غور سے دادا میاں کی بات سن رہے تھے۔

"آپ تو ڈاکٹر بن گئے ہیں۔ یہاں رہ کر بھی لاکھوں کما سکتے ہیں۔ اپنے وطن لوٹ آیئے چھوٹے نواب۔ اجداد کی روحوں کو بہت سکون پہنچے گا۔ میری بھی تمنا ہے کہ آپ کے بچوں کو اسکول چھوڑنے جاؤں، انہیں اسکول سے لینے جاؤں!! دیوالی کے میلے اور محرم کے جلوس میں، میں انہیں اپنے ساتھ لے جاؤں۔ اور اب تو جولیا اردو بھی سیکھ گئی ہیں۔۔۔۔۔"

"ٹھیک ہے دادا میاں، آپ جیسا چاہتے ہیں ویسا ہی ہوگا۔"

اپنی فیملی کے ساتھ لکھنؤ واپس آ جانے کا وعدہ کر کے چھوٹے نواب اپنے کمرے میں جا کر سو گئے۔ صبح امام باڑے والی مسجد سے اذان کی آواز فضا میں گونجی تو وہ اٹھے اور فراغت سے نہا دھو کر دادا میاں کے کمرے کی طرف چل پڑے۔ جب سے وہ آئے تھے دادا میاں کے کمرے میں ہی ان کی جانماز پر فجر کی نماز ادا کرتے تھے۔ مگر آج جب وہ کمرے میں داخل ہوئے تو دادا میاں سو رہے تھے۔ اتنی گہری نیند کہ اٹھنے کی توقع نہ تھی۔ دادا میاں کی زندگی کا چراغ بجھ چکا تھا لیکن چھوٹے نواب کے آبائی گورستان میں ہر طرف تبدیلی کی روشنی نظر آ رہی تھی۔

☆

کہانی عنوان چاہتی ہے

گلزار جاوید
(راولپنڈی)

کسی بھی شخص کی خوبیوں اور خامیوں کا اندازہ اس کے عمل سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کے اپنے اندر یہ خواہش سر ابھارتی ہے کہ وہ خود کو کسوٹی پر جانچے اور پرکھے۔ زندگی کے رویوں کے بارے میں اپنی اپروچ کو سچ جھوٹ، اچھائی، برائی، نیکی بدی کی ترازو میں تولے مگر چند ہی ساعتوں میں اس کے حوصلے پست اور ہمت جواب دے جاتی ہے اور وہ اپنے ماضی میں کھو جاتا ہے۔ گزرے ہوئے لمحات کا لمس اس کے انگ انگ میں آشکار ہونے لگتا ہے۔ کوشش کے باوجود فیصلہ کر پانا بس میں نہیں رہتا۔

اس وقت سکول کے زمانے کے مناظر میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے ہیں۔ ماسٹر حفیظ کا نورانی چہرہ اور کلرکی کی 'بیت'' کے علاوہ اشفاق صاحب کے پیریڈ میں باجماعت مرغا بننے والے لاء ایڈووکیٹ، ڈاکٹر، انجینئر، بیوروکریٹ، مدرس، صنعت کار کے طور پر کام کرنے والوں میں بچپن کے دوستوں کی شکلیں نمایاں ہونا شروع ہو گئی ہیں۔ یکایک ٹیلی ویژن سکرین پر اشتہاری فلم کی حسینہ نے نوعمری کے وہ قصے یاد دلائے ہیں جب صبح کہیں، شام کہیں اور رات کہیں والی کیفیت طاری تھی۔ دل تھا کہ قابو میں نہ آتا تھا۔ کبھی چھت پر، کبھی گھر کے پچھواڑے، کبھی ویران گلی میں، کبھی ریسٹورانٹ، سینما، کلب یا کافی ہاؤس میں۔ کبھی چاندنی راتوں اور کبھی بھیگی برساتوں میں گھنٹوں محو گفتگو رہتا۔ آج ایک لفظ کہنا محال، تب سو طریقے حالِ دل عیاں کرنے کے۔ اب شعر و ادب سے بیزاری کی کیفیت، تب کسی کے لمس سے آشنا ہو کر قرطاس و قلم کا بے محابا استعمال!

خیالوں کا سلسلہ ایک بار پھر ٹوٹا، کانوں میں سحرکن آواز نے پھر سے ٹیلی ویژن سکرین کی جانب متوجہ کر دیا۔ کتنی نوخیز حسین و دلکش ماں ہے جو گاگا کر بچے کو اپنے دودھ کی جگہ خشک پاؤڈر پانی میں ملا کر پلا رہی ہے اور اسے ماں کے دودھ کے قریب تر بتلا رہی ہے۔ اتنا بڑا دھوکا اس شیر خوار کے ساتھ کوئی غیر نہیں اس کی اپنی ماں کر رہی ہے۔

خدا معلوم کس دل سے میری ماں شیر خواری میں مجھے چھوڑ کر، میرے باپ سے طلاق لے کر گوروں کے دیس چلی گئی اور میرے باپ نے اسی خشک دودھ کے بل بوتے پر مجھے گڑیل جوان بنا ڈالا...... ہاں مگر یاد آیا! بقول دادی ماں کے 'ماں کی موجودگی میں بھی میری خوراک یہی درآمدی خشک دودھ تھا۔ یورپ میں پروان چڑھی میری ماں کو اپنی خوبصورتی کا بڑا خیال تھا۔ اسی ڈر سے اس نے اکلوتے بیٹے کو اپنی چھاتی سے بہنے والے دودھ کے ایک قطرہ کا بھی حق دار نہ جانا۔

میرا باپ جسمی بھرتی کے علاوہ چہرے کی رنگت کا بڑا قائل تھا۔ نوجوان چہروں پر شگفتگی اور شادابی اس کے نزدیک صحت مندی کا سائن بورڈ تھا۔ بقول اس کے جس کمپنی کا سائن بورڈ بھدا اور بے جان ہو اس کی پراڈکٹ سے بہتری کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔ اسی غرض سے وہ میرے سونے، جاگنے، کھانے، پینے، ورزش اور روزمرہ کیلریز کا باقاعدہ حساب رکھتا۔ میری صحت سے متعلق اپنے باپ کی فکرمندی میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ کیونکہ وہ میرے لئے مفید کم مضر زیادہ ثابت ہو رہی تھی۔ بہتر نشوونما کے ساتھ سرکشی اور بے باکی بھی پروان چڑھ رہی تھی۔ ابھرتی جوانی، دلکش نین نقش، مناسب قد کاٹھ، گھنی اور سیاہ زلفیں، گرد و پیش کی حسیناؤں کی نیندیں اڑانے کے لئے کافی تھے۔ آنے والا ہر دن نئی کہانی کا موجب بننے لگا۔ رسوائیاں عام ہونے لگیں۔ رائی کا پہاڑ بنانے والوں کی مرادیں بر آئیں۔ گھر گھر چرچے ہونے لگے۔ بے چینی، بے قراری اور اضطراب رنگ دکھلانے لگا۔ نئے تعلق بنے اور پرانے ٹوٹنے لگے۔ اطمینان کسی طور نصیب نہ تھا۔ گوہر مقصود ہاتھ نہ آتا یا آ کر نکل جاتا۔ کسی کی بانہوں میں ڈوب جانے...... غرق ہو جانے کو جی مچل مچل جاتا۔ کوئی پیمانہ، کوئی معیارِ عشق کی کوئی انتہا نہ تھی۔ نوعمر، نوخیز حسیناؤں سے دل اچاٹ ہو رہا تھا۔ متناسب جسم اپنی جانب متوجہ کرنے لگے تھے۔ یہی شوق اشتیاق پارٹی میں جا بجا بکھرے نوخیز جلوؤں کو چھوڑ کر چالیس کے پیٹے میں پہنچی حسینہ، صادقہ کے گرد کھینچ کر لے گیا۔

اس کا سراپا، اس کے مزاج کی سادگی، سلیقہ مندی اور حسن پسندی کی گواہی دے رہا تھا۔ وہ پارٹی میں شامل ہوتے ہوئے بھی سب سے الگ منفرد اور باوقار نظر آ رہی تھی۔ کٹورا سی اداس آنکھیں، کاجل کی آمیزش کے بعد اس جھیل کا منظر پیش کر رہی تھیں جس میں تازہ تازہ کسی نے خودکشی کی ہو۔ وہ امیر کبیر بیوہ یا مطلقہ نہ تھی۔ علاقے کی بااثر سیاسی و سماجی حیثیت کی حامل باعزت اور باوقار خاتون تھی جو اپنے آبائی گھر میں کئی ملازموں کے ہمراہ تنہا رہا کرتی تھی۔ شوہر مشرقِ وسطیٰ میں کارخانوں کا وسیع کاروبار کرتا تھا جو سال چھ مہینے بعد ہفتہ دو ہفتہ کے لئے آتا اور ہر بار صادقہ کو اپنے ساتھ چلنے کے لئے مجبور کرتا۔ صادقہ ہر بار اسے اپنی اہمیت اور مرتبہ کا احساس دلا کر تنہا واپس بھیج دیتی۔ شادی کے ابتدائی سالوں میں

ماں بننے کے مرحلے کے دوران پیچیدگی کے باعث زچہ و بچہ میں سے کسی ایک کی جان بچائی جا سکتی تھی۔ صادقہ کے شوہر نے ڈاکٹروں سے محبوب بیوی کی زندگی مانگ لی جو کبھی باپ نہ بننے کی قیمت پر مل گئی۔

"تقریر بہت عمدہ کرتی ہیں آپ۔ ایک ایک لفظ موتی کی مانند لڑی میں پرو دیتی ہیں گویا۔"

"شکریہ" میری جھوٹی تعریف کے جواب میں اس نے مختصر جواب دیا۔

"آپ کی تعریف......؟" میرے سراپے کو جانچتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

"خاکسار کو شکیل کہتے ہیں۔"

"کیا شغل ہے آپ کا؟"

"مطالعہ" اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے میں نے کہا۔

قدرے جھجکتے ہوئے اس نے کہا...... "اچھا شغل ہے۔ مگر میں آپ کی مصروفیات کے بارے میں معلوم کر رہی تھی۔"

"ایم اے کے بعد جاب کی تلاش ہے۔ پی ایچ ڈی کا ارادہ بھی ہے۔"

"گویا آج کل فارغ ہیں۔"

"کہہ سکتے ہیں۔"

"رفاہ عامہ سے دلچسپی ہو تو ہمارے دفتر تشریف لایئے۔ انسانی خدمت سے بہتر وقت کا کوئی مصرف نہیں۔ خدا کرے گا جاب کی بھی کوئی صورت نکل آئے گی۔"

یہ ہمارے تعلق کی باقاعدہ ابتدا تھی۔ واپسی پر میں اپنے اندر خاصی تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔ پارٹی میں کچھ نہ کھانے کے باوجود بھوک کے ساتھ نیند بھی غائب تھی۔ جسم میں ہلکا ہلکا درد محسوس ہو رہا تھا جس میں تکلیف کے بجائے سرور کی کیفیت نمایاں تھی۔

دوسری صبح میں صادقہ سے پہلے اس کے دفتر میں موجود تھا۔ چند ساعت کے لئے اس کے چہرے پر خوشگوار حیرت کا تاثر ابھرا۔ پھر وہ ورکنگ ویمن کی طرح بالکل نارمل ہو گئی۔ کچھ دن آنے جانے اور ہلکی پھلکی گفتگو کے علاوہ ڈھنگ کی کوئی بات نہ ہو سکی۔ تقریباً ایک ہفتہ بعد اس نے مجھے آٹھ دس ڈسپنسریوں کا نگران مقرر کر دیا۔ عملہ کی جانچ پڑتال، دوائیوں کی کمی بیشی، صفائی ستھرائی کے علاوہ مریضوں کی دیکھ بھال، سیریس مریضوں کے لئے ہسپتال میں علاج کا بندوبست میری ذمہ داری کا حصہ تھے۔ صادقہ تمام ڈسپنسریوں میں ہفتہ وار وزٹ کیا کرتی تھی۔ جس میں مختلف اوقات میں مختلف کارندے اس کے ہمراہ ہوا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد اس ہفتہ وار وزٹ میں صادقہ کے ساتھ میری ڈیوٹی لگا دی گئی۔ اس طرح میرا کچھ وقت اس کے ساتھ گزرنے لگا۔ تھوڑے عرصے بعد وہ مجھے اپنے ساتھ سیاسی میٹنگوں میں بھی لے کر جانے لگی اور بہت سے امور پر مجھ سے مشورہ بھی لیا جانے لگا۔ فون پر گفتگو کے علاوہ کبھی کبھی ہمارا کچھ وقت ریسٹورانٹ میں بھی گزرتا۔ ایسا موقع تب ہی آتا جب کسی میٹنگ سے بروقت فراغت مل جاتی یا کسی کیٹرنگ میں چائے بدمزہ ہوتی۔

ایک دن میں نے اپنی بیکاری کا گلہ کیا تو مجھے بغور گھورتے ہوئے بولی "تمہارا مقصد فقط نوکری ہے تو میں بندوبست کئے دیتی ہوں۔ مگر میری خواہش ہے کہ تم تھوڑا تجربہ حاصل کر لو تو بہتر ہے۔"

صادقہ جہاں دیدہ، بردبار، ٹھنڈے مزاج کی مالک، ایک مہذب خاتون تھی۔ جلد بازی میں کبھی کوئی قدم نہ اٹھاتی جبکہ مجھ میں برداشت کا پیمانہ تھا۔ میری گرمجوشی اکثر اسے شاکی کر دیتی۔ عمروں کے تفاوت کے باوجود اس کی جانب میرا والہانہ التفات اس کے لئے خوشی کے ساتھ کبھی کبھی فکرمندی کا باعث بن جاتا اور وہ کافی دیر گم سم اور کھوئی کھوئی رہتی...... پہلے کی نسبت میری پذیرائی میں اتنا فرق ضرور آیا کہ گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھنے کے بجائے پچھلی سیٹ پر اس کے برابر بیٹھنے کا حق دار بن گیا۔ اب ہماری گفتگو سیاسی، سماجی کے علاوہ زیادہ تر ذاتی ہوا کرتی۔ دوران گفتگو کبھی ہم دونوں ایک دوسرے کے اس قدر قریب ہو جاتے کہ دیکھنے والے کو ہم پر شادی شدہ جوڑے کا گمان ہونے لگتا۔ اب میری حیثیت صادقہ کے مشیر خاص یا سیکریٹری کی ہو گئی تھی۔ کوئی بھی مسئلہ مجھ سے ڈسکس کئے بغیر کبھی کوئی قدم نہ اٹھاتی۔ اب ہماری بیشتر ملاقاتیں اس کے گھر ہوا کرتیں جہاں وہ کام سے واپسی پر مجھے اپنے ساتھ لے جاتی۔ رات کا کھانا اکثر میں اس کے ساتھ کھایا کرتا۔ کھانے کے بعد چائے، کافی اور گفتگو گھنٹوں جاری رہتی اور ہمیں وقت کا احساس نہ ہوتا۔ ہماری گفتگو میں بیشتر جملے ذومعنی اور دوہری معنویت کے حامل بھی ہوتے...... بلکہ اب تو مجھ میں اتنی جرأت پیدا ہو گئی تھی کہ میں گاہے بگاہے براہ راست اظہار عشق بھی کر بیٹھتا جس کا وہ قطعی برا نہ مناتی البتہ گفتگو کا موضوع خوبصورتی کے ساتھ بدل دیتی۔

وہ دن بڑا اور حبس والا تھا۔ الیکشن کی آمد آمد تھی۔ سارا دن کارنر میٹنگوں کی نذر ہو گیا۔ تھکن کے مارے مجھے ایک کے بجائے دو نظر آنے لگے تھے۔ کچھ اثر موسم کا بھی تھا۔ میں نے اسے اس کے گھر کے باہر ڈراپ کر کے واپس جانا چاہا جس کی اس نے اجازت نہ دی...... کھانے کے بعد میں چائے پینے کے حق میں نہ تھا۔ خراب موسم اور موسلا دھار بارش کے باعث جلد از جلد وہاں سے روانہ ہونا چاہتا تھا کیونکہ میرے اندر کا شیطان آہستہ آہستہ مجھے ننگے رقص پر اکسا رہا تھا جس کی وہ مجھے ہرگز اجازت نہ دیتی۔ رات ڈھلتی گئی گفتگو طول پکڑتی گئی۔ وہ سکون و اطمینان

باقی صفحہ نمبر ۴۷ ملاحظہ فرمایئے

''یارانِ نکتہ داں''

ڈاکٹر خالد حمید
(یو۔ایس۔اے)

وہ ہو کے لالہ و نسرین و ارغواں نکلے
ہوئی جو رات تو بن کر وہ کہکشاں نکلے

پری نژاد تھے جتنے ہماری دنیا میں
وہ جا کے خاک میں دیکھو کہاں کہاں نکلے

خدا کے واسطے آ کر مجھے تسلی دو
نہ تا کہ تن سے مری جانِ ناتواں نکلے

نہ چاہو کرنی اگر تم میری مسیحائی
تو آؤ پھر بھی کہ آرام سے یہ جاں نکلے

سمجھتا بات ہے کوئی نہ کوئی سنتا ہے
ہیں اجنبی مرے کیسے یہ ہمزباں نکلے

نہ غم کی تاب کسی میں، نہ راز دار کوئی
ہیں کتنے خام یہ یارانِ نکتہ داں نکلے

تمہارے عشق کا چرچا ہے جابجا شیدؔا
سمجھتے تھے پیر تھے ہم تم بڑے جواں نکلے

○

غالب عرفان
(کراچی)

حصارِ ذات کا محدود ہونا
مرا موجود ناموجود ہونا

ایاز مقتدر مل جائے تو پھر
مجھے راس آئے گا محمود ہونا

اشارہ ہے کہ ٹھہرو سوچ لو پھر
سفر کی راہ کا مسدود ہونا

ہے یہ بھی ہارنے کی ایک صورت
مسلسل فتح کا بے سود ہونا

نہ سہنا ظلم کو دیکھا ہے میں نے
دبے جذبات کا بارود ہونا

بنائے ارتقائے زندگی ہے
مرا عابد ترا معبود ہونا

میسر ہو جو سجدہ گاہِ عرفاںؔ
نظر دیکھے مرا مسجود ہونا

○

امین راحت چغتائی

(راولپنڈی)

بے وفا ہم، تو وفادار ہے کون
آنکھ اُٹھا ، دیکھ، سر دار ہے کون

توڑتا کون ہے آئینِ وفا
بے گناہی کا خطاوار ہے کون

کون اکسائے سفر پہ لیکن
ہر قدم پر نئی دیوار ہے کون

کیسی بستی ہے یہ پوچھیں کس سے
خواب میں کون ہے بیدار ہے کون

کس بھرے گھر کو بھرا ہے کس نے
اپنے ہی گھر پہ گراں بار ہے کون

نَے نوازی تو سکونِ دل ہے
پھر یہ سوچو کہ شرر بار ہے کون

پھل جو لہرائے تو پتے چمکے
اب بتا، رونقِ اشجار ہے کون

یوں دکانوں کی بھی جگ مگ اپنی
اِک ذرا دیکھ، خریدار ہے کون

کون ہے فاخرِ منصب راحتؔ
اور رسوا سرِ بازار ہے کون

آصف ثاقبؔ

(ایبٹ آباد)

نہیں اب وہ نظارے دیکھنے کو
رہا کیا ہے ہمارے دیکھنے کو

عبارت جن کی ملبوں میں دبی ہے
یہی اب ہیں شمارے دیکھنے کو

گریباں چاک ہم بستی سے گزریں
کھڑے ہیں لوگ سارے دیکھنے کو

یہ اُلجھے بال گالوں پر ستارے
یہی کچھ ہیں نظارے دیکھنے کو

غبار و گرد ہے منظر زمیں کا
فلک پر ہیں غبارے دیکھنے کو

بجھی جاتی ہیں آنکھیں دیدہ ور کی
کہ ہیں لفظی شرارے دیکھنے کو

پڑے ہیں ہم تو ثاقبؔ راستے میں
نگاہوں کے اشارے دیکھنے کو

○

کاوش پرتا پگڑھی

(دہلی بھارت)

چار دن کی جھوٹی شہرت اور ہم
بعد اس کے اصل حالت اور ہم

لازم و ملزوم اک دوجے کے ہیں
روزِ اول سے علالت اور ہم

اُس طرف ہے دوستوں کا جمگھٹا
اِس طرف ہے شامِ غربت اور ہم

آسماں پر کیوں چڑھاتے ہو ہمیں
لاکھ میں ہیں خوبصورت اور ہم

مال ہے نایاب اس میں شک نہیں
ہائے لیکن اتنی قیمت اور ہم

کام بگڑے یا بنے پروا نہیں
آپ کی منت سماجت اور ہم

تجھ جنوں میں اور کیا کیا بک گئے
ورنہ دو ساحل ہیں نخوت اور ہم

موج سر لے آئی ہے کس موڑ پر
خون لاشیں شور دہشت اور ہم

خواب تک میں یہ کبھی دیکھا نہیں
خوابگہ میں کوئی عورت اور ہم

آپ کا یہ حسنِ ظن ہے شکریہ
ورنہ کاوشؔ اچھی عادت اور ہم

○

پروفیسر خیال آفاقی

(کراچی)

کیوں نہیں سچ بولتے یاروں کے ایمان وضمیر
کیسے جھوٹے ہوگئے سچوں کے ایمان وضمیر

جس کو کہتے ہیں حقیقت، وہ حقیقت ہے کچھ اور
ہم نے دیکھے ہیں بہت خوابوں کے ایمان وضمیر

خود جنہیں اپنے ہی ایماں پر نہیں ہے اعتبار
کیا وہ سمجھیں گے مرے جذبوں کے ایمان وضمیر

جھانک کر دیکھیں تو خود وہ اپنے اندر بھی کبھی
جانچتے رہتے ہیں جو اوروں کے ایمان وضمیر

شوقِ خودسوزی میں جل بجھتے ہیں اپنے آپ ہی
شمع کی مانند پروانوں کے ایمان وضمیر

کیوں نہیں ملتا ہے اب فرہاد سا اہلِ ہنر
ہو گئے بے آبرو تیشوں کے ایمان وضمیر

جب سے دی اس نے تبسم کو بناوٹ کی چمک
بیچ ڈالے میں نے بھی اشکوں کے ایمان وضمیر

رہزنوں کی گفتگو کا بھی یہی عنواں ہے آج
منزلوں کی دھاندلی، رستوں کے ایمان وضمیر

اہلِ عقل و ہوش سے ہے ایک دنیا بے اماں
یورو ڈالر ہیں ''خردمندوں'' کے ایمان وضمیر

آج کے نقاد و شاعر، قصہ گو، تاریخ داں
مسخ کرتے ہیں گڑے مُردوں کے ایمان وضمیر

احتجاجاً کر رہا ہوں شاعری ورنہ خیالؔ
جانتا ہوں میں سخن فہموں کے ایمان وضمیر

○

پرت پال سنگھ بیتاب
(جموں کشمیر)

کیا کہیں کون کہاں تھا پہلے
جو وہاں ہے وہ یہاں تھا پہلے

کب کہاں چھوٹ گیا یاد نہیں
دِل میں اِک جوش جواں تھا پہلے

یہ جو صحرا ہے یہاں کیسے ہے؟
ایک دریا جو رواں تھا پہلے؟

یاد آباد ہے شہرِ ماضی
حال جو ہے یہ کہاں تھا پہلے

اب سفر ہے نہ کوئی زحمتِ سفر
سر پہ اِک بارِ گراں تھا پہلے

نہ زمیں تھی نہ زمانہ کوئی
دُھند تھی ایک دُھواں تھا پہلے

یہ جو دُنیا ہے بجا ہے بیتابؔ
مگر اِک اور جہاں تھا پہلے

○

پنہاں
(یو۔ایس۔اے)

دیوانہ وار گردشِ لیل و نہار ہو
تو پھر درونِ ذات نہ کیوں انتشار ہو

تعمیرِ آشیانہ تو شاندار ہو
طوفان کے طواف کا پھر انتظار ہو

موسم ہو پُر بہار ، ہوا مشکبار ہو
کچھ اور بیقرار دل بیقرار ہو

دنیا بدل گئی مری کایا پلٹ گئی
اے دردِ عشق تجھ پہ مری جاں نثار ہو

انسانیت کے کام اگر آ سکے تو پھر
یہ زندگی ہے میری مجھے اعتبار ہو

دنیا کے آئینے میں ہوا کون منعکس
دھوکا سا کچھ نظر کو مری بار بار ہو

چھپتی نہیں کسی کی حقیقت زیادہ دیر
ابلیس چاہے لاکھ عبادت گزار ہو

جو کربِ ذات جھیل رہا ہے جہان میں
اس کا بھی زندگی پہ کوئی اختیار ہو

تخلیق ہم خدا کی ہیں اس کا ذرا لحاظ
انسان کو بنا کے نہ وہ شرمسار ہو

ترکِ وفا کا جرم بھی سرزد نہ ہو کبھی
تجدیدِ عہدِ عشق مگر بار بار ہو

بچپن کی دوستی کا یہ عہدِ شباب ہے
پنہاں غزل تمہاری نہ کیوں شاندار ہو

غلام مرتضیٰ راہیؔ
(فتح پور، بھارت)

چھلکے نہ یہ اہتمام رکھیے
لبریز ضرور جام رکھیے

ٹھہرائیے چاکِ زندگی کو
گردش میں اسے مدام رکھیے

اقبالؔ کا ہے یہ خاص طائر
شاہیںؔ کو زیرِ دام رکھیے

جن کی کہ کوئی جگہ ہے اُن میں
اپنا بھی کوئی مقام رکھیے

خدمات ہوں چاہے لاکھ حاصل
کچھ اپنے لیے بھی کام رکھیے

مایوسی کفر ہے، بھلے ہی
اُمید برائے نام رکھیے

جب آپ نے چھیڑ ہی دیا تو
قصہ مرا نا تمام رکھیے

○

نقشبند قمر نقوی بھوپالی
(ٹلسا، امریکہ)

ابھی تک جانبِ منزل کوئی رستہ نہیں نکلا
کہ جیسے پاؤں سے میرے ابھی کانٹا نہیں نکلا

تمناؤں کے سوکھے کھیت بھی سیراب ہو سکتے
کسی کی آنکھ سے ایسا کوئی دریا نہیں نکلا

کہیں ایسا نہ ہو اک تیر بے موسم ادھر آئے
اک عرصے بعد بھی تو دل سے یہ کھٹکا نہیں نکلا

بہت سی بستیاں اور مرغزار و گلستاں دیکھے
کہیں بھی کوئی میرے پھول کا جیسا نہیں نکلا

میں اپنوں کے کمالِ تادر اندازی پہ حیراں ہوں
لگا جو تیر دل میں وہ کبھی ترچھا نہیں نکلا

نقیبِ فصلِ گُل جس کو یقیں کے ساتھ کہہ سکتے
ابھی تک شاخِ حسرت پر وہ اک پتا نہیں نکلا

لگاتا ہوں قبائے زیست میں پیوند پے در پے
یہ وہ گدڑی ہے جس میں سے کوئی ہیرا نہیں نکلا

یہ محفل ہے قمر نقوی، سبھی ہیں آشنا لیکن
ہجومِ دوستاں میں بھی کوئی اپنا نہیں نکلا

○

جوتوں کا کنونشن

نصیر اعظم (واشنگٹن ڈی سی)

نئے سال کی اندھیری رات کی چادر عراق کے زخمی کراہتے وجود پر دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ بغداد سے ۵۵ میل مغرب میں حبانیہ جھیل کے قرب و جوار میں، جو کبھی سیاحوں، بے فکروں، ادیبوں، عام لوگوں، نئے شادی شدہ جوڑوں کی تفریح گاہ ہوا کرتی تھی اس کا پورا احاطہ اب دارالحکومت سے دھکیلے گئے سنی عرب مہاجروں کی بستی بن چکا ہے۔ اسی قدرتی صحرائی نخلستان میں شب کے دو بجے شرقی کنارے کھجوروں کے بیچ پیچھے اداس درختوں کے جھنڈ میں کچھ بے قدرے سائے بکھرائے دھوپ چھپائے ایک جگہ جمع ہو رہے تھے۔ آج انکا اہم اجتماع تھا۔

کاش میں عوتی الزیدی کے پیروں میں ہوتا ایسا سوراخ کرتی اسکے چہرے پر کہ دنیا کا کوئی رفو گر اس کا زخم بھر نہیں سکتا!

چنچل ایک سینڈل پھاپھل کر کڑکڑا کر بولی

اسی جوش اور بے چینی نے ان لوگوں کو یہ دن دکھایا ہے تم کیسے عورتیں؟

عورتیں تو اس پریس کانفرنس میں تھیں ہی نہیں، ایک جہاندیدہ سینڈل بولی۔

"کیسا صاف بچ گیا ـــــ امپورٹس میں ہے" ناگی جوتے نے لقمہ دیا۔

وہ امپورٹس میں نہیں بلکہ الزیدی کے جوتے صاحب سے ہی کی طرف مائل تھے۔ اگر میری طرح ہلکے پھلکے ہوتے تو مجال تھی کہ نشانہ چوکتا! ایک سنہرے سینڈل نے اطلاع دی۔

"یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے وہ بے چارے تو اب ـــــ ایک چپل نے سنجیدگی اور جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ویسے وہ کہاں بنے تھے؟" ایک چمکدار جوتے نے سوال کیا۔

"الزیدی کے بھائی اس بات پر مصر ہیں کہ ان جوتوں کو عراقی مشہور کمپنی الاعداد نے بنایا ہے جبکہ کچھ کا خیال میرے ملک چین کی طرف بھی جاتا ہے مگر میری اطلاع کے مطابق وہ جوتے استنبول کی ایک کمپنی بیدان شوز کمپنی نے بنایا تھا اور اسکا ماڈل نمبر (ڈکتاتی) ۲۷۱ ہے جس جوتے نے اپنے اوپر سے رعب جھاڑتے ہوئے تفصیل بتائی۔

"یہ بھی ایک عجیب واقعہ ہوا اب یہ بڑے لوگ ہم سے بھی ڈرنے لگے ورنہ تو ہماری اوقات ہی کیا تھی؟؟؟؟ ایک پاکستانی جوتا منہ پھاڑ کر بولا۔

"ہمارے ملک میں تو اسکا خوب استعمال ہوتا ہے وہاں چیف منسٹر کو بے بھاؤ کے پڑے تھے، اور پھر اس جوتے کو کئی لاکھ میں خرید لیا گیا تھا۔ ایک اور پاکستانی بوٹ نے داد دیا۔

"میری تو عقل حیران ہے ہمارے ہاں تو ایسا کچھ نہیں ہے" ایک مغربی جوتا کچھ پریشان سا ہو کر بولا۔

"تم لوگ اس بات کو نہیں سمجھ سکتے، ہمارے معاشروں میں کسی کی طرف جوتا پھینکنا، جوتا مارنا، جوتا کر کے بیٹھنا انتہائی بے عزتی کا اشارہ سمجھا جاتا ہے" عراقی جوتے نے بتایا۔

"اچھا تو ہمارے یہاں بھی نہیں سمجھا جاتا مگر اتنا شدید ردعمل؟؟؟"

دراصل اس عمل سے اس نفرت کے لاوے کو باہر نکلنے کی راہ ملی جو پچھلے آٹھ برسوں سے عالمی ضمیر کے آتش فشاں میں پک رہا تھا۔ اب تو بڑے صاحب کو اٹھتے بیٹھتے ہر طرف ہم ہی ہم نظر آتے ہوں گے کل ہی ایک شعر سنا آپ بھی سنئے ایک نوخیز جوتا شوخی سے بولا:

نہیں تیرا نشیمن وہائٹ ہاؤس کے ایوانوں میں
تو بش ہے بسیرا کر جوتوں کی دوکانوں میں

ہمارے ساتھ ساتھ اور کوئی بھی نظر آتا ہے یہ سنئے:

اک عجب سا منظر نظر آتا ہے: ہر طرف ہجوم "منتظر" دکھائی دیتا ہے
کہاں جا کر کریں پریس کانفرنس ہر اک کے ہاتھ میں جوتا نظر آتا ہے

ایک اور جوتے نے ذرا فقرہ اضافہ کیا۔

بھئی کیا ہے یہ جوتا کہانی تو بہت دور تک جائے گی، مراقبے میں گم ایک جوتے نے سر اٹھا کر فلسفیانہ انداز میں کہا۔

اچھا اپنے ننھے لیفٹیننٹس کی کارروائی شروع ہونے والی ہے ایک پرانے جوتے نے آواز لگائی۔ ایک کہن سال بزرگ جوتا کھڑا ہوا اور سب اسکی طرف متوجہ ہو گئے۔

"آج ہم سب یہاں اس لئے یہاں جمع ہوئے ہیں کہ ان بہادر جوتوں کو خراج تحسین پیش کر سکیں جن کا نام رہتی دنیا تک تاریخ کے صفحات میں امر ہو گیا ہے۔ جب جب تاریخ کسی کے مظالم کا ذکر کرے گی تب تب ان دو معصوم جوتوں کا تذکرہ بھی ضرور ہوگا جنہوں نے بغیر ایک لفظ کہے پوری دنیا میں ایک نئی تحریک لمحوں میں پیدا کر دی جس کی کوششیں برسوں سے جاری تھیں۔ یہ صرف ان دو جوتوں کی کرامات تھیں کہ برسوں کا دبا غصہ ایک پل میں نکل کر سامنے آ گیا۔ وہ دونوں جوتے ۱۸ دسمبر کو تباہ کر دیے گئے اس لئے نہیں کہ انہوں نے ایک غیر ملکی صدر تک پہنچنے کی گستاخی کی بلکہ اس لئے کہ اگر وہ جوتے رہ جاتے تو آئندہ نسلوں کے لیے ہر امریکی صدر کے لئے جیتا جاگتا نشانِ عبرت رہ جاتا۔ ہم نے آج ان جوتوں کو بھی دعوت دی ہے جو الزیدی کے جوتوں کی تباہی کے چشم دید گواہ ہیں وہ اس وقت عراقی سیکورٹی گارڈز کے پیروں میں تھے۔ آیئے (جوتے آتے ہیں)۔

میں نے سنا ہے کہ الزیدی نے صحافتی اقدار سے روگردانی کرتے ہوئے معصوم جوتوں کو آلۂ کار بنایا؟ ایک مصری جوتے نے بڑی سیاست سے کام لیتے ہوئے کہا۔ کئی جوتوں نے حیرت اور حقارت سے اسے دیکھا۔

لگتا ہے تم میں انسانوں کی خصلت سرایت کر چکی ہے تمہیں علاج کی ضرورت ہے۔ بزرگ جوتے نے غور دیکھتے ہوئے کہا۔

اور یہ جو ہاتھ کی بنائی گئی ہے کس اخلاقی قدروں کے تحت اور کس نے؟ ایک سینڈل تو فی مصری جوتا خاموشی سے اندھیرے میں کھسک گیا۔ اس جوتا ماری کا ردعمل کیا ہوا؟ ایک فل بوٹ نے سوال کیا۔ شدید! کمسن سال جوتے نے جواب دیا، خود امریکی عوام کو احتجاج کا ایک بہترین راستہ مل گیا، وہائٹ ہاؤس کے سامنے عورتوں کی ایک تنظیم نے اپنے صدر کے پتلے پر جوتا کاری کی، کیپٹل ہل کے سامنے بھی عمل دہرایا گیا، نیویارک میں ایم ٹریک کی ایک میٹنگ کے دوران ایک ورکر نے اپنے سی ای او کے اوپر جوتا تان لیا، یوکرین میں ایک صحافی نے ایک سیاستدان کو جوتا کھینچ مارا اور تو اور اب تو محاورے بھی بن رہے ہیں وہ تو سنا ہوگا: A bird in hand is better than two in bush کی جگہ نیا محاورہ ایجاد ہوا ہے: A boot on Bush is better than two in foot! واہ کیا کمال کے جوتے تھے! کئی تحسین آمیز آوازیں ابھریں۔

ہم سیکورٹی گارڈز کے جوتوں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا الزیدی کے جوتے پریشان تھے؟ اپنے کیے پر شرمندہ تھے؟ عراقی امریکی جوتے نے سوال کیا۔

نہیں انھیں شرمندگی کس بات کی، انھیں حیرت تھی کہ کچھ انسان کس قدر بے حیا بھی ہوتے ہیں۔

ہاں اکثر انسان عام طور پر بے حیا ہوتے ہیں ایک ٹوٹا جوتا کراہا۔

آپ نے پوچھا تھا کہ ان کا نشانہ خطا کیوں گیا؟ اسکا سر کیوں نہ توڑ دیا؟؟؟

دونوں جوتوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، وہ دراصل۔۔۔۔۔

صاف بات ہے جوتے اور صدر دونوں ہی نمبری تھے! ہاہا بے ہنگم ہندوستانی جوتا اپنا کھلا منہ پھاڑ کر اچھلا۔

ایک ہی حمام کے ہیں! انیائی کھڑاویں دھیمے سے کھڑکھڑائی۔

اصل میں۔۔۔۔ سیکورٹی گارڈ کے جوتے نے پھر کچھ کہنا چاہا۔

میرا خیال ہے ڈر گئے ہوں گے۔۔۔۔ جس نے سارے عراق کو تباہ کر دیا وہ ان جوتوں کے ساتھ جو نہ کرتا کم تھا۔ کارک ہیل سینڈل نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

نہیں ایسی بات نہیں ہم نے یہ سوال کیا تھا اور۔۔۔۔ اور انہوں نے کوئی شافی جواب نہیں دیا کیوں؟؟؟ ایک چپل نے بات کاٹ کر غصے سے کہا۔

بھئی آپ لوگ بالکل انسانوں جیسی حرکتیں کر رہے ہیں، جوتوں کی اوقات میں رہیئے سب کچھ سمجھ میں آجائے گا گھسے پٹے جوتے نے سمجھایا۔ جی تو آپ کیا کہہ رہے تھے۔

ہم دونوں نے زیدی کے جوتوں سے پوچھا تھا کہ تم دونوں نے اسے کیوں بچایا، کیوں تاریخ کا ایک موقع گنوا دیا، معلوم ہے انہوں نے کیا جواب دیا؟ انہوں نے کہا کہ ہمیں اپنا انجام معلوم تھا، مانا ہم پاؤں کی جوتی ہیں مگر صاف ستھرے ہیں ہمارا کوئی وقار ہے ہماری بھی کوئی حیثیت ہے اور جس وقت الزیدی نے ہمارے فیتوں کو کھولنا شروع کیا تھا ہم سمجھ گئے تھے کہ اگلا قدم کیا ہوگا اور ہم دونوں نے اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ جانا تو اس دنیا سے بہر حال ہے اور اس واقعہ کے بعد جلد جانا ہوگا سو ہم اپنے آقا کے حضور گندگی اور غلاظت میں لپٹ کر نہیں جائیں گے۔

☆☆☆

- ☆ ترس آتا ہے اُس قوم پر جو عقیدوں سے پُر مگر مذہب سے عاری ہو۔
- ☆ ترس آتا ہے اُس قوم پر جو ایسا کپڑا پہنتی ہو جو اُس کا اپنا بنایا ہوا نہ ہو۔
- ☆ ترس آتا ہے اُس قوم پر جو اپنی کاشت سے تیار کردہ روٹی نہ کھاتی ہو۔
- ☆ ترس آتا ہے اُس قوم پر جو ایسا شروب پیتی ہو جو اُس کے پھلوں سے تیار کردہ نہ ہو۔
- ☆ ترس آتا ہے اُس قوم پر جو دہشت گرد غاصب اور چمک دمک والوں کو اپنا ہیرو مانتی ہو۔

خلیل جبران

☆☆☆

کسوٹی ۲۰۰۸ء

شکیلہ رفیق (کینیڈا)

کسی کو پرکھنا جانچنے کے لیے وقت سب سے بڑی کسوٹی ہے

بچپن سے اماں کے منہ سے یہی سنتے آئے تھے

جو دکھ درد میں، بیماری آزاری میں پوچھے، ساتھ دے وہ تمہارا ہمدرد ہے۔ جو کسی صحت، خوشی کے موقع پر پوچھے، وہ تمہارا مخبر ہے۔۔۔ ہمدرد ساتھی اور دوست ہے۔۔۔ یعنی کہ بقول تمہارے 'REAL FRIEND' ہے انگلش الفاظ بولتے وقت وہ منہ ٹیڑھا کر لیتی تھیں۔

تو سمجھ میں آیا کہ۔۔۔۔ کسی کو پرکھنا جانچنے کے لیے وقت ہی سب سے بڑی کسوٹی ہے!

وہ کہتی رہتیں اور ہم چپ چاپ اثبات میں سر ہلاتے رہتے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت ہم صرف ایک ہی کسوٹی سے واقف تھے وہ تھی۔۔۔ عبداللہ بیگ، افتخار عارف اور قریش پور کی "کسوٹی" جس میں خود کو پرکھنا، جانچنا سمجھنے کے لیے دکھ سکھ، بیماری، کسی چیز کی ضرورت نہ تھی۔ ضرورت تھی تو صرف۔۔۔۔ ذہانت و فہم و فراست کی۔ خیر ذہین تو ہم بھی ہیں اور بچپن سے ہی ہیں۔ مگر ان تینوں کو علم نہ تھا اس لئے ہمیں کبھی اس پروگرام میں بلایا ہی نہیں (جب کہ ان کے پروگراموں کے عنوان سے متاثر ہو کر ہم نے 1990ء میں ایک کہانی "کسوٹی 1990ء" کے عنوان سے لکھی جو بعد میں افسانوں کے مجموعے 'نقارخانے میں کھڑا آدمی' میں شامل بھی کی) جب کہ افتخار عارف اور عبداللہ بیگ تو ہمارے نام سے اچھی طرح واقف تھے۔ البتہ قریش پور شاید ہمیں نہ جانتے ہوں تو اس لاعلمی کو تو ہم انہی کی کم علمی قرار دیں گے کہ اردو کی ایک ممتاز ادیبہ سے ان کی واقفیت نہ تھی۔ اب۔۔۔۔ آپ شاید اس پر معترض ہوں کہ ہم اپنے آپ کو خود ہی "ممتاز" کے لقب سے نواز رہے ہیں تو۔۔۔ اس ضمن میں ہم آپ کو بتاتے چلیں کہ کینیڈا کی رہائش نے ہمیں اور کچھ سکھایا ہو یا نہ مگر اس قسم کے خود ساختہ القابات سے ضرور واقف کر دیا ہے۔ مثلاً ممتاز دانشور، ادیب، محقق، مترجم، افسانہ نگار، شاعر، مزاح نگار کی نئی کتاب شائع ہو کر منظر عام پر آ گئی ہے (ممتاز کے علاوہ مشہور زمانہ، اعلیٰ اور دوسرے القاب بھی ہوتے ہیں) تو جناب! ہم نے تو معصومیت کے ساتھ صرف "ممتاز" کو چنا ہے۔ اب اتنا تو برداشت کرنا پڑے گا ہی آپ کو!!

اگر آپ نے اس سے قبل ہمارا کوئی بھی اس قسم کا مضمون پڑھا ہے تب تو آپ واقف ہی ہوں گے نہیں پڑھا تو ہم بتائے دیتے ہیں کہ ہمیں تمہید باندھنے کی عادت سی ہے۔ اصل موضوع کی جانب ہم قاری کو تھوڑا دیر کرنے کے بعد آتے ہیں۔ قباحت دراصل یہ ہے کہ ہمارے دوسرا کو گذشتہ سات ماہ سے بیمار تھے۔ طرح طرح کے TESTS ہوئے۔ مکرر ہوئی نرسوں نے سر سے پیروں تک کنگھال ڈالا۔ رپورٹیں لے کر اسپیشلسٹ کے پاس پہنچے۔ انہوں نے تمام رپورٹیں دیکھیں پھر ایک رپورٹ پر نظر ڈال کر بڑے اطمینان سے پوچھا:

"پہلا اسٹروک کب ہوا تھا؟" (انگریزی میں)

"پہلا اسٹروک؟؟" اپنے چہرے کے ہوائیاں کو ہم نے خود بھی محسوس کیا۔

"ہاں" ڈاکٹر نے ہمیں یوں دیکھا جیسے ہم سے بڑا جاہل کوئی اور نہ ہو۔

"لے۔۔۔۔ لیک۔۔۔۔ لیکن ہمیں تو کبھی کوئی اسٹروک نہیں ہوا۔"

"یہ رپورٹ تو یہی ظاہر کر رہی ہے۔۔۔۔ جو غلط نہیں ہو سکتا" اب اس کی انگریزی شکل ہو گئی۔

"اچھا!! تو ہمیں تو پتہ ہی نہیں چلا۔۔۔۔ کیوں؟"

"ہاں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ متاثرہ شخص کو پتہ نہیں چلتا۔۔۔۔ کیوں کہ اسٹروک MILD کے ساتھ SILENT بھی ہوتا ہے"

ڈاکٹر نے رپورٹ کے ساتھ انگریزی کو بھی پیچیدہ کر دیا۔ تب ہم نے مزید بحث نہ کی۔ یوں بھی کہوں کے آگے ہم COMPLEX کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور سچ بھی بہت بڑے COMPLEX میں ہیں۔ لہٰذا جواباً بولے۔

"ہاں شاید ایسا ہی ہوا ہے۔۔۔۔ ہمیں پتہ نہ چل پایا"

(ویسے بھی ہم بڑی بڑی آزمائشوں، مشکلوں، ایکسیڈنٹوں جیسے دیگر حادثات سے بڑی آسانی سے گزر جاتے ہیں۔ سو اس 'اسٹروک' سے بھی اس معصومیت سے گزر گئے ہوں گے۔ اچھا آپ بور ہو رہے ہوں گے۔ چلئے قصے کو مختصر کرتے ہیں۔ مختصراً عرض ہے کہ سات ماہ کی ریاضت کے بعد ان پیاں پڑی کہ ہمارے دونوں گھٹنوں کا آپریشن ہوگا۔ ہم تیار ہو گئے۔ سرجری ہوئی اور چاہنے والوں کی دعاؤں سے گھر واپس آ گئے۔ بہت تعجب ہوا کہ ہم جیسی تک چڑھی، ناپسند اور بد مزاج کے لیے بھلا کس نے دعا کی ہوگی؟ ابھی یہ تعجب سوچ ذہن میں آئی ہی تھی کہ۔۔۔۔ اماں کی روح سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

"کسی کو جانچنے، پرکھنے کی سب سے بڑی کسوٹی وقت ہے بٹیا"

"اوہ۔۔۔۔!!!"

اور۔۔۔۔ یقین کیجئے کہ اس طویل عرصے کی جانچ پڑتال اور پرکھنے کی "کسوٹی" کے بعد معلوم یہ ہوا کہ جن سینکڑوں افراد کو ہم اپنا دوست اور خیر خواہ سمجھتے تھے ان میں سے صرف ساڑھے سات افراد (بقول ہماری اماں) ہمارے "REAL FRIEND" ہیں۔ پس ہیں فقط ساڑھے کا اضافہ ہم نے یوں لگایا کہ ان میں سے سات اماں کی کسوٹی پر سو فی صد پورے اترتے ہیں اور ایک کی کسوٹی پچاس فیصد ہے تو کہ یہ "ساڑھے" اچھا نہیں لگ رہا۔ لیکن غنیمت ہے کہ۔۔۔۔ ہے تو! اگر یہ ساڑھے سات بھی پورے نہ اترتے تو ہم بھلا کسی کا کیا بگاڑ لیتے؟

افسوس تو اس بات کا ہے کہ "کسوٹی 1990ء" میں ہم نے جس پاکستان کا نقشہ کھینچا تھا، وہاں اکتوبر برس کا عرصہ گزرنے کے بعد بھی پیارے ملک میں ہنوز وہی حالات ہیں۔۔۔۔ بلکہ شاید۔۔۔۔ مزید خراب۔۔۔۔

ہاں۔۔۔۔ ہم نے ابھی ابھی اُڑتی اُڑتی سنی ہے کہ "کسوٹی" پروگرام پھر سے شروع کیا گیا ہے۔

مگر۔۔۔۔

اگر۔۔۔۔ اس بار بھی وہی سب میزبان ہیں۔ تب پھر ہماری ذہانت تو۔۔۔۔ پھر دھری کی دھری رہ جائے گی۔

☆

''مشرق کی بیٹی''

(محترمہ بینظیر بھٹو شہید کی برسی پہ کہی گئی)

شگفتہ نازلی

(لاہور)

آتی رہیں گی یادؔ وہ تو بینظیر تھیں ہر دل ہوا ناشادؔ ' وہ تو بینظیر تھیں
کیسا سفاک لمحہ تھا جب وہ جدا ہوئیں کیا کر دیا صیادؔ ' وہ تو بینظیر تھیں
جمہوریت کی راہ میں روشن دیئے کئے ہے المیہ رُوداؔد ' وہ تو بینظیر تھیں
کوئی بھی فاصلہ نہیں قُربت مٹا سکا کیسا ہے یہ تضادؔ ' وہ تو بینظیر تھیں
ہر آنکھ اشکبار اُن کے عکس دیکھ کر کس سے کریں فریادؔ ' وہ تو بینظیر تھیں
مشرق کی بیٹی جس جگہ آسودہ خاک ہے دائم رہے آبادؔ ' وہ تو بینظیر تھیں

رؤف خیر

(حیدرآباد دکن)

یہ نوازش جو اشارے کی نکل آئی ہے کوئی صورت تو گزارے کی نکل آئی ہے
وہ مجھے دیکھ لیا کرتا ہے گا ہے گا ہے آس کیا کیا نہ سہارے کی نکل آئی ہے
نیند کر دے نہ کہیں مشرق و مغرب کی حرام چیخ اک درد کے مارے کی نکل آئی ہے
برف زادے ہیں مقاماتِ مقدس کے حریف آزمائش بھی شرارے کی نکل آئی ہے
آسماں سونپ دیا اس نے زمیں کے بدلے پا بجائی یہ خسارے کی نکل آئی ہے
بھول بیٹھے تھے بہت' پھول بہت بیٹھے تھے اب ہوا ان کے غبارے کی نکل آئی ہے
ہم نے تو پھول کھلانے کی بہت کوشش کی راہداری تری گارے کی نکل آئی ہے
کاش اے خیرؔ وہ تخلیق ہماری ہوتی جان جو سارے شمارے کی نکل آئی ہے

عدیل شاکر

(اٹک)

اک دوجے کو آئینہ دکھائیں چلو آؤ یہ آخری تکلیف اُٹھائیں چلو آؤ
یوں ہے کہ منافع کا تو امکاں بھی نہیں ہے نقصان کا اندازہ لگائیں چلو آؤ
مدّت سے کھنڈر دل کا بھی ویران پڑا ہے کچھ دیر یہیں خاک اُڑائیں چلو آؤ
بےجال تھیا دوں کے بچھائے بھی نہ اب کے دشمن کی چلی چال میں آئیں چلو آؤ
اس تک ہے سفر لاکھ سرابوں سے مزیّن شاکرؔ نہ کہیں خود سے بھی جائیں چلو آؤ

○

ڈاکٹر نثار ترابی (راولپنڈی)

ایک میں ہی وہاں نہ تھا تنہا　　مجھ کو ہر شخص ہی ملا تنہا
آ گیا لے کے بھیڑ میں مجھ کو　　وہ مجھے اور کر گیا تنہا
کرتا میں کس سے گفتگو تیری　　رنج جو بھی ملا سہا تنہا
جو ترے ہجر کا فسانہ تھا　　میں نے دیوار سے کہا تنہا
روبرو ساری عمر رہتا ہے　　اپنے ہی بخت کا لکھا تنہا
جھومتا جاتا ہوں خدا جانے　　مل گیا راستے میں کیا تنہا
عکس کے سامنے ہے شرمندہ　　آئینے کر کے آئینہ تنہا
خامشی ہی قبول کر لیں گے　　لوٹ آئے گی جب صدا تنہا
اپنے اپنے سفر پہ رہتے ہیں　　ظلم کی رات اور دیا تنہا

حفیظ انجم کریم نگری (کریم نگر بھارت)

کلی دھیرے سے مُسکائی تو جانا　　کمر کچھ اور بل کھائی تو جانا
مجھے تیری ضرورت آج بھی ہے　　تمنا میری بر آئی تو جانا
تھا راحت کا خزانہ میرے حق میں　　خوشی خود چل کے گھر آئی تو جانا
مرے آنسو سمندر ہو چکے ہیں!　　لگی جب پیر کو کائی تو جانا
خوشا منزل قریب آنے لگی ہے　　طبیعت اور گھبرائی تو جانا
یہاں اچھوں کو بھی کہتے بُرا ہیں　　ملی مجھکو بھی رسوائی تو جانا
مجھے ملاح سے شکوہ نہیں ہے　　میں ہو کر غرق گہرائی تو جانا
کوئی مصرعہ نہیں ہے ذہن میں کیوں؟　　کسے کہتے ہیں تنہائی تو جانا
یہ بجلی روشنی اور ناچ گانا!!　　وہ محفل آ کے گرمائی تو جانا
بھکاری ووٹ کے آنے لگے ہیں　　یہ ٹولی گھر مرے آئی تو جانا
اِسی کا نام ہے سچی محبت!!　　کسی نے زندہ چنوائی تو جانا
الیکشن آ گیا ہے سر پہ انجم!!　　اُسے چیا ترا بھائی تو جانا

مظہر بخاری (میاں چنوں)

جب ظلم دہر کے لیے ناسور ہو گیا　　سرمد کوئی بنا، کوئی منصور ہو گیا
سورج کی روشنی میں ہوا خواہشوں کا قتل　　دن بھی مرے لیے شبِ عاشور ہو گیا
پہلے تو اس نے بچوں کو تلقینِ صبر کی　　پھر خون بیچنے پہ وہ مجبور ہو گیا
مہنگائی کے خلاف جو ہڑتال کی گئی　　سرمایہ دار دشمنِ مزدور ہو گیا
سورج کی پہلی ضرب کے پڑنے کی دیر تھی　　یک لخت رنگِ تیرگی کافور ہو گیا
مظہر خزاں نے گرد اُڑائی کچھ اس طرح　　گلشن تمام چہرہ بے نور ہو گیا

○

ڈاکٹر جواز جعفری

(لاہور)

وہ بہتے پانی پہ پھول اُگائے، حباب رکھے — وہ اپنی دنیا کا جو بھی چاہے نصاب رکھے
کبھی تو میری خزاں پہ تُو بھی نظر کرے گا — یہ سوچ کر تیرے راستوں میں گلاب رکھے
ترے وسیلے سے آنسوؤں سے ہوا تعارف — ترے حوالے سے ہم نے آنکھوں میں خواب رکھے
میں اُس کے باغِ بدن سے باہر پڑا ہوا تھا — وہ سو رہا تھا سرہانے میری کتاب رکھے
کھڑا ہے کیسے سروں پہ یہ آسماں کا خیمہ — میں تک رہا ہوں زمیں پہ چوب اور طناب رکھے
اگر وہ چاہے تو بستیوں میں مجھے بسائے — اگر نہ چاہے تو میرا خانہ خراب رکھے
برائے شب خوں کیے الگ منتخب سپاہی — بچے تھے باقی جو لشکری ہمرکاب رکھے
شبِ سیہ تھی میں اُس کو حیرت سے تک رہا تھا — گذر رہا تھا وہ ہاتھ پر ماہتاب رکھے
بسائے اس نے کئی نگر آسماں سے باہر — جوازؔ کتنے جہاں ہیں جو زیرِ آب رکھے

ملک زادہ جاوید

(نوئیڈہ بھارت)

وہ پرندہ ابھی اُڑان پہ ہے — اک سجاوٹ سی آسمان پہ ہے
آگ اُگلتی گھر کی دیواریں — خیمہ زن دھوپ سائبان پہ ہے
کام سے لوگ جانتے ہیں مجھے — منحصر کون خاندان پہ ہے
ڈولتی ہے اِدھر اُدھر کشتی — سارا الزام بادبان پہ ہے
تیری قسمت کا فیصلہ جاویدؔ — اُسکی آنکھوں کے امتحان پہ ہے

زیب النساء زیبی

(کراچی)

دل ٹھہر جائے مرے پاس اگر تم ٹھہرے — میرے سینے میں جو برپا ہے تلاطم ٹھہرے
کچھ تو آرام ملے دل جو کوئی دم ٹھہرے — یہ سینے میں مسلسل ہے تلاطم ٹھہرے
روزہ کیا رکھ ہی لیا آپ نے خاموشی کا — کھولئے اپنی زباں آپ تو گم صم ٹھہرے
میری اس بات کا زاہد نے دیا کچھ نہ جواب — تیرے ایمان کی قیمت میں اگر خُم ٹھہرے
اَب کسی شخص پہ اپنا تو بھروسہ بھی نہیں — جن سے تھے خون کے رشتے وہ تو ہم ٹھہرے
ڈھونڈتے رہتے ہیں زیبیؔ کو یہاں کے آثار — اس نگر کے ہمی وارث تھے ہمی گم ٹھہرے

○

علی آذر

(کراچی)

بڑی تاب و توانائی سے صبح دم نکلتا ہے　　جو شام آتی ہے، سورج خونِ دل اپنا اُگلتا ہے
اے مُشتِ خاک، ہے کس بات کا تجھ کو بھرم اتنا　　پتا چلتا نہیں انسان لمحوں میں بکھرتا ہے
تھی جس کی چال مستانی ابھی کچھ سال پہلے ہی　　ذرا سی دیر کو وہ شخص چلتا ہے ٹھہرتا ہے
وہ جسکو کاندھے پہ لے لیکے گلیوں میں نکلتا تھا　　وہ اونچا ہوگیا ہے مجھ سے، مجھ پر ہی بگڑتا ہے
جو تکوے چاٹنے میں ''رامسس'' کے تیز ہوتا ہے　　عجب ہے دیس میں اپنے وہی رہبر تو چلتا ہے
ملا ہوتا نہیں جو شخص سینے سے لگاتا ہے　　وہ دھوکہ دیکے جاتا ہے جو بانہوں میں مچلتا ہے
محبت بانٹتا ہے وہ جسے ملتی محبت ہے　　جسے ٹھکرایا جاتا ہے وہ ہی نفرت اُگلتا ہے
علی آذر کی باتوں کا بُرا مت ماننا ہم دم　　سیا داں ہے یہ اپنے آپ سے اکثر اُلجھتا ہے

اختر رضا سلیمی

(اسلام آباد)

ہٹ رہی ہے زمین محور سے　　کون اٹھا مرے برابر سے
روز اُگتی ہے اک نیا سورج　　رات روشن ہے کتنی اندر سے
خون میں گھل رہا ہے سبزہ سا　　آنکھ چپکی ہوئی ہے منظر سے
اس نے اک اسم پڑھ کے پھونکا اور　　میں نکل آیا اپنے اندر سے
اب کے ہے سخت معرکہ درپیش　　جیت ممکن نہیں بہتر سے
کچھ نہ کچھ اور بھی بتانا ہے　　میں نہیں مطمئن میسر سے

ماہر اجمیری

(میرپور خاص)

مجھے تو اس پہ حیرانی بہت ہے　　کہ شہروں میں بھی ویرانی بہت ہے
یہ کیا ہے کہ ہر اک چہرے سے ظاہر　　خوشی کم اور پریشانی بہت ہے
کسی طوفاں کا ہے یہ پیش خیمہ　　سمندر میں جو طغیانی بہت ہے
جلاؤ شمعِ الفت طاقِ دل میں　　کہ شبِ نفرت کی طولانی بہت ہے
اخوت کی جہاں گیری کہاں اب　　کدورت کی فراوانی بہت ہے
بجھائیں گے ہم اپنی آتشِ دل　　ہماری آنکھ میں پانی بہت ہے
بڑی دشوار ہے راہِ محبت　　بظاہر اس میں آسانی بہت ہے
قلم یہ سوچ کر ماہر اٹھانا　　کہ تحریروں پہ نگرانی بہت ہے

○

کرشن پرویز

(روپڑ بھارت)

دل و نگاہ کی حسرت سلام کہتی ہے　　قبول ہو میری الفت سلام کہتی ہے
دھڑک اٹھا میرے سینے میں دل قیامت کا　　یہ کس کی نگہ شرارت سلام کہتی ہے
گھٹاؤ جا کے کھلے گیسوؤں سے یہ کہنا　　کسی غریب کی قسمت سلام کہتی ہے
نظر لگے نہ ترے حُسن کو فرشتوں کی　　زمیں تو کیا تجھے جنت سلام کہتی ہے
میں ایک ذرّہ ہوں پرویزؔ تیری دنیا میں　　تمہیں تو عرش کی عظمت سلام کہتی ہے

ازہر منیر

(لاہور)

کاش کرتے خیال تھوڑا سا　　سوچ لیتے مآل تھوڑا سا
اپنے جی کو سنبھال تھوڑا سا　　کام ہے گو مُحال تھوڑا سا
صبح ہوتے بہل ہی جائے گا　　یہ دلِ پائے مال تھوڑا سا
جھوٹا وعدہ ہی کر لے آنے کا　　کر دے مجھ کو نہال تھوڑا سا
تو ہے یکتا اگر زمانے میں　　میں بھی ہوں بے مثال تھوڑا سا
غم ہی لکھتے مرے مقدر میں　　رکھتے پر اعتدال تھوڑا سا
پچھلے برسوں سے مختلف ہوتا　　کاش یہ ایک سال تھوڑا سا
خیر حق تو مرا بھی تھا تجھ پر　　اے سراپا جمال! تھوڑا سا
اتنی خوشیوں کے باوجود ازہرؔ　　کیوں ہے دل میں ملال تھوڑا سا

تصور اقبال

(پنڈی گھیب)

ملے اک بار پھر ملنے کی عادت ہوگئی تم سے　　تصور بس اُسی دن سے محبت ہوگئی تم سے
تجھے پھولوں کی حسرت تھی مجھے کانٹوں سے رغبت تھی　　ذرا سی بات پر اَن بَن کی صورت ہوگئی تم سے
تری قربت میں دُوری کا بھی ایک احساس رہتا تھا　　چلو اتنا ہوا کچھ تو رفاقت ہوگئی تم سے
تری محفل میں غیروں کا چلے آنا نہیں اچھا　　اسی اک بات پر جاناں شکایت ہوگئی تم سے
تمہارا یوں بوقتِ نزع ملنے کو چلے آنا　　''ہماری موت کتنی خوبصورت ہوگئی تم سے''

○

رپورتاژ ۔۔۔ نگیں گُم گشتہ

طاہرہ اقبال (فیصل آباد)

(قسط نمبر ۲)

مزدوروں کی گھسی پٹی دھوتی نما ساڑھیاں بھی اتنی ہی بوسیدہ رہیں گی جس میں سے جھانکتے ہوئے سانولے پنجر اتنے ہی سنگلاخ رہیں گے جتنے کہ وہ ہیں، گوشت کی قلت سے مسمار ہوئے ڈھانچوں کو بنگال کا جادو تو ہم بتانے سے رہے۔

اگر یہی بنگال کا جادو ہے تو پھر اس سے تو پنجابی عورتوں کا جادو کہیں پُر اثر ہے کم از کم ہڈیوں پر گوشت تو چڑھا ہے اور ان پر لباس بھی۔ البتہ 71 کے بعد کی پیداوار ایک کمسن نے بڑھ کر پوچھا۔ اس بات میں کچھ نہ کچھ رومانیت ضرور تھی۔

"Sister from where you have come."

پنجابی کیوں منہ سے نکلا۔

"پاکستان" شاید کمسن کی ماں ہماری طرف ہی کھچی تھی لیکن وہ تو ایک کندھے سے دوسرے کندھے پر منتقل ہوئی تھی اور 71 کے بعد کی نسل والا بندوق بردار کہہ رہا تھا۔

"او پاکستان We Love Pakistan." افسوس ہوا اتنے دنوں یونہی اپنی شناخت چھپاتے رہے۔ اردگرد کی کوٹھیوں سے مزید چار پانچ کمسن قریب آ گئے لیکن وہ تو سارے 71 سے پہلے کے یا 71 کے دوران پیدا ہونے والی نسل سے تھے۔ اُن کے چہروں پر نہ خوش آمدید کی مسکراہٹ تھی نہ وہ میزبانی والی طمانیت تھی۔

ساری گفتگو بالکل سیدھی لیکن لہجے میں خفیہ ایجنٹ جیسی تحقیق تھی۔ From which city.

حلق کی گڑگڑاہٹ سے جسے اسلام آباد سمجھا گیا فوراً اسلام کا لبادہ اوڑھا۔

"ہم سب مسلمان بھائی ہیں۔ ہم ایک تھے۔ ہم اب بھی آپ کو اپنا ہی سمجھتے ہیں۔ ہم بھائی بھائی ہیں۔" 71 کے بعد والے کمسن نے ان باتوں پر پسندیدگی کا اظہار کیا اور ایسے ہی جذبات کا جوابی اظہار کرنے کی کوشش کی مگر 71 کے پہلے والے چہروں کی کرختگی نے ہمیں وہاں سے رفو چکر ہونے پر مجبور کر دیا۔ ریل کے درختوں کی نشانیاں پہچان پہچان واپس پلٹے۔ سوچا آئندہ وہاں نہیں جائیں گے کیا پتہ۔۔۔ تو پھر کہاں جائیں گے۔ مسلمان عورتیں گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں نکلتیں۔ چار دیواری کے تحفظ میں بالکونی سے جھانکنا ہی محفوظ ترین ہے جس کے سامنے ڈھاکہ شہر بچھا ہوتا۔ گلشن کے تعمیر ہوتے ہوئے مکانات بڑھ رہے ہوتے۔ یہاں کی سب سے بڑی انڈسٹری اس وقت کنسٹرکشن ہے۔ فلیٹ بنا کر کرائے پر دینا بڑا بزنس ہے۔ سارے بنگال سے لوگ ادھر ڈھاکہ کھنچے چلے آتے ہیں۔ ہمارے ٹیکسی ڈرائیور نے کہا تھا۔ چلو یہاں انہیں کھانے کو تو مل جاتا ہے۔ مزدوری مل جاتی ہے۔ مزدوروں کے لیے یہاں ایک ڈھابا بھی تھا جس پر چائے ملتی تھی اور کیک رس اور سلے بسکٹ بھی بالکل ویسے جیسے ہمارے مزدوروں کے ڈھابوں پر ہوتے ہیں۔ نیچے سڑک پر سائیکل رکشے چلتے اور ان کے ساتھ سروں پر چھابڑیاں اٹھائے سبزی فروش، برتن فروش اور پتہ نہیں اور کیا کیا فروش ہوتے۔ جی یہ تو پنجابی جاتیں پر ہوکا سمجھ آتا۔

فلیٹس کی چھتوں پر بڑے باغیچے ہرے بھرے تھے جن کے گیٹ بار بار کھلتے ہوئے گاڑیاں اندر باہر آتی جاتی رہتیں۔

ہر فلیٹ کی بالکونیوں میں ہوائیں شام پڑے کپڑے سے استری کرتی تھیں۔۔۔ مزدور عورتوں کی نسبت ذرا کم مسلی ہوئی ساڑھیاں، جن کے ذرا ذرا بلاؤز سے پسلیوں میں دھنسے ہوئے سانولے پیٹ جھلکتے تھے اور ایڑیوں پر چٹی کوٹ جھلاتے یہ سست سست حرکات، ہلکے ہلکے قدم جیسے ساڑھی کے لبادے کا جزو لاینفک ہو۔ پتہ نہیں ساڑھی میں تیز تیز کام اور بھاگ دوڑ کیسی لگتی ہوگی پھر وہ ساڑھی نہیں دھوتی معلوم ہونے لگتی ہوگی۔ یہ ساتی عورتوں کا دھیما دھیما سبھاؤ۔ پیٹ در پیٹ ساڑھی کی تال کے لہراؤ جیسے کھلے کھلے گلوں میں کچے کچے پھولوں کی گجریں بندھی ہوں اور لمبے چوڑے بالوں کا گھر اور سر پر ٹانکا ہو۔

ڈاکٹر فوزیہ نے کہا تھا۔ بنگالنیں نفرت سے کہتی ہیں پاکستانیوں کی شلواروں میں سے ٹخنے نظر آتے ہیں۔ شرم نہیں آتی پنڈلیاں تک جھانک جاتی ہیں۔ پر پیٹ جھانکنے سے تو پنڈلیاں جھانکنا زیادہ بہتر ہے، وہی پرانی روایت کہ دوسرے کا عمل قابل مذمت اپنا عمل قابل فخر، دوسرے کی رہت رواج قابل شرم اپنی روایات قابل تقلید۔ انسان اپنی ذات کے خول سے نہیں نکل سکتا، کوئیں کا مینڈک کوئیں کی دیواروں کو ہی اپنے وجود کی ڈھال بنا لیتا ہے پر مجھے تو بڑا اچھا لگتا۔ پیٹ اور کمر تو ساڑھی میں سے جھلکیاں مارتے لیکن سروں سے پلو کبھی نہ ڈھلکتا۔ پاکستانی پولیس کی معاونت کرنے والی لڑکی کا خوبصورت پیٹ سارے کا سارا جھانکتا لیکن پلو میں لپٹی لمبی چوٹی بہت کم دکھائی دیتی۔ پیروں پہ جھولتا چٹی کوٹ کبھی ساڑھی کے ہم رنگ نہ ہوتا اور بیگ کندھا پچا ہوا ہوتا۔ پتہ نہیں اُسے سیدھا پہننے کی فرصت کیوں نہیں ملتی تھی اُسے۔ جس کی نوجوان عمر ابھی غربت کے دیمک کے سامنے ڈھال بنی تھی جس نے اس کی ہڈیوں کو کھوکھلا ہونے سے بچا رکھا تھا اور گالوں کا رنگ ابھی برقرار تھا جو مچھلی کے جسم اور ناریل کے تیل کے ہم رنگ تھا۔ اس سے بات کرنے میں دو باتیں مانع تھیں، ایک زبان اور دوسرا یہ خوف کہ کہیں کچھ مانگنا نہ شروع کر دے۔

کیونکہ وہاں بھی پاکستان کی طرح مانگنے والے بہت ہیں۔ بالکل ویسا ہی انداز چھوٹے چھوٹے سوئے ہوئے بچے کندھے سے لگا کر مانگنا۔ کٹی معذور اور ننگ سائیں بنا گاڑیوں کے گرد اکٹھے ہو جانا۔ اماں اماں کہہ کر پیچھے بھاگ پڑنا۔

لیکن اس وقت تو میرے سامنے گلشن ٹو کی سڑک نمبر 43 کی بلڈنگ نمبر 24 کے فلیٹ نمبر G-10 کی بالکونی کے سامنے پھیلا ڈھاکہ شہر ہے۔ سارا گیلا، سبزے اور جھیلوں میں ڈھکا ہوا جن کے اندر سے عمارتیں اور فیکٹریاں بلند ہو رہی ہیں۔ جب میں نے اپنے میزبانوں کے سامنے حسرت سے کہا کہ میں جا کر لکھوں گی میں نے ڈھاکہ بالکونی سے دیکھا تو اس بات کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے روز پاکستان ایمبیسی کے پیلے نمبر پلیٹ والی گاڑی ہمارے اپارٹمنٹ کے باہر کھڑی تھی جس نے ہمیں آج ڈھاکہ کی سیر کروانی تھی۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ بچے جھولوں والے پارک دیکھنا چاہتے تھے، میں تاریخی اور ثقافتی ڈھاکہ دیکھنا چاہتی تھی اور اقبال صاحب شاید ڈھاکہ فیکٹری کے علاوہ کچھ بھی نہ دیکھنا چاہتے تھے لیکن جیتے آخر بچے ہی۔ طے پایا آج ہم پارک دیکھیں گے لیکن ہر پارک کا فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ تیس چالیس کلومیٹر دور جانا پڑتا۔ سڑک کے اطراف میں دھان کے کھیتوں کا لمبا سلسلہ چلتا، میں پوچھتی یہ ڈھاکہ کا مضافات ہے لیکن ہمارا ڈرائیور فوراً تردید کرتا۔ نہیں یہ ڈھاکہ ہے۔ بہت پھیل گیا ہے۔ زمین اتنی مہنگی ہے کہ نہ پوچھیں۔ یہ انجلو اردو بول سکتا تھا۔

چونکہ یہاں جگہ کی قلت ہے اس لیے پھیلاؤ سے زیادہ شہر اونچائی میں بڑھ رہا ہے۔ جگہ جگہ کالونیز بن رہی ہیں۔ لوگ ڈھاکہ بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ یہاں ٹیچنگ یونٹ بہت زیادہ موجود ہیں۔ جہاں لاکھوں مزدور مرد و عورتوں کی کھپت ہے۔ بنگلہ دیش نے پروسیسنگ اور ٹیچنگ میں بڑا نام کمایا ہے لیکن اس جدید ڈھاکہ کے پس منظر میں وہی قدیم بنگال آباد ہے۔ چھوٹے چھوٹے گھر جن میں جوٹ کی چٹائیاں بچھی تھیں۔ سستے رنگ، جٹ اور چائے کے کالے کپ جنھیں بجھاتے دیکھے، ٹوٹی ہوئی کمروں والے پیالے وغیرہ۔ لیکن ان سے پرے دھان کے وسیع کھیت اور ہر تین چار کھیتوں کے ساتھ ایک جوہڑ نما جھیل، جس میں پانی سٹور ہوتا ہے اور جب بھی دھان کو پانی کی ضرورت پڑتی ہے تو پمپ لگا کر اس جوہڑ سے پانی کھیتوں میں منتقل کر لیا جاتا ہے۔

دھان کے پودے ابھی ننھے منے تھے۔ بلکہ کئی جگہوں پر تو نیریاں لگ رہی تھیں جن کی رنگت ابھی انگوری تھی۔ گہری سبز نہ ہوئی تھی۔ ایسی ہی ایک تصویر ہمارے میزبانوں کے ڈرائنگ روم میں لگی ہوئی تھی جنھوں نے بتایا تھا۔ پورا بنگلہ دیش بس ایسا ہی ہے۔ ایسے ہی دھان کے کھیت اور ان کے ساتھ پانی کے جوہڑ اطراف میں بہتی ہوئی بوڑھی گنگا جو پورے ڈھاکہ کے گرد گھومتی تھی جس کے گرد و نواح میں چھوٹے چھوٹے گھر تھے۔ چار پانچ گھروں کی بستی کے سامنے پانی کا جوہڑ ہوتا جسے عبور کرنے کے لیے رسیوں میں بندھے ہوئے دو بانسوں کا جھولتا ہوا پل تھا بالکل ایسے جیسے ہمارے ہاں مداری کا کرتب دکھانے والے بانسوں، رسیوں پر چلتے ہوئے تماش بینوں سے تالیاں بجواتے ہیں۔

ڈھاکہ کے چاروں اطراف طواف کرتی بوڑھی گنگا کو ہم نے عبور کیا جس میں کشتیاں لیے لنگر سے ملاح اس اُمید میں تھے کہ ہم کشتی کی سیر کریں گے لیکن کشتی کی سیر ہمارے آج کے پروگرام میں شامل نہ تھا۔ ہمیں تو شہید جنار پہنچنا تھا۔ تقریباً چالیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم شہید جنار میں تھے، جہاں داخل ہوتے ہی ایک فوجی جیپ میں ہمیں پاکستانی شکلیں نظر آئیں جنھوں نے ہمیں دیکھ کر مسکراہٹیں دیں۔ دیارِ غیر میں ــــ ہم وطنی کا احساس بھی کیا خوبصورت تجربہ ہے کتنا بڑا رشتہ، کیا اَن ٹوٹ تعلق، تو بھی پاکستان ہے میں بھی پاکستان ہوں، اور پاکستان میں پنجابی، سندھی، بلوچی، پٹھان اور پنجاب میں سرائیکی، مہاجر، بنگالی ــــ

سنتے سنتے ہم ایک ذرا سی بستی اور پھر ایک خاندان اور پھر ایک گھر اور ایک فرد اور چلتے چلتے "لک، بڑا عظیم دنیا" یہ انسانی فطرت بھی اپنی ہی خصلتوں اور اغراض سے گرفتی رہتی ہے۔ صدر شہید جنار کی بلند عمارت کے باہر جوتے اتار کر اندر جانے کی اجازت تھی لیکن ہم نے عمارت کی ثقافت اور طوالت کو دیکھنے پر ہی اکتفا کیا۔ عمارت کے گرد بڑے بڑے قطعات گھاس سے ڈھکے تھے جن کے اطراف میں پھول کھلے تھے اور جن کی دیواروں پر Grave Yard کی تختیاں لگی ہوئی تھیں اور نا دہی کا ہیچ تقسیم کرتا بورڈ یہ بتاتا تھا کہ پاکستانی فوج نے یہاں تین ملین بنگالی حریت پسند مار دیئے تھے اور یہ ان کی اجتماعی قبریں ہیں۔ البتہ ہم نے ان اجتماعی قبروں پر کسی کو فاتحہ خوانی کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ لوگ یہاں ایسے ہی گھوم رہے تھے جیسے کسی تفریحی مقام پر آئے ہوں۔ وہ بڑے بورڈ پر مختصراً تحریکِ آزادی کی تفصیل لکھی گئی تھی اور وہ انگریزی میں تھی۔ یہ واحد بورڈ تھا جو انگریزی میں لکھا ہوا نظر آیا۔ ورنہ ہر ادارے، بلڈنگ، ہوٹل، دکان کا ماٹو، گاڑیوں کی نمبر پلیٹیں تک سب بنگلہ میں لکھی ہوئی تھیں اور سمجھ نہ آتا تھا کہ یہ کسی دفتر کی عمارت ہے کہ سکول ہے کہ گھر ہے۔ بہت کم کوئی تحریر یہاں انگریزی میں نظر آتی تھی۔

اپنی ہی تقسیم کی کہانی ہم نے خود ہی پڑھی۔ ان Yards Grave کے ساتھ ساتھ تالاب، اونچی اونچی پکی دیواروں میں مقید تھے، مچھلیوں کو تو آزادانہ گھومنے پھرنے کی اجازت تھی لیکن تالابوں کو چار دیواریوں میں بند کر کے رکھا گیا تھا۔ اُن کے اطراف میں گراسی قطعات تھے۔ بقول پمفلٹ یہاں سب انسان دفن تھے۔ ہمارے اپنے مسلمان ہم وطن جنھیں مسلمان ہم وطنوں نے مارا تھا۔ کاش ایسا نہ ہونے دیا جاتا، کاش جیتنے والوں کو اپنی رضامندی سے اقتدار دے دیا جاتا۔ کاش محرومیوں کا احساس پیدا کرنے والوں

کو بروقت سرزنش کی گئی ہوتی' کاش کدورتیں اور منافرتیں جذبہ خیر سگالی سے دور کرلی جاتیں' یہ کاش بھی کتنا ظالم لفظ ہے۔ تیز دھار آرے سے اعادل کیا جاتا ہے۔ کتنے کاش تھے جن کے ڈھندلکے میں سے شہید مینار کی عمارت اپنی تمام تر حقیقتوں کے ساتھ اپنا دور ایک کرواری تھی' جہاں لوگ جوتے اتار کر داخل ہو رہے تھے' جو پاکستانی قوم کی بربریت کی نشانی بنا ہوا تھا اور بنگالیوں کی مظلومیت اور آزادی کی علامت' پتہ نہیں یہ سب مشرقی پاکستان کے باغیوں کی آماجگاہ رہا تھا کہ بنگلہ دیش کی کتنی کے شہدا کی یادگار۔ تاریخ بھی کتنی بے اعتباری شے ہے۔

فوجی گاڑی میں سوار پاکستانی خاندان ہمارے سامنے آ گیا۔ بڑھ کر ملے۔ پردیس میں ہم وطن کا ملنا جیسے مدتوں کے کھوئے ہوئے مل جانے کا اچانک ملاپ۔ یہ ایک بریگیڈیئر صاحب تھے جو یہاں ملٹری سٹاف کالج میں ایک سال کے کسی کورس پر تھے جنہوں نے بڑے دکھ سے کہا تھا۔ "ہمارا یہاں شہید مینار پر آنے کا کیا تک ہے لیکن آنا چاہئے دیکھنا چاہئے یہ لوگ کیا سوچتے ہیں کیا کہتے ہیں ہمارے متعلق۔۔۔"

مسز بریگیڈیئر نے انگریزی میں بات کی۔ بھلا یہاں انگریزی بولنے کی کیا تک بنتی ہے' جب ہم دکھ کا اشتراک کرتے ہیں پھر تو ہوا سے اپنے باطن سے بولتے ہیں اور ہر بناوٹ اور تصنع سے گزر جاتے ہیں۔ اپنی اصل اور حقیقت کے ساتھ آمنے سامنے آ جاتے ہیں۔

یہاں تو ہم ایک قومی اور رنجی دکھ کا اشتراک کر رہے تھے ہم جلد ہی اردو پر آ گئے اپنی اصل میں لوٹ آئے۔

مسز بریگیڈیئر نے انگریزی کو کچھ دیر گھسیٹا لیکن اردو کہ پہلے لوگ تو اپنی زبان کی محبت میں شرابور تھے اور یہ اور نا جاری ہی تو اسی زبان کی محبت کی دین تھا۔ پتہ نہیں ہم لوگ اپنی قومی اور مادری زبانیں بولتے ہوئے اس قدر شرمسار کیوں ہو جاتے ہیں۔

بریگیڈیئر صاحب کہہ رہے تھے۔ "سقوط ڈھاکہ کے بعد مجیب الرحمن نے یہاں تقریر کی' کہا کہ اُسے بتایا گیا کہ پاکستانی فوجیوں نے یہاں تین لاکھ بنگالی مار دیئے لیکن اُس کے منہ سے نکل گیا۔ تین لاکھ انسان مار ڈالے گئے جو اُس کے منہ سے نکل گیا وہی تاریخ ہو گیا۔ کوئی ان اعداد و شمار کو چیلنج نہیں کر سکا۔ کوئی سند ثبوت نہیں مانگ سکا۔ نہ ہی کوئی ہے لیکن ہم اُن کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں کہ آپ صحیح کہتے ہیں۔ بالکل درست فرماتے ہیں۔ ہم کیوں اختلاف کریں' تاکہ وقت خود حقائق سامنے لے آئے گا لیکن ابھی تک حقائق خود بخود کیوں نہ سامنے آئے۔ ایسا بھی تو ہوتا ہے۔ بعض اوقات گدلا پانی تھمنے کی بجائے آلائشوں کو خود میں گھول کر جذب کر لیتا ہے اور سطح پر کائی جم جاتی ہے۔ اس کائی کو توڑنے کے لیے تازہ پانی کا دخول ضروری ہو جاتا ہے ورنہ پانی اور آلائش یک جان ہو جاتے ہیں۔

کاش کوئی تو ہو جو سچ اور حق کو نکھارے کوئی تو ہو جو قصوروار کی سزا تجویز کرے اور بے قصور کو بریت دے لیکن جہاں مجرم طاقتوں کے ہاتھ کل کے منصف مقرر ہوتے ہیں وہاں یہ کیسے ممکن ہے۔ ڈھاکہ شہر میں ایک جوتوں والی دکان کے سیلز مین نے جب پوچھا تھا: "From which country, do you belong?"

ہمارے جواب پر کہ پاکستان اُس نے انتہائی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ہما پاکستان "We Love Pakistan, but our Government.

اور کپڑے کے سٹال پر ہمیں میکسی فروخت کرنے کی کوشش کرنے والے سیلز مین کو جب ہم نے کہا۔

"We don't use maxy because we are Pakistani."

تو سارے سیلز مین اس قدر ہنسے تھے کہ ہم پریشان ہو گئے اور ٹھیک آدھے قہقہوں کے درمیان ہم یوں بھاگ نکلے تھے اور وہ مسکرایا تھا۔

"عشق نفس کے مارا ہوا یا لوگوں نے"

بریگیڈیئر صاحب کہہ رہے تھے۔ ان کا ہمارے ساتھ Hate Love and والا رشتہ ہے' یہ ہم سے محبت بھی کرتے ہیں اور نفرت بھی۔ جب ضیا محمود وغیرہ دیتا ہے تو انہیں اپنی بقا پاکستان یاد آتی ہے اور موجودہ لیڈر بھی' لیکن جب اُدھر سے تنگی ملتی ہے تو پھر انہیں شہید مینار والے گراؤنڈ پر قتل کیے گئے تین لاکھ گنتی انہی کے بتایا جاتے ہیں اور تحریک آزادی کے دوران اور پہلے روا رکھے گئے پاکستانیوں کے بے پناہ مظالم۔

بریگیڈیئر صاحب کے ہمراہ گائیڈ کے فرائض سرانجام دینے والا بنگالی کیپٹن دور کھڑا ہمارے تاثرات سے شاید ہماری گفتگو کا رخ پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

بریگیڈیئر صاحب کی آواز سرگوشی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ سامنے "شہید مینار" کی گول عمارت پر پھیلائے کھڑی تھی۔ بریگیڈیئر صاحب اس عمارت کی تعمیر میں کہاں تک شریک کار رہے ہوں گے۔ عجیب سا خیال آیا تھا۔ گلشن ڈھاکہ کے ایک میڈیکل سٹور کے مالک نے ہمیں فوری پہچان کر کہا تھا۔ (پتہ نہیں کیوں اُسے ہرگز یہ خیال نہ ہوا تھا کہ ہم انڈین بھی ہو سکتے ہیں) اُس نے ہولے کہا تھا۔ "Youare Pakistani." شاید ہماری شناخت اس کے دل میں لگی کسی گرہ میں بند ہو چکی تھی اور ہمارے قرار دادم کے بعد اُس نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بتایا تھا۔

"71 کی جنگ آزادی میں میری عمر محض چار سال تھی لیکن مجھے سب زندہ رہا دہے۔ مجھے یاد ہے میری ماں کو میری بہنوں کو کس طرح پاکستانی فوجیوں نے ۔۔۔ کس طرح ان مسلمان بھائیوں نے اپنی ہی مسلمان بہنوں

کو۔۔۔"

71ء کے محی شاہد کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ہمارے دلوں میں خوف پہچان لیے جانے کا اور ندامت اپنے کیے کی۔۔۔ اور لرزہ کیے کی سزا۔۔۔ محی شاہد پُرجوش ہو گیا۔

"میری آنکھوں میں ساری تصویریں گھومتی ہیں۔۔۔ وہ بھی مسلمان تھے ہم بھی مسلمان تھے۔ پھر کیوں۔۔۔ کیوں کیا۔۔۔"

کئی دوکان دار اکٹھے ہو گئے۔ ہم ڈر گئے تھے۔ شاید چور کے پر نکل ہوتے۔ وہاں سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

کیا ہم شرمندہ ہیں جو کچھ کیا گیا وہ قابلِ شرم ہے۔ ہم اس کیے کے شریک کار نہ تھے۔ پھر بھی معافی مانگتے ہیں اور آپ کے لیے محبت کا پیغام لائے ہیں۔

اقبال صاحب نے کہا "چلو جلدی چلو نکلو یہاں سے۔"

محی شاہد نے کہا "تم سمجھیا انہیں! آپ ہمارے مسلمان بھائی اور مہمان ہیں آپ گھبرائیں نہیں۔" پھر اس نے باقی دوکان داروں کو بتایا کہ یہ لوگ معافی کے خواستگار ہیں اور محبت کا پیغام لائے ہیں۔ سب کے چہروں پر ایک میٹھی مسکان تھی۔ معاف کر دیے جانے والی فرحت کی لہک۔

شہید مینار کے چاروں اطراف بنی جھیل میں بنگلہ دیش کا قومی پھول Waterlily بہار دے رہا تھا۔ اگرچہ جھیل کا پانی مٹی کا ٹھہرا ہوا غلاظتوں سے اٹا کائی زدہ تھا۔ پتہ نہیں ٹھہرے ہوئے پانی متعفن کیوں ہو جاتے ہیں اور آنکھیں گندگی کو صفائی بنا کر کیوں نہیں دیکھ پاتیں۔ آخر تو یہ بھی ہماری دھرتی سے پلا پاک اور شفاف ہی تو تھا لیکن اس گندگی میں مسکراتے پھول ایسے خوبصورت تھے جیسے اس غلاظت سے ذرہ کا بھی تعلق نہ ہو۔ چھوٹے چھوٹے پانی کی سطح پر پھیلے ہوئے اور پتی کی گول گردن پر تن کے کھڑا پہلے کئی سی شکل والا گلابی پھول جسے بنگلہ میں شپلا کہتے ہیں۔ جھیل کے کنارے سجے ہوئے شپلا کی گلابی جھالر یہاں اگتی تو جیسے ہری گلابی ساڑھیاں گھنک کے بھائیں لگتی ہوں۔

کاش اسے توڑ کر ہم ساتھ پاکستان لا سکتے۔ کوشش بھی کی لیکن ہاتھ کھینچ لیا۔ پتہ نہیں خوف تھا کہیں کوئی ڈانٹ ہی نہ ڈالے۔ ہمارا قومی پھول توڑنے کی جرأت۔ وہ بھی پاکستانی ہو کر۔۔۔ گم شدہ کی بازیافت احساسِ زیاں کو بڑھا کیوں دیتی ہے۔

شہید مینار کی انٹری فری تھی۔ پر ہم جلدی نکل آئے۔ ہاتھوں میں پاکستانی فوج کے ظلم و ستم اور بنگلہ دیش کی تحریک آزادی کی تفصیلات والا کتابچہ پکڑے ہوئے جو وہاں مفت تقسیم ہو رہا تھا۔ گیٹ کے باہر ابرالپ پا او امرا کھایا جو ایک کھٹ میٹھا پھل ہے جسے پھول کی شکل میں کاٹ کر ایک کانٹا چھڑی پہ ٹانگ دیا جاتا ہے اور ایک امرا ایک ٹکا کا ملتا ہے۔ بہت مزے دار لگا۔ ہمارے ڈرائیور کریم کا بیٹا نے انفارمیشن دی۔ ابھی یہ کچا ہے جب یہ پک کر تیار ہوتا ہے تو پھر بہت بڑا ہو جاتا ہے اور زیادہ مزے دار بھی لگتا ہے۔ ہمیں ناگا (Apple Stone) بھی اچھا لگا تھا جس کی بیرونی سطح واقعی لوہے جیسی سخت ہوتی ہے لیکن اندر آم جیسا نرم گودا جس کا شربت بنا کر پیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر فریدہ کی بہو دولی نے بنا کر ہمیں پیش کیا تھا جس کا ذائقہ آم رس جیسا معلوم ہوتا تھا۔ ناشپاتی بھی اچھی لگی تھی جو جاپان سے درآمد ہوتی ہے۔ انتہائی نرم اور میٹھی ہلکے پیلے رنگ کی ہوتی ہے۔

شہید مینار سے نکل کر ہم نے بوڑھی گنگا کے کسی دوسرے پل کو عبور کیا جس کا پانی کالا کالا اور ٹھہرا ہوا تھا۔ کیونکہ یہ ساقی دریا ہے جس کا ساحل کہیں سے نہیں بچتا۔ اس کے اطراف کشتیاں اور کچھ ٹمبرے تھے۔ پھر بہت سے دھان کے کھیت اور کیلے کے باغات گزرے جن سے پانی کی بھری جھیلیں لگی ہوئی تھیں جن میں پمپ لگا کر کھیتوں کو پانی دیا جا رہا تھا۔ بیچ بیچ میں ٹین کے بنے گھر اور ڈھابے کیلوں کے پتوں سے ڈھکے اور جھیلوں میں گھرے ہوئے تھے۔ سڑک کنارے بنے گھروں کے صحن سڑک کی سطح پر لانے کے لیے بانسوں پر ٹکایا گیا تھا۔ بانس دور نیچے دریا کے کناروں پر گڑھے تھے۔ جن کے ٹکڑوں تک بلند گھروں پر یہ گھر کچھ ایسے لگتے تھے جیسے ابھی ہوا کے ذرا سے دھکے کے ساتھ اُڑ جائیں گے۔

ہمارے میزبانوں نے بتایا تھا سارے بنگلہ دیش میں یہی Same منظر ہے۔ یہ گھوری اور ہری منظر جو اس وقت ہمارے گرد پھیلا تھا۔ پانیوں سے بھرا منظر۔

"ہم نندن پارک پہنچے۔ گیٹ پر بڑے زور سے دھچکا لگا۔ پارکنگ فیس 30 ٹکا۔ انٹری ٹکٹ پچاس ٹکا پر ہیڈ ہم نے شور مچایا بچوں کا آدھا لیا جائے لیکن وہاں 80 سنٹی میٹر سے زیادہ قد کے بچوں کا ٹکٹ پورا تھا۔ یہ قد شاید صرف بنگالی بچوں کے ہی ہو سکتے تھے۔ ہمارے دونوں بچے 80 سنٹی میٹر سے زیادہ تھے۔ اندر وہی جھولے پانی میں گرنے والی موٹر بوٹس، جنجر اٹیک بڑے پانی کے اندر دوڑتی اور پہیوں پر چلتی ہوئیں لیکن کسی بھی جھولے کا ٹکٹ 60 یا 80 ٹکا سے کم نہیں تھا جس کا ہمارے ہاں ٹکٹ 20-15 روپے سے زیادہ نہیں ہوتا۔ بچوں کو سمجھایا۔۔۔ ہم پاکستان جا کر ایک جھولے کے ٹکٹ میں پانچ لے لیں گے۔ رہنے دو جھولے تو ہر جگہ پر ہوتے ہیں ہمیں بنگلہ دیش دیکھنا چاہیے۔ اس کے مضافات اس کی ثقافت دیکھنا تھیں لیکن بچوں نے ایک مان کر دی۔ بولے

"پاپا آپ کو گورنمنٹ آف پاکستان دس ہزار ٹکا ڈیلی Pay کر رہی ہے اگر ہزار دو ہزار ہمارے جھولوں پر لگ جائے گا تو کیا۔" ہم فرق کیا تھا کہ یہاں سب جھولوں کو پانیوں نے گھیر رکھا تھا جھیلوں نے ڈھانپ دیا تھا جن میں سے گزرنے کے لیے پتھروں کے زینے بنائے گئے تھے۔ دوسرا پارک FantasyKingdom تھا۔ اس کی انٹری فیس 100 روپیہ تھی اور کوئی

جھیلیں 70-80 فٹ سے کم نہ تھا۔ ہم نے بچوں پر مزید گزر ہوئے کو نہا جھولا ہے جو
پاکستان میں نہیں۔

"وہ تو سب پاکستان میں ہیں لیکن ہم تو بنگلہ دیش میں ہیں اور بنگلہ دیش کے جھولے بچیں پر ہیں۔ پانیوں میں نہاتے ہوئے جھولے۔ ہم وہاں جا کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اپنے وطن جیسے جھولے بنگلہ دیش میں بھی تھے جن پر ہم بیٹھے تھے۔ اس نسل کو تو خبر ہی نہیں کہ کب کس کے کتنی زور سے کھونسہ مارنا چاہئے کہ وہ مار بھی سکے۔ اپنا وطن بنگلہ دیش آیا پاکستان۔۔۔

ہر پارک میں جھیلیں ایک سے زیادہ موجود تھیں۔ پارک کے گرد چکر لگتی ہوا پارک کے اندر گھومتی ہوئیں۔ پانی کے گرد پانی۔

ڈھاکہ جھیلوں اور ندیوں کا شہر ہے کہ پانی میں گھرا ہوا جزیرہ، جو سطح سمندر سے 50 فٹ نیچا ہے۔ اگلے چند سالوں میں یہ سارا کا سارا جھیل بن جائے گا۔ پانی پانی ہو جائے گا۔ مجھے اپنے گاؤں کی وہ نیچی زمینیں یاد آ گئیں جہاں سارے گاؤں کی زمینوں کا اضافی پانی جا کر جمع ہوتا تھا اور وہ مرنے جھیل کہلاتے تھے، جہاں مرغابیاں اترتی تھیں اور بگلے نہاتے تھے اور شکاری جھاڑیوں میں چھپے رہتے تھے اور مچھیرے جال ڈالے رکھتے تھے اور زمین کے مالک پانی کی اس فراوانی کو دیکھ دیکھ روتے تھے۔ جب مرائی تھی جو باقی زمینوں کو شاداب کرتی ہوئی اُن کی زمینوں کو کھا گئی تھی۔ شاید حق فرست وصول کر لیا تھا۔

بنگلہ دیش بھی ایسی ہی نشیبی جھیل ہے۔ جہاں دنیا بھر کا فالتو پانی جا کر گرتا ہے اور اک دور آنے والا ہے۔۔۔ اپنے احساس زیاں کو زائل کرنے کے لیے اس موضوع پر بجا طور خیال کرتے ہوئے بڑی تسکین محسوس ہوئی۔

سامنے جھیلوں کو مصنوعی پہاڑیوں، آبشاروں، دروں اور پلوں سے سجایا گیا تھا جس میں بڑے بڑے قد کے ڈائنوسار بھی اور زرافے بنائے گئے تھے۔ جھیلوں اور سبزکوں کی شکل کی کشتیوں پر بچے پینگ کر رہے تھے۔

پتہ نہیں ان جھیلوں پر مرغابیاں اترتی ہوں گی یا کہ نہیں۔ شکاری گھات میں بیٹھے ہوں گے یا کہ نہیں۔ سندربن کے شکاروں کی داستانیں تو ہر شخص کے بچپن کی روایت کا حصہ ہیں۔ جہاں دریا ایک ہی دن میں متضاد رخوں پر بہتے ہیں، جن سے میٹھا پانی بہتے ہیں لیکن ہمارے میزبانوں نے یہ کہہ کر ہماری خواہش کو رد کر دیا تھا کہ وہاں ڈاکوؤں اور لٹیروں کا راج ہے۔ وہاں جانے کے لیے آرمی سے باقاعدہ اجازت نامہ لینا پڑتا ہے جو پورے فوجی اعزازات کے ساتھ معزز مہمان کو وہاں کی سیر کرواتے ہیں اور پھر بھی یہ خدشہ اپنی جگہ پر کہ مہمان واپس آ سکے یا نہ آ سکے۔

زمین میں دبا آئی اور ریت بڑھانے والے موت کی تجارت کرنے والے، ہتھیاروں کی منڈیاں تلاش کرنے اور خام ذخائر کو قبضانے والے، کتنے ڈاکو عمیرے کتنے دھارے اور جگہ بھی پیدا کرتے چلے جاتے ہیں کہ دھرتی کا حسین چہرہ اس کا لک میں سے پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔ سو ہم ڈھاکہ کے گرد پھیلے بانسوں کے باغات میں لپٹی جھیلوں اور بوڑھی گنگا کے آلودہ پانیوں میں چلتی کشتیوں کو ہی سندربن کی کوئی ابتدائی شکل سمجھ کر مطمئن ہو گئے۔

اطراف میں پھیلے دھان کے کھیتوں، جھیلوں، کیلے اور ناریل کے پیڑوں کے بیچ گزرتی سڑک پر مزید تیس چالیس کلومیٹر سفر طے کیا اور شوگری، سنہری منظروں میں لپٹے۔ شان پکورامکس پہنچے جہاں سے ہم نے پٹ سن جاتا کا ڈنر سیٹ خریدا تھا۔ اس فیکٹری کے ایک ونگ کے جنرل منیجر ایک پاکستانی صاحب تھے جن کی مہارت کو چوڑا کھوکھلا بلانے گاڑی رہائش اور دیگر الاؤنس کے عوض خرید لیا گیا تھا، جن کی سیکرٹری کا تعلق کراچی سے تھا لیکن وہ بنگلہ زبان اور ساڑھی سے کہیں بھی یہ شائبہ نہ دیتی تھیں کہ وہ بنگالی نہیں ہیں۔

یہ زمین کی آب و ہوا میں بھی کیا تاثیر ہے کہ جو جہاں جاتا ہے اسی کو اپنے رنگ میں رنگ ڈالتی ہے۔ ویسی شکلیں، ویسے نقوش، ویسی رنگت، ویسی لب و لہجہ جو اس دھرتی کے خمیر میں رچا ہوتا ہے۔

سعیدہ بیگم نے ہمیں شان پکورا کی فیکٹری دکھائی جہاں پٹ سن جاتا کراکری بیک ہو رہی تھی۔ کیا بیدہ زیب سنہرا طرف کا نچ ہی کانچ بکھرا ہوا تھا۔ ہم بچوں کو پکڑے ہی رہے کہیں ہاتھ نہ لگ جائے کہیں پیر نہ لگ جائے۔ میر کا شعر بہت یاد آیا۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

سعیدہ بیگم نے ہمیں بتایا۔ 71 میں اُن کے خاندان پر بہت قیامتیں ٹوٹیں، انہیں واپس کراچی بھاگنا پڑا، اُن دنوں وہ سٹوڈنٹ تھیں لیکن جب حالات ذرا بہتر ہوئے تو یہ خاندان واپس آ گیا۔ اُن کے بچے اردو بولنا لکھنا نہ جانتے تھے۔ وہ خود بھی جو اردو بولتی تھیں۔ وہ بنگلہ کی پڑوسن معلوم ہوتی تھی لیکن انہوں نے فخر سے بتایا کہ وہ ممکن بھائی جب ملتے ہیں تو آپس میں اردو بولتے ہیں۔ زبانوں پر دیار غیر میں کیا گزر جاتی ہے۔ کس طرح وہ اپنی شکل بدلتی مسخ کرتی ہوئیں بگاڑ کے مراحل طے کرتی ہیں اور پھر ماوری زبان میں مدغم ہو جاتی ہیں اور بالآخر مر جاتی ہیں۔ واپسی پر ہم پھر بوڑھی گنگا کے پل پر سے گزرے تو رک کر فوٹو گرافی کی کوشش کی لیکن تاریکی کی بنا پر کوئی ایسی اچھی تصویر نہ آئی۔ دریا کا بند اتنا اونچا تھا کہ اس سے نیچے اترنے کا خطرہ مول لینا انگریزی سے کہیں بڑھ کر معلوم ہوا۔ دریا میں سٹیمر کشتیاں اور کیٹو بھرے تھے۔ ملاحوں نے ہمیں سیر کروانے کے لیے ہاتھ پیر مارے لیکن دریا کی وسعت اور سکوت جیسا ہی خوف ہمارے دلوں میں ان ملاحوں کا بھرا تھا۔ ہمارا ڈرائیور رحیم کا ٹیڈ لکھو نے اس دعوت کو سختی سے رد کر دیا۔

۔جاری ہے۔

''یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر''

انڈریو سولیون

(یو ایس اے)

(سابق صدر جارج بش کے دورِ اقتدار میں امریکی پالیسی نے تمام دنیا میں امریکہ کے خلاف نفرت کا بیج بویا۔ خاص طور پر انسانی حقوق کے حوالے سے صدر بش کی پالیسیوں کی ہر باضمیر فرد اور صحافی نے کھل کر مذمت کی۔ اس سلسلے میں امریکی پریس بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا اور یہاں کے سنجیدہ حلقے نے جارج بش اور ڈک چینی کے زیرِ اثر امریکی انتظامیہ کے شرمناک اقدامات کو طشت از بام کرنے میں اپنا پورا پورا کردار ادا کیا۔ زیرِ نظر مضمون انڈریو سولیون ANDREW SULLIVAN کا کھلا خط ہے جو امریکہ کے ایک نہایت با اثر جریدے ''اٹلانٹک'' کے ستمبر ۲۰۰۹ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ یہاں اسکا ترجمہ پاکستانی قارئین کی دلچسپی کے لئے پیش کیا جا رہا ہے۔ جس کے لئے ہم ڈاکٹر فیروز عالم کے ممنون ہیں۔۔۔ ادارہ)

جناب جارج بش

ہماری کبھی ملاقات نہیں ہوئی اس لئے شاید مجھے معذرت خواہ ہونا چاہئے کہ یہ خط میں آپ کو ذاتی حیثیت سے لکھ رہا ہوں۔ مگر مجھے یہ خیال بے چین رکھتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ پوری امریکی قوم اس احساس میں میرے ساتھ ہے کہ اب ہمیں افغانستان اور عراق کے سلسلے میں اپنے رویہ اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے احساس جرم سے آگے بڑھنا چاہئے اور قومی سطح پر اس قضیہ کو ہمیشہ کے لئے نمٹا دینا چاہئے۔ میں یہاں یہ بتاتا چلوں کہ میں نے آپ کو صدارتی انتخابات میں ووٹ دیا تھا اور اس کے بعد ستمبر گیارہ کے المیہ کے بعد آپ کے فیصلے کو بھی سراہا تھا۔ مگر اس کے بعد جو حالات ہوئے اس کی وجہ سے مجھے آپ سے اور آپ کے فیصلوں سے بڑی مایوسی ہوئی بلکہ میں یوں کہوں گا کہ آپ نے جو راستہ اپنایا اس سے میں بہت دلبرداشتہ ہوا۔

میرا خیال تھا کہ میری طرح آپ بھی اس پر مکمل یقین رکھتے ہوں گے کہ جنگ اور شدید غصہ کے باوجود انسانی وقار، آزادی کے لئے فرد کا بنیادی حق اور دورانِ گرفتاری اس سے ہمدردی اور باعزت سلوک، جو امریکی فلسفہ اور فکری سوچ کا اہم ستون ہیں کو پسِ پشت نہیں ڈالا جائیگا اور انکی مکمل پابندی کی جائیگی۔ مگر ان بے بس انسانوں کے ساتھ جو آپکی قید میں تھے آپ کے دورِ حکومت میں ایسا انسانیت سوز سلوک کیا گیا کہ اس سے میرا سر شرم سے جھک گیا۔

کسی بھی جنگ میں کامیابی کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم کسی اخلاقی جرم یا غلطی کے مرتکب نہ ہوں اور ہمارا کردار اخلاقی پیمانے پر کوئی کھوٹ نہ رکھتا ہو۔ دوسری جنگِ عظیم اور اس کے بعد سرد جنگ میں ہماری فتح کی وجوہات میں یہ بھی ایک اہم چیز تھی کہ ہم اخلاقی طور پر صحیح تھے اور ہم جس مقصد کیلئے جدوجہد کر رہے تھے اسے عالمی حمایت حاصل تھی۔ جب آپ اخلاقی طور پر سچے ہوتے ہیں تو آپکی جدوجہد میں بھی ایک سچائی کا عنصر ہوتا ہے۔ مگر اس جنگ کے دوران آپ نے قیدیوں کے ساتھ جس سلوک کو چنا اور جو واضح طور پر ایسا سلوک تھا جو دنیا کے بدترین ڈکٹیٹری روا رکھتے ہیں اس نے ہم سے ہماری وہ شناخت کہ ہم اخلاقی طور پر بلند سطح پر ہیں چھین لی۔ ہمیں اپنی یہ شناخت واپس لینے کے لئے سخت جدوجہد کرنی پڑے گی۔

یہ ایک بہت بڑا اور بدنما دھبہ ہے جو ہمارے قومی کردار پر نمایاں ہے۔ یہ دھبہ آپکا ورثہ ہے۔ ہم چاہتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ آپ بھی یہی چاہتے ہوں گے کہ یہ دھبہ مٹ جائے۔ مگر اس کو مٹانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسکا سامنا کیا جائے، اس کا اعتراف کیا جائے اور اسے ایک باعزت طریقے سے مٹانے کی کوشش کی جائے۔

میں اس بات کو مانتا ہوں کہ اس نازک وقت میں آپ کے خلاف قانونی چارہ جوئی امریکہ کے مفاد میں نہیں ہوگی اس سے قوم میں مزید نفاق پیدا ہو سکتا ہے اسی کے ساتھ میں اس کے بھی خلاف ہوں کہ ان نچلی سطح کے افسران کے خلاف چارہ جوئی کی جائے جو دراصل آپ کے احکامات کے تحت اپنے فرائض ادا کر رہے تھے۔ صدر اوباما نے اپنے اقتدار کے پہلے مہینے ہی میں اس قسم کا کوئی قدم نہ اٹھانے کا عندیہ دیا ہے۔ مگر اس انسانی سلوک جو کسی بھی مہذب یافتہ معاشرے کے لئے انتہائی شرمناک تھا کا سامنا کرنا اور اسکا اعتراف کرنا ضروری ہے ورنہ یہ سمجھا جائیگا کہ ہم نے جو بھی کیا وہ صحیح تھا اور ہم دنیا کی نظر میں اپنی اخلاقی برتری کو کھو بیٹھیں گے۔ ہم یہ ثابت نہیں کر سکیں گے کہ ہم اخلاقی قدروں کی پاسداری کرتے ہیں۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ آپ کے نائب صدر مسٹر چینی اب بھی نہ صرف برسرِ عام یہ کہتے ہیں کہ قیدیوں کے حوالے سے انکی پالیسی صحیح تھی بلکہ انکا یہ اور اس طرح کا ان کا بیان ایسا ہوتا ہے جیسے اس پر انکو فخر ہے۔ مجھے اس سے یہ خوف لاحق ہوتا ہے کہ اس رویے سے امریکی عہدۂ صدارت کے وقار کو نقصان پہنچ رہا ہے اور یہ ڈر ہے کہ آنے والے دنوں میں شاید کوئی اور صدر یہ سوچتے ہوئے کہ یہ پالیسیاں صحیح تھیں اور انکو قومی سطح پر قبول کر لیا گیا تھا انکو مثال بنا کر ایسی ہی انسانیت سوز، ظالمانہ، اخلاقی طور پر گری ہوئی اور شرمناک پالیسیاں پھر سے اپنا لے۔ میں آپ کو یہ اس لئے لکھ رہا ہوں کہ اس کا تدارک صرف اور صرف آپ کر سکتے ہیں۔

مجھے غلط نہ سمجھیں۔ میں جانتا ہوں کہ ہر جنگ کے دوران گرما گری

میں کچھ غلطیاں ہوتی ہیں۔ کچھ جنگی جرائم بھی سرزد ہوتے ہیں اور جوش کے تحت کچھ ایسے اقدامات بھی اٹھائے جاتے ہیں جو ظالمانہ اور تکلیف دہ ہوتے ہیں مگر یہ وقتی اور کبھی کبھار ہوتے ہیں اور اکی مکمل اور منصفانہ تحقیقات اور ان کے تدارک کے لئے صحیح اقدامات سے ان غلطیوں کو صاف کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ جنگ مختلف ہے کیونکہ امریکہ کی تاریخ میں پہلی دفعہ آپ کی طرف سے ایک حکم نامہ جاری کیا گیا کہ سی آئی اے اور امریکی ایکزیکٹ سروس کے افسران اس بات کے پابند نہیں کہ وہ عالمی جنگی قوانین کی پابندی کریں۔ یہ حکم اس اصول کے خلاف تھا جنکی پابندی مغربی دنیا اور امریکی سیاسی اور جنگی قیادت امریکہ کے قیام سے آج تک کرتی آئی تھی۔ اس فرمان میں اس بات کی وضاحت کی گئی تھی کہ جینوا کنونشن ان قیدیوں پر منطبق نہیں ہوتا اور ان قیدیوں کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کیا جاتا تا آنکہ "جنگی ضرورت یا مصلحت" اس کے خلاف ہو۔ "جنگی ضرورت یا مصلحت" کے نام پر قیدیوں کے ساتھ سلوک کے حوالے سے آپ نے چھوٹ کا ایک دروازہ کھول دیا تھا۔ اکی مخالفت آپ کی اپنی کابینہ کے سب سے سینئر اور ایک ایسے رکن نے جنکا فوجی تجربہ سب سے زیادہ ہے یعنی آپ کے وزیر خارجہ کولن پاول نے بھی کی تھی۔ اس نادرخ فرمان نے اس بات کی ابتدا کی کہ امریکہ بھی گر کر ان ملکوں اور قوموں کی فہرست میں شامل ہو گیا جو منظم طور پر انسانی حقوق کی خلاف ورزی، اذیت رسانی اور جسمانی ایذا پہنچانے میں بدنام ہیں۔ اس حکم نامے میں، اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اس کے اجرا میں نیک نیتی شامل تھی، امریکہ کو بدنام کرنے اور اکی اخلاقی نیک نامی کو نقصان پہنچانے میں اتنا زبردست کردار ادا کیا جو شاید ام کے بعد بھی نہیں ہوا تھا۔ اس بات نے القاعدہ کو مزید کارکن فراہم کئے اور اس تنظیم کو اخلاقی کاز یہ امریکہ کے خلاف مواد فراہم کیا۔ اسی کے ساتھ خانگی طور پر امریکی قوم میں سخت مایوسی پھیلی اور اسکا حوصلہ پست ہوا جسکی وجہ سے آپ عراق کی جنگ کے لئے قومی حمایت سے محروم ہو گئے۔ اس کے دوررس نتائج ہوئے حتیٰ کہ آپکا جانشین بھی اپنے آپ کو اس معاملے میں بے بس پاتا ہے اور اس نے امریکی قوم کے اور خاص طور سے میدان میں سرگرم عمل امریکی سپاہیوں کے حوصلے کی مزید شکستگی کو روکنے کے لئے اس قسم کی تصاویر کی، جن میں آپ کے حکم پر کی جانے والی انسانیت سوز حرکات دکھائی گئی ہیں، اشاعت پر پابندی لگا دی ہے۔

"مشتبہ دہشت گرد ہرگز جینوا کنونشن کے مطابق جنگی قیدیوں کے رعائتی سلوک کے مستحق نہیں" آپکا یہ استدلال بذات خود شکوک سے پُر تھا اور اس پر قوم کا مکمل اتفاق نہیں تھا۔ لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ بقول آپ کے یہ دہشت گرد خود بھی جینوا کنونشن کی پابندی نہیں کر رہے تھے پھر بھی ایک انسان، یعنی انسانی نسل سے تعلق رکھنے کے ناطے انکا بنیادی حق تھا وہ یہ تھا کہ جھوٹی سچی معلومات حاصل کرنے کے لئے وہ شدید ظلم، ذہنی اذیت، ذلت آمیز برتاؤ اور ناقابل برداشت جسمانی تکلیف کا شکار نہ ہوں۔ بالآخر وہ انسان تھے۔ پھر جینوا کنونشن کے آرٹیکل کے مطابق اگرچہ مخالف متحارب گروپ کا رکن، چاہے وہ یونیفارم میں ہو یا نہیں، چاہے وہ خود یا اسکی جماعت اخلاقی قدروں کی پابندی کرتا ہو یا نہیں گرفتاری کے بعد ایک انسان ہونے کے ناطے اسکا یہ حق بنتا ہے کہ اس کے ساتھ عزت اور انسانیت کا سلوک کیا جائے۔ اس اصول پر کوئی اختلاف الرائے نہیں۔ اور صدیوں سے یہ اصول مغربی دنیا اور خاص طور سے امریکی جنگی حکمت عملی کی بنیاد رہی ہے۔ یہ امریکی سوچ کی اساس ہے کہ جو گرفتار ہو کر بے بس و بے دست و پا ہو چکا ہو اس پر طاقت کا استعمال نہیں کیا جاتا تھا اور اسی لئے امریکہ آج ایک آزاد اور با اصول قوم کے طور پر قائم ہے۔

میرا یقین ہے کہ اگر آپ اپنے آٹھ سالوں کے دور پر نظر ڈالیں تو آپ پر یہ بات ظاہر ہو جائیگی اور آپ کے پاس اسکے علاوہ کوئی چارہ نہ ہوگا کہ آپ اس کا اعتراف کریں کہ آپ نے اس بنیادی اصول کو تباہ کرنے میں سب سے بڑا کردار ادا کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ نے یہ قصداً نہ کیا ہو مگر آپ کمانڈر انچیف اور صدر مملکت تھے اس لئے ان فیصلوں کی تمام تر ذمہ داری آپ ہی پر آتی ہے۔ ویسے بھی یہ صدارتی سطح ہی کے فیصلے تھے۔ تاریخ کی عدالت اور امریکی قوم کی نظر میں ان فیصلوں اور قیدیوں کے ساتھ اس انسانیت سوز برتاؤ کی کُلی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے اور یہ بھی آپ ہی کی ذمہ داری ہے کہ آپ قوم کے سامنے اسکی وضاحت کریں، ان مظالم کی تفصیلات منظر عام پر لائیں اور جی ہاں اس پر معذرت کا اظہار کریں۔

ایسا نہیں تھا کہ یہ صرف چند بدقماش اہلکاروں کی وجہ سے ہوا۔ اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں کہ تقریباً جنگ کے ہر محاذ، ہر کیمپ اور ہر علاقے میں منظم طور سے اس قسم کا رویہ جاری رکھا گیا۔ بین الاقوامی ریڈ کراس کی کمیٹی، امریکی مسلح افواج کی تفتیشی کمیٹی، درجنوں با عزت اور قابل اعتبار خبر رساں ایجنسیاں اور اس موضوع پر لکھی گئی کتابیں اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ عراق، افغانستان اور گوانتانامو کے قید خانوں میں قیدیوں کے ساتھ تفتیش کے دوران شدید جسمانی اذیت کے طریقے آزمائے گئے۔ اذیت پہنچانے والوں میں فوج کی تمام شاخوں کے افراد شامل تھے۔

خود امریکی سینیٹ کی اپنی کل جماعتی کمیٹی کی رپورٹ جو آپ کی اپنی پارٹی کے ۲۰۰۸ کے صدارتی امیدوار "جان میکین" کے دستخط سے جاری ہوئی ہے کے مطابق اس ظالمانہ اور انسانیت سوز سلوک کی وجہ وہ پالیسیاں تھیں جو آپ نے اپنائی تھیں۔ عالمی انسانی حقوق کی انجمن کے مطابق آپکے اقتدار اور انتظامیہ کو انسانیت کے خلاف اذیت اور ذلت آمیز سلوک کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے جنگی مجرم قرار دیا گیا ہے۔ ہر جنگ میں کبھی کبھار کہیں نہ کہیں ایسے واقعات ہو سکتے ہیں جن پر اذیت کی تعریف لاگو ہو سکتی ہے مگر ایک منظم طور پر اذیت اور

انسانیت سوز برتاؤ جو تقریباً تمام فوج اور جنگ سے متاثرہ علاقے میں جاری رہا وہ صرف آپ کے دورِ اقتدار ہی میں ہوا۔

اذیت کے جو طریقے اختیار کئے گئے وہ پچھلی کئی دہائیوں یا صدام حسین کی زیرِ نگرانی از حد قدیم کے طریقے نہیں تھے بلکہ جدید اور سائنٹفک تھے۔ اس بارے میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ تکلیف اور اذیت ایسی ہو کہ روح تک چیخ اٹھے مگر جسم پر کوئی نشان نہ پڑے تا کہ اذیت کا شکار کسی کورٹ میں یہ ثبوت بھی نہ دے سکے کہ اس پر ظلم کیا گیا ہے۔ اذیت رسانوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ اگر جسمانی نشان نہ پڑیں تو اسے اذیت میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ عراق کے "نامہ" کیمپ میں یہ نعرہ تھا کہ اگر خون نہیں بہا تو کوئی بھی اذیت اذیت نہیں۔ بین الاقوامی طور پر اذیت کی یہ تعریف قبول کی گئی ہے "شدید ذہنی یا جسمانی تکلیف یا درد جو حد برداشت نہ کیا جا سکے اور جس سے مجبور ہو کر قیدی اپنے تفتیش کرنے والے کو جھوٹ یا سچ کچھ نہ کچھ بتانے پر مجبور ہو جائے تا کہ اس کی جان اس درد سے چھٹکارا پا سکے۔" یہ طریقے دنیا میں کئی ممالک کی پولیس یا دوسری ایجنسیاں استعمال کرتی ہیں مگر آپ کے دور میں امریکی اہلکاروں نے اس طریقے کو بہت گرم جوشی کے ساتھ خفیہ قید خانوں، گوانتاناموبے، بگرام افغانستان اور عراق کی تقریباً تمام حوالاتوں میں استعمال کیا۔

آپ نے خود بھی ۲۰۰۶ء میں اقوامِ متحدہ کے "اذیت ختم کرو" کے دن منانے کے موقع پر اذیت کی مخالفت کی اور جب عراق کی جنگ کے اولین دنوں میں چار امریکی فوجی گرفتار کئے گئے تھے آپ نے کہا "میں توقع کرتا ہوں کہ ان امریکی سپاہیوں کے ساتھ انسانیت کے تقاضوں کے مطابق رحم دلانہ اور باعزت سلوک کیا جائے گا۔ ان کے ساتھ کسی قسم کی اذیت رسانی کو ہم جنگی جرم پر محمول کریں گے"

پھر جب "ابوغریب" کے قید خانے کی تصاویر منظرِ عام پر آئیں تو آپ نے عربی ٹیلیویژن کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا "امریکہ ایک ایسا ملک ہے جہاں انصاف اور قانون کی حکومت ہے۔ یہاں ہر ایک کو مساوی آزادی ہے اور ہم انسان کو انسان کی حیثیت سے عزت اور وقار دیتے ہیں" آپ نے عراقی عوام کو یقین دہانی کرائی کہ آپ ایسی انسانیت سوز حرکات کی شدید مذمت کرتے ہیں۔

پھر آپ نے ایسے اقدامات کی اجازت کیسے دی۔ شاید آپ یہ بھول رہے تھے کہ "ابوغریب" کے جیل خانے میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ آپ کی اور آپ کے وزیر دفاع رمز فیلڈ کی اجازت سے ہو رہا تھا۔ شاید آپ اسکا عذر یہ پیش کریں کہ مجھے معلوم نہیں تھا؟؟ مگر یہ عذر قابلِ قبول نہیں۔ ان انسانیت سوز اذیتوں کی زندہ تصاویر ہمارا منہ چڑاتی ہیں اور ہمیں حقیقت سے آگاہ کرتی ہیں۔ اس سے ہمیں یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ہم جو سمجھتے تھے کہ قیدیوں کو غیر قدرتی پوزیشن یا دیر تک کھڑے رہنے کے لئے کہا جاتا ہے تو ہم سوچتے تھے کہ شاید یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں مگر اب ان تصاویر نے یہ افسوسناک حقیقت واضح کی کہ یہ بہت ہی تکلیف دہ اور اذیت ناک تجربات تھے۔ ایک اور حقیقت یہ ہے کہ اس غیر انسانی سلوک اور امریکی فوج کی اور سی آئی اے کی قانونی کتاب میں شامل کرنے کی اجازت آپ نے دی تھی نہ صرف یہ بلکہ آپ نے اپنے اقتدار کے دوسرے دور میں ایک اور میمورنڈم کے ذریعہ ان ہتھکنڈوں کو اور شدید کرنے پر زور دیا۔ آپ کے متذکرہ بالا اعلانات کی روشنی میں پھر وہی سوال اٹھتا ہے کہ آپ نے یہ اجازت کیسے اور کیوں کر دی؟؟ اس کی تین ہی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ اول۔ آپ جب اذیت کی مذمت کر رہے تھے تو حقیقت میں آپ کا اصل مطلب یہ نہ تھا۔ دوم۔ آپ اس بات سے غلط طور پر انکاری تھے کہ آپ کی عملداری میں قیدیوں پر ایسا شرمناک سلوک روا رکھا جا رہا ہے۔ اور آخر یہ کہ شاید آپ کو اپنے ہی ماتحتوں اور زیرِ عمل اہلکاروں پر کوئی قابو نہیں تھا۔

میں اس بات پر یقین نہیں رکھتا کہ آپ جھوٹ بول رہے تھے۔ میں یہ خیال کرتا ہوں کہ اذیت کے یہ مناظر دیکھ کر آپ خود خوفزدہ اور پریشان ہو گئے تھے۔ لیکن اب یہ ضروری ہے کہ اب آپ اس بات کا اعتراف کریں کہ آپ نے جس بات کی اجازت دی تھی یہ اسی کا نتیجہ ہے۔ بندھے ہوئے قیدیوں پر خونخوار کتے چھوڑنا، قیدیوں کو برہنہ کر کے ان کے سروں پر سیاہ غلاف چڑھانا، کھڑکیوں کے بغیر چھوٹے چھوٹے کمروں میں دنوں، ہفتوں بلکہ مہینوں قیدِ تنہائی میں رکھنا، انہیں اس حد تک سرد خانوں میں رکھنا کہ وہ ٹھٹھر کر قریب المرگ ہو جائیں، انہیں پھر گرم کرنا اور کچھ گھنٹوں بعد سرد خانے کا عمل دہرانا، ان کے ہاتھ پیروں کو زنجیر ڈال کر کے گھنٹوں ایسی جسمانی حیثیت پر رہنے پر مجبور کرنا کہ ان کی ہڈیوں اور جوڑوں میں ناقابلِ برداشت درد ہو جائے اور وہ موت کی طلب کریں، زندہ قیدیوں کو کھلا چھت میں دیر تک کھڑے رہنے اور واٹر بورڈ کے ذریعہ پانی میں غرق ہوتے ہوئے موت کا تجربہ یہ ایسی حرکتیں ہیں جن کی اجازت آپ نے دی اور جو آپ کے حسبِ حکم ادا کی گئیں۔ ایک قیدی کو واٹر بورڈ پر ایک سو تراسی بار لٹایا گیا جبکہ وہ تفتیش کے مرحلے سے پہلے ہی گزر چکا تھا۔ کیا لوگ اس منظر کو بھول سکتے ہیں جب ایک قیدی کے گلے میں کتے کی رسی ڈال کر خاتون سپاہی لنڈی انگلینڈ اسے بالکل کتے ہی کی طرح قید خانے میں گھما رہی تھی؟؟ ان پالیسیوں کا دفاع کرتے ہوئے آپ نے اقتدار چھوڑنے کے بعد کہا کہ یہ ساری چیزیں "قانونی" تھیں جبکہ آپکا اپنا قانونی مشیر "جان یو" جو آپ کے دفاع کرنے پر مامور ہے کہتا ہے کہ آپ کے سوچ کا انداز یہ تھا کہ اگر معلومات حاصل کرنے کے لئے کسی نو عمر لڑکے کے فوطے کچلنے پڑیں تو وہ بھی جائز ہے۔

در اصل آپ کی ہدایت یہ تھی کہ اگر ضرورت ہو تو قیدی کی مزاحمت

توڑنے کے لئے سب کچھ کیا جائز ہے سوائے اسکے کہ انکی موت ہو جائے۔ اگر یہ آپکا دفاع ہے تو یہ بالکل اور انتہائی طور پر غلط ہے۔ قانونی طور پر تو میں کچھ رائے دینے سے قاصر ہوں کیونکہ وکلاء کچھ بھی کہہ اور کر سکتے ہیں مگر قانونی نکتے سے قطع نظر اخلاقی اور انسانی قدروں پر اس سلوک کو تولا جائے جو افغانستان، ابو غریب اور گونتاناموں میں روا رکھا گیا تو کوئی بھی غیر جانبدار فرد یہی کہیگا کہ یہ اس کے منافی تھا جسکا امریکا نے ہمیشہ پرچار کیا ہے۔ صدر امریکہ کی حیثیت سے آپ کی ذمہ داری یہ تھی کہ آپ ان اعلیٰ قدروں کی پاسبانی کریں اور انکو تحفظ دیں۔ آپ کی ذمہ داری یہ تھی کہ آپ خود انکی حفاظت کریں" جب آپ نے انجیل پر ہاتھ رکھ کر اس عہدے کی ذمہ داری سنبھالی تھی تو آپ پر یہ فرض ہوگیا تھا کہ آپ اپنے اقدامات کے لئے ایک اعلیٰ معیار قائم کریں اور اپنے برتاؤ کا خود حساب کر کے اس کی ذمہ داری قبول کریں۔

اس خط کا واحد مقصد یہ ہے جناب صدر کہ میں آپ سے درخواست کروں کہ آخر کار آپ امریکہ کے دامن پر اس بدنما داغ کی ذمہ داری قبول کریں۔ میں آپ سے گڑگڑا کر اس بات کا خواستگار ہوں کہ اس غلطی کو اپنا لیں۔ یہ سب کچھ آپ کی کمان میں ہوا۔ یہ سب کچھ اس دور میں ہوا جب آپ کے ہاتھ میں قوم کی پتوار تھی۔ ایک دفعہ آپ نے کہا تھا "ایک ایسے معاشرے کا تصور میرے لئے پریشان کن ہے جہاں اپنا الزام کسی دوسرے کے سر تھوپا جائے"۔ اب میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ آپ بھی ان نتائج کا الزام جو آپ کے فیصلوں کی وجہ سے ظاہر ہوئے دوسروں پر ڈالنا بند کریں۔

آپ کن کن اقدامات کے ذمہ دار ہیں؟؟ اس معاملے پر درجنوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ فی الحال آپ کے کچھ ایسے اقدامات کا ذکر کرتے ہیں جو بظاہر معمولی اور بے ضرر نظر آتے ہیں جیسے نیند سے محرومی یا درجہ حرارت کے ساتھ چھیڑ خانی۔ کوئی بھی کہہ سکتا ہے کہ ان حالات سے تو بہت سے لوگ گذرتے ہیں جیسے کالج کے طلبہ جو امتحان کے سلسلے میں فکر مند ہوں یا پھر معاشرے کے وہ لوگ جو ائیر کنڈیشن کی سہولت سے محروم ہیں۔ مگر حقیقت میں اسکا استعمال اس طرح کیا گیا تھا جسکا بیان روح فرسا ہے۔ ایک طویل عرصے کے لئے نیند سے محرومی ذہن و جسم میں انتہائی قیامت خیز تبدیلیوں کا باعث ہوتی ہے۔ اسکا استعمال نازی گسٹاپو اور ہسپانوی ڈکٹیٹر فرینکو کی خفیہ پولیس نے کیا تھا۔ امریکی سپریم کورٹ نے ۱۹۴۴ء میں اس کے استعمال پر پابندی لگا دی تھی۔ اس کے باوجود جناب بش نصف صدی بعد اس کو جائز قرار دیا اور آپ کی ہدایت پر قیدیوں کو بیس گھنٹے تک قوت کے زور پر جگائے رکھا گیا۔ بعض حالات میں ان کے ہاتھ باندھ کر چالیس چالیس گھنٹے تک ایک جگہ کھڑا رہنے پر مجبور کیا گیا۔ انکی تفصیلات کو ریکارڈ کیا گیا ہے۔

گوانتاناموں میں ایک قیدی محمد القحطانی کو متواتر چون دن تک ہر روز صرف چار گھنٹے سونے کی اجازت دی گئی۔ جو شخص اس قدر نیند سے بوجھل ہو اور تھکن کی آخری حدود کو چھو رہا ہو اسے جگائے رکھنا آسان نہیں۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ اسے مستقل طور پر اذیت ناک چیخ چنگھاڑ میں مبتلا رکھا جائے۔ اس مقصد کے لئے اسکے کمرے میں کانوں کو پھاڑنے والی موسیقی، اور اسکی آنکھوں پر لمعا کرنے والی روشنیوں کے جھماکے ڈالے گئے۔ جب وہ قدرتی طور پر لڑکھڑا کر آنکھ بند کرنے لگتا تھا تو اسے لکڑی چبھا کر دوبارہ جگایا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا ذہن اپنا توازن کھو بیٹھا وہ خود سے ہمکلام رہتا تھا۔ کبھی اپنی قید کی کوٹھری میں خیالی لوگوں سے باتیں کرتا تھا۔ حتیٰ کہ اسکا جسم بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگا۔ اسکی دل کی رفتار خطرناک حد تک آہستہ ہوگئی اور اسے ہسپتال لیجانا پڑا۔ مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ جب وہ تھوڑا سا بہتر ہوا اور اسے واپس لایا گیا تو اسکے ساتھ پھر یہی انسانیت سوز برتاؤ جاری رکھی گئی۔ بعد میں سرکاری وکیل نے جو ان قیدیوں پر مقدمہ کے لئے مقرر کیا گیا تھا قحطانی کے خلاف تمام الزامات مسترد کر دئیے اور اپنی رپورٹ میں لکھا کہ اس کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ "شدید اذیت" کی تعریف میں آتا ہے۔ اگر آپ اس رپورٹ سے متفق ہیں تو اس برتاؤ کا حکم آپ ہی نے دیا تھا۔ مگر صرف قحطانی ہی واحد قیدی نہیں تھا جو اس قسم کی اذیت سے گذرا۔ شاید سینکڑوں یا پھر ہزاروں افراد جو آپکی قید میں تھے اس برتاؤ کا شکار ہوئے۔ "ہکوم" گروپ اور ایک انسانی حقوق کمیشن کے رپورٹر نے ایک امریکی اہلکار کا انٹرویو شائع کیا ہے جسمیں اس قسم کی برتاؤ کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا گیا ہے جو عراق کیمپ "نامہ" میں کی گئی۔ اس نے اپنا اصلی نام ظاہر کرنے کے بجائے فرضی نام "جیف" رکھا ہے۔ اسکے بیان کے مطابق "وہ قیدیوں کو بیس بیس گھنٹے اپنے پیروں پر ایک جگہ کھڑا رکھتے تھے۔ وہ ان بے بس انسانوں کو چوبیس گھنٹوں میں صرف چار گھنٹے سونے کی اجازت دیتے تھے مگر اہلکار یہ کہتے تھے کہ یہ کہاں لکھا ہے کہ چار گھنٹے مسلسل ہوں۔ اسلئے وہ قیدیوں کو ہر آدھ گھنٹے بعد جگایا کرتے تھے اس لئے ان بد نصیب انسانوں کو دو گھنٹے کی بھی مستقل نیند نصیب نہیں ہوتی تھی اور آخر کار قیدی گر کر ڈھیر ہو جاتا تھا۔ یہ عمل قیدیوں کے علاوہ عملے کے لئے بھی مشکل تھا کیونکہ قیدی پر نظر رکھنے کے لئے بہت زیادہ افراد کی ضرورت تھی۔ اور کبھی ہمیں خود بھی جاگنا پڑتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جب قیدی ذہنی طور پر اس قدر بد حال ہو چکا ہو تو ہم اس سے معنی خیز تفتیش یا سوال جواب کیسے کر سکتے ہیں۔

قحطانی کو بالکل برہنہ بھی کیا گیا۔ یہ عمل بھی آپ کی اجازت سے ہوا۔ شاید پڑھنے والوں کو یہ چیز اتنی عجیب نہ لگے کیونکہ مغربی معاشرے میں یہ بات عام ہے کہ نہانے میں یا سپورٹ کے لاکر روم میں مرد برہنہ ہو کر ایک ساتھ نہاتے ہیں مگر ایک دوسرے معاشرے کے تناظر اور مسلم طرز زندگی میں مرد بھی ایک خاص شرم و حیا کی پابندی کرتے ہیں اور قحطانی ایک پرہیزگار اور پابند

شریعت مسلمان تھا۔ یہ سلوک بہت ہی ذلت آمیز تھا۔ اس کے ساتھ ہی ان قیدیوں کے ساتھ ایسا کے سامنے ایسی جنسی حرکات جو ان کے عقائد کے خلاف تھیں روا رکھی گئیں۔ یہ سب اقدامات آپ کے زمانہ قیادت میں ہوئے۔

برہنگی کے ساتھ اذیت کو دوچار کرنے کے لئے درجہ حرارت کو نا قابل برداشت حد تک کم کرنے کی ترکیب استعمال کی گئی۔ کبھی یہ ترکیب جرمن گسٹاپو استعمال کرتی تھی۔ قحطانی اس بربریت کا بھی شکار ہوا۔ تفتیش کے کمرے میں لاکر اس پر ٹھنڈا پانی پھینک دیا جاتا تھا اور پھر تیز رفتار سے سرد کرنے والی مشینیں چلادی جاتی تھیں تا کہ درجہ حرارت پچاس درجے سے بھی کم ہو جائے۔ یہاں تک کہ اسکا جسم نیلا ہو جاتا تھا یہاں تک کہ وہ گر جاتا تھا کچھ دیر اسے دوبارہ گرم لایا جاتا تھا اور پھر یہی عمل دہرایا جاتا تھا۔ یہ عمل ناصرف گوانتانامو میں روا رکھا گیا بلکہ ان تمام علاقوں میں بھی اس کا استعمال کیا گیا جہاں جہاں امریکی تفتیشی مراکز تھے۔ ۲۰۰۶ء میں آپ نے ایک میمورنڈم کے ذریعے سی آئی اے کو اس کا اختیار دیا۔

اس کے علاوہ ان حرکات کی پردہ پوشی بھی کی گئی۔ عراقی قید میں ایک قیدی کی موت کے تصدیق نامہ پر موت کی وجہ "دل بند ہوا" لکھا گیا مگر ڈاکٹر اجتنابی طور نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ رپورٹ نے اس کا تذکرہ نہیں کیا کہ اس اکتیس سالہ قیدی کو مرنے سے پہلے فروری کے مہینے اور سخت سردی میں جب کہ درجہ حرارت چالیس درجہ تھا، برہنہ کر کے تین دن باہر رکھا گیا اور اس پر مستقل ٹھنڈے پانی کی بوچھاڑ کی گئی۔

اذیت کے لئے سخت سردی کے علاوہ گرمی کا بھی استعمال کیا گیا۔ ایک ایف بی آئی افسر نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ جب وہ گوانتانامو میں ایک قیدی کے کمرے میں داخل ہوا تو اس قیدی کے ہاتھ اور پیر اس طرح بندھے تھے کہ وہ ایک نوزائدہ بچے کی پوزیشن میں ننگے فرش پر پڑا تھا۔ کمرے میں نہ کوئی کرسی تھی نہ بستر اور نہ ہی کھانا یا پانی۔ ایسے قیدی اپنے پیشاب و پاخانے میں تھڑے ہوئے تھے کیونکہ انہیں اس حالت میں بیس بیس گھنٹے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے پاس ہی اکھڑے ہوئے بالوں کا ایک گچھا پڑا ہے ظاہر ہے وہ خود اپنے بال نوچ رہا تھا۔ کمرے کا ایئر کنڈیشن بند کر دیا گیا تھا اور وہاں شدید گرمی تھی۔

یہ عام طریقہ تھا کہ قیدی کو ایسی جسمانی پوزیشن میں رکھا جائے جو غیر قدرتی ہوں یا جسم جنکا طویل عرصے تحمل نہ ہو سکے۔ ایک رپورٹ کے مطابق ہاتھ اور پاؤں باندھ کر، بند کر کے بیس گھنٹے گزار دینے کی سزا عام تھی۔ اس کے مطابق اتنے عرصے تک کھڑے رہنے کی وجہ سے ٹخنے اور ٹانگیں سوج جاتی تھیں، پیروں پر چھالے پڑ جاتے تھے اور دل کی رفتار خطرناک حد تک تیز ہو جاتی تھی۔ کچھ حالات میں گردے فیل ہو جاتے تھے جو موت کا سبب ہو سکتے تھے۔ یہ سب اقدامات 'اذیت' کی تعریف میں آتے ہیں۔ سابق صدارتی امیدوار جان میک کین بھی اس تعریف سے متفق ہیں۔ آپ نے گزشتہ سال اپنی پارٹی کی جانب سے جان میک کین کی نامزدگی کی حمایت کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ "جان میک کین نے ویتنام میں گرفتاری کے دوران مصیبتیں جھیلیں" مگر آپ نے یہ نہیں کہا کہ آج آپ بھی اپنے قیدیوں کے ساتھ وہی سلوک کر رہے ہیں جو ویتنام میں جان میک کین کے ساتھ ہوا تھا۔ پھر آپ اس پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ جان میک کین سے اقرار نامہ طاقت کے زور پر لکھوایا گیا تھا اس لئے جھوٹا تھا تو پھر وہ اقرار نامے جو آپ کے اہلکاروں نے طاقت کے زور پر ان قیدیوں سے لکھوائے ان کی صداقت پر آپ کیوں کر اعتبار کرتے ہیں؟؟

میں یہاں ایک اور بدقسمت انسان کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ہے "ہوزے پڈیا"۔ مجھے اس سے اختلاف نہیں کہ پڈیا کا تعلق خطرناک شدت پسند اسلامی جماعتوں یا القاعدہ سے تھا۔ میرے نظریے میں اس کی حراست صحیح اور ضروری تھی مگر اس کی حراست کے بعد جو ہوا وہ میرے لئے شدید باعث تشویش ہے۔ اس کو اس جرم میں گرفتار کیا گیا تھا کہ وہ کسی خطرناک 'ڈرٹی بم' کا دھماکہ کرنے والا تھا (یہ الزام بعد میں بے بنیاد ثابت ہوا اور حکومت کی طرف سے اسے واپس لے لیا گیا)۔ یاد رہے وہ امریکی شہری تھا اور امریکی سرزمین یعنی شکاگو کے "اوہیر" ائیرپورٹ پر گرفتار کیا گیا تھا۔ اسے کئی سال حوالات میں رکھا گیا اور اس غیر قانونی حراست کے دوران اسے اس حق سے بھی محروم رکھا گیا کہ وہ ایک ہی روز کے لئے عدالت میں پیش کیا جائے۔ آئندہ تین سال اسے حوالات کی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس امریکی شہری کو کل ملا کر ایک ہزار تین سو سات دن ایک نو ضرب سات فٹ کی کوٹھری میں مکمل قید تنہائی میں رکھا گیا اور اس تنہائی کو مزید دہشتناک بنانے کے لئے اس سے حواس خمسہ بھی چھین لئے گئے۔ اسکی آنکھوں پر پٹیاں باندھی گئیں اور کانوں پر ایسے کنٹوپ چڑھائے گئے کہ وہ ماحول کی کوئی بھی آواز نہیں سن سکتا تھا۔ اس کو وقت یا ماحول کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا تھا نہ ہی اسکو اس قابل رکھا گیا تھا کہ دن یا رات میں تمیز کر سکے۔

وہ سالوں ایک دھند میں مبتلا رہا اور شاید اسے یہ بھی اندازہ نہ ہو کہ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ تقریباً چار سال کی اس اذیت ناک قید کے بعد پڈیا کی عزت نفس خاک میں مل چکی تھی اور وہ صرف ایسا انسان رہ گیا تھا جو بظاہر انسان لگتا ہو مگر اندر سے جس کی شخصیت مکمل طور پر تباہ اور کھوکھلی ہو چکی ہو۔ جناب صدر اگر آپ کبھی یہ سنتے کہ ایرانی حکومت نے اپنے ایک شہری کے ساتھ اس قسم کا سلوک کیا ہے تو آپ کیا کہتے؟؟

آپ اپنی ان حرکات کی توجیہ پیش کرتے ہوئے یہ دلیل دیتے ہیں کہ یہ غیر انسانی اور ظالمانہ اقدامات امریکہ میں ایک اور دہشت گردی کے حادثے کو روکنے کے لئے ضروری تھے۔ ہو سکتا ہے یہ صحیح ہو کہ ان پالیسیوں کی وجہ سے ایک اور دہشت گردی کا تدارک کیا گیا ہو مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ ایک تو یہ کہ ان

ہتھکنڈوں سے حاصل کی جانے والی معلومات کس قدر قابل اعتبار تھیں انکا کوئی ثبوت نہیں۔ پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایسی ہی قابل اعتبار معلومات ان روشن طریقوں سے حاصل ہو سکتی تھیں جن میں اذیت رسانی کا کوئی کردار نہ ہوتا۔ یہاں یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ آپ کے وزیر خارجہ نے اقوام متحدہ کو عراق پر فوج کشی کے لئے جو معلومات فراہم کی تھیں وہ وقت کے ساتھ غلط ثابت ہوئیں۔

''نیشنل جرنل'' کے مطابق گوانتانامو کے قیدیوں میں سے نصف پر دہشت گردی کا الزام تک عائد نہیں کیا گیا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ گوانتانامو سے سینکڑوں قیدی اس بنیاد پر رہا کئے گئے کہ ان سے حاصل کی گئی معلومات کی کوئی وقعت نہیں تھی اور انکا دہشت گردی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس طرح یہ ممکن ہے کہ بہت سے بے قصور لوگوں کو اذیت کا سامنا کرنا پڑا اس سے بد دلی پھیلی ہوگی اور القاعدہ کو مزید کارکن بھرتی کرنے میں آسانی ہوئی ہوگی۔

اس کے علاوہ آپ اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ امریکہ کی سلامتی آپ کے منصب کا اولین فرض ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ آپ نے جو حلف اٹھایا ہے وہ تھا ''میں قسم کھاتا ہوں کہ میں صدارت کا فریضہ خلوصِ نیت اور اپنی بہترین اہلیت کے ساتھ ادا کروں گا اور میں اپنی پوری توانائی کے ساتھ امریکی آئین کی پاسداری اور اسکا تحفظ کروں گا'' دراصل یہ آئین تھا، ملک نہیں، جسکا تحفظ آپ کی اولین ذمہ داری تھی۔ آپ کے عہدے کا یہ فریضہ یا اختیار نہیں تھا کہ دہشت گردوں سے ملک کی حفاظت کے لئے آئین سے صرفِ نظر یا اسکی خلاف ورزی کی جائے۔ یہ بات قابل قبول ہے کہ کمانڈر انچیف ہونے کے ناطے ملک کی حفاظت آپ کی ایک اہم اور سنجیدہ ذمہ داری تھی مگر اسکا یہ مطلب نہیں تھا کہ آپ اپنا بنیادی فرض یعنی آئین کا تحفظ اور اسکی پابندی سے آنکھیں پھیر لیں یا اپنے اختیارات سے تجاوز کریں۔

میں آپ کو یاد دہانی کرواؤں وہ ماضی میں آپ خود بھی اسکا پرچار کرتے رہے ہیں، کہ آئین کا بنیادی اور مرکزی نکتہ ''آزادی'' ہے۔ یہ مانا جا سکتا ہے کہ حالت جنگ میں کچھ شہری آزادیوں پر کڑی نظر رکھی جا سکتی ہے اور اگر اسکی یقین دہانی ہو کہ اس قسم کا احتسابی عمل موجود ہے کہ حکومت اپنے اختیارات کا غلط استعمال نہیں کرے گی تو سنگین حالات میں کوئی بھی اس پر اعتراض نہیں کرتا۔ مگر گرفتار کئے گئے قیدیوں پر بربریت اور اذیت رسانی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ مغربی ضابطۂ اخلاق کی پہلی شرط یہ ہے کہ ایک شہری کا بنیادی حق یہ ہے کہ وہ حکومت کے بیجا اقدام سے اپنے جسم کی حفاظت کرے۔ انگریزی قانون میں اسی کو HABEAS CORPUS کہتے ہیں جو ہمارے نظام انصاف کی پہلی اینٹ ہے۔ جو کچھ بھی ''ہوزے پڈیا'' کے ساتھ کیا گیا اس نے اس اصول کی دھجیاں اڑا دیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کے اس رویہ کی بنیاد پر با اختیار اہلکاروں کو مستقبل میں بھی ایسا کرنے کی ترغیب حاصل ہو۔

جب ایک انسان کو بربریت کا شکار بنایا جاتا ہے تو اسکے جسم اور ذہن کو اسکی قوتِ ارادی اور عزتِ نفس کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اسکا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایک مجبور اور بے بس انسان سے بزور طاقت وہ کہلوایا جاتا ہے جو حکومت چاہتی ہے۔ یہ مغربی تصورِ شخصی آزادی کے سراسر خلاف ہے۔ اس میں اتنا ہی فرق ہے کہ یوں سمجھئے کہ آزادی سفید ہے تو بربریت سیاہ۔ کوئی مہذب معاشرہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ مجبور قیدیوں پر اذیت کے پہاڑ توڑے جائیں۔ کسی امریکی صدر نے آپ سے پہلے اذیت کے وہ طریقے نہیں اپنائے تھے جو آپ کے دورِ اقتدار میں اپنائے گئے۔ اب دنیا کے وہ جابر حکمران یہ کہہ سکتے ہیں کہ امریکہ بھی اذیت اور بربریت کرنے میں ہمارے ساتھ شامل ہے۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نے جس جوش سے بربریت، اذیت اور انسانیت سوز اقدامات کو اپنایا اور آپ کے نائب صدر ڈک چینی جس انداز سے اب بھی اپنے ان اقدامات کو جائز قرار دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے اس سے اقوام عالم کو یہ تاثر ملتا ہے کہ شاید یہ رویہ امریکہ کے ضابطۂ اخلاق کا ایک حصہ ہے۔ ذرا سوچئے اس سے امریکہ کی اخلاقی سالمیت اور دنیا کی نظروں میں امریکہ کے وقار کو کس قدر صدمہ پہنچا ہے۔ امریکہ جو دنیا کی نظروں میں اخلاقیات، شخصی آزادی اور انسانی وقار کے تحفظ میں اب تک ایک روشنی کا مینار تھا۔ امریکہ۔۔۔ میرا ملک جس سے میں محبت کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ میرے غم و غصہ کی وجہ سمجھ رہے ہوں گے۔

آپ کی ایک دوسری خاصیت جسکا آپ بارہا عوامی طور پر اظہار کرتے رہے ہیں وہ آپ کا عیسائیت کے عقیدے پر یقین ہے۔ میرا ایمان اگرچہ اس قدر پختہ نہیں پھر بھی میں اور آپ دونوں ایمان اور عقیدے پر یقین رکھتے ہیں۔ مگر آپ نے جس قسم کے اقدامات کی اجازت دی وہ عیسائیت کی تعلیم اور روایت کے قطعی خلاف تھے۔ ہمارا مذہب اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ شر پسند اور سماج دشمن افراد بھی آخر کار انسان ہوتے ہیں اور ان پر ظلم و زیادتی جائز نہیں۔ وہ انسانی وقار کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ ہر انسان حتیٰ کہ خالد شیخ محمد بھی اللہ تعالیٰ کے عکس سے تخلیق کئے جاتے ہیں۔ تو خالد شیخ محمد کو پکڑ کر کے پنجرے میں پھینک دیا، اسکو جیتے جی سرد خانوں میں رکھ کر منجمد کیا، اسے تختے پر باندھ کر اور بے بس کر کے پانی میں ڈبویا تاآنکہ وہ قریب المرگ ہو جائے اور اسکی آنکھوں پر نظر خیرہ روشنیوں کی شعاعیں ڈال کر اس کے دماغ کو جھنجوڑنا بالواسطہ خدا کی توہین ہے۔ خدا کی تخلیق کی توہین ہے اور یہ کرنے والا خود سماج دشمن یا شر پسند ہے۔

پچھلے چند سالوں سے میں اس چیز کی کوشش میں سرگرداں ہوں کہ اس قسم کے منظم اقدامات کو بے نقاب کروں۔ ان واقعات کی وجہ سے میرے

غصہ کی آگ بھڑک اٹھی ہے اور میں امید کرتا تھا اس میں ملوث خاص کرداروں کے خلاف مقدمات قائم کئے جائیں۔ مگر اب میں اس بات سے پریشان ہوتا ہوں کہ دراصل ہمارے پاس بہت کم راستے ہیں کیونکہ اس نے جس "جنگی جرائم" کی نشان دہی کی ہے انہیں نظر انداز کرنا ان بین الاقوامی معاہدوں کی خلاف ورزی ہوگی جنکا امریکہ پابند ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اگر صرف سی آئی اے اور دوسرے اداروں کے نچلے درجوں کے اہلکاروں کے خلاف مقدمات قائم کئے جائیں تو یہ ناانصافی ہوگی کیونکہ بجا طور پر وہ یہ کہیں گے کہ یہ ہم نے اپنے کمانڈر انچیف کے کہنے پر کیا تھا اور اگر ان کے خلاف جو حقیقت میں اس کے ذمہ دار تھے یعنی آپ، آپ کے نائب صدر ڈک چینی اور آپ کے وزیر دفاع ڈانلڈ رمسفیلڈ تو اس سے امریکی عوام میں جو پہلے ہی ایک نفاق اور اختلاف کا شکار ہیں مزید انتشار پھیلے گا جو اس دور میں جب قوم دو محاذوں پر حالت جنگ میں ہے کسی کو بھی قابل قبول نہیں ہوگا۔ صدر اوباما اس مسئلے پر مفلوج نظر آتے ہیں مگر کچھ نہ کچھ کرنا ضروری ہے

میری تجویز ہے کہ جناب بش آپ ہی وہ کر سکتے ہیں جسکی اشد ضرورت ہے۔ صرف آپ ہی اس ملک کو آگے بڑھنے اور اس احساس سے چھٹکارا پانے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ آپ اس انسانیت سوز سلوک کی تمام ذمہ داری قبول کریں۔ وہ ایک مشکل وقت تھا اور یہ فیصلے پیچیدہ تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے یہ فیصلے نیک نیتی سے کئے گئے ہوں اور بعد میں آپ کو انکی ہولناکی کا اندازہ ہوا ہو۔ اسکا بھی امکان ہے کہ "تفتیش میں سختی" کی اصطلاح کے پورے معنی آپ نے غلط سمجھے ہوں مگر اس کا اعتراف اور اسکی ذمہ داری قبول کرنا ضروری ہے۔ اعتراف سے آپ کے وقار پر کوئی آنچ نہیں آئیگی اس لئے کہ ایک ایسی ہی قابل تقلید مثال سابق صدر ریگن نے قائم کی تھی۔

ریگن کا ایران قضیے کے دوران اسلحہ کی خریداری میں کوئی کردار نہ تھا۔ مگر اس نے اس بات کا احساس کر لیا تھا کہ جو کچھ ہوا وہ اسکی پالیسیوں اور ان لوگوں کے تقرر کی وجہ سے ہوا جو اس نے کی تھیں۔ اس لئے حقیقت میں وہی اسکا ذمہ دار تھا۔ میری نظر میں اس نے اس مسئلے پر قوم کے سامنے آکر جو تقریر کی وہ اسکی بہترین تقریر تھی اور اس نے اسکی عزت اور بڑھا دی۔ اس لئے کہ اس تقریر میں اسکا غرور انکسار اور اسکے اخلاق کی سالمیت جھلک رہی تھی۔ اس نے کہا "میں اپنے اور اپنی انتظامیہ کی جانب سے کئے گئے تمام اقدامات کی مکمل ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔ اس کے باوجود کہ مجھے اس بات پر شدید غصہ ہے کہ میری اطلاع کے بغیر کیا گیا مگر پھر بھی میں ہی ان اقدامات کے لئے جوابدہ ہوں۔ اگر چہ مجھے اپنے اہلکاروں کی اس حرکت سے بڑی مایوسی ہوئی مگر امریکی عوام کے سامنے مجھے ہی اسکا جواب دینا ہے کیونکہ یہ اہلکار میں نے ہی مقرر کئے تھے۔"

اگر آپ نے ریڈ کراس اور سینیٹ کی مسلح افواج کمیٹی کی رپورٹ پڑھی ہے تو اس میں قیدیوں کے ساتھ اس انسانیت سوز سلوک کے سلسلے میں آپ کے کردار کی صاف صاف نشاندہی کی گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے اہلکاروں نے آپ کو مایوس کیا ہو مگر ریگن ہی کی طرح اب آپ ہی کو اس کی ذمہ داری قبول کرنی چاہئے۔ یہ ضروری ہے مسٹر بش، یہ آپ کے لئے لازمی ہے

یہ مطالبہ کہ آپ اور صرف آپ ہی اس کے لئے جواب دہ ہوں اور اس کے لئے کسی اور کو قربانی کا بکرا نہیں بنایا جائیگا ایک فراخ دلانہ قدم ہوگا جو آپ کی عزت و وقار میں اضافہ کریگا۔ اس کے بعد آپ کو ریگن کی طرح یہ مطالبہ بھی کرنا چاہئے کہ ایک آزاد اور خود مختار کمیٹی ان واقعات کی غیر جانبدار تحقیقات کرے۔ آپ اس بات کی وضاحت کریں کہ آپ نے ایسے اقدامات کی اجازت کیوں دی اور یہ کہ اسکے نتائج کی تمام تر ذمہ داری کسی اور کی نہیں صرف آپ کی تھی۔ اس سے آپ کے خاندانی نام کا وقار بحال ہوگا اور اقوام عالم کی نظر میں، کہ ان حرکات کی تحقیقات وہی شخص کروا رہا ہے جس کے حکم سے یہ اقدامات کئے گئے تھے امریکہ اور آپ کا وقار بلند ہوگا۔

میں آخر میں ایک امریکی فوجی کیپٹن ٹیش بیک کی ڈائری سے اقتباس درج کرتا ہوں۔ اس نے توہین رسانی کا چشم دید منظر بیان کرنے اور شدید نفسیاتی اور اخلاقی دباؤ محسوس کرتے ہوئے لکھا "اصل سوال یہ ہے کہ کیا ہم سلامتی کی خاطر اپنی اعلیٰ اقدار اور اپنے اصولوں کو قربان کر دیں گے۔ دہشت گردی لوگوں میں خوف و ہراس پھیلاتی ہے اور اس سے شخصی آزادی اور شہری حقوق کو دبانے کا جواز پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر ان بنیادی حقوق کو بحال رکھنا اور اس خوف پر قابو پانا ہی ہمارے حوصلے اور ہمت کی نشانی ہے۔ کیا ہم خطرے اور خراب حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے ان حقوق کا تحفظ کریں گے یا ہم ان خطروں کے سامنے گھٹنے ٹیک دینگے اور اپنی شخصی آزادی اور شہری حقوق کو زائل ہوتا ہوا دیکھتے رہینگے؟ میرا جواب سیدھا ہے۔ اگر ہم خطرے کو دیکھ کر اپنے اصول قربان کر دینگے تو شاید یہ ہمارے اصول تھے ہی نہیں۔ میں اس بات کو ترجیح دونگا کہ اپنے ان اعلیٰ اصولوں کا تحفظ کرنے کی خاطر لڑتے ہوئے جان دیدوں نہ کہ ان اصولوں کا سودا کروں۔ یہی امریکہ کی بنیاد ہے۔"

جناب بش میں آپ سے یہی جرأت، ہمت، اخلاقی سچائی اور اپنی روح میں جھانک کر اپنے اقدامات کا تجزیہ کرنے کا مطالبہ کر رہا ہوں جو ہماری افواج کے ایک کارکن نے کیا ہے۔ ایک ایسا فوجی جو آج بھی ملک کی یونیفارم پہن کر جنگ میں مصروف ہے۔ مگر اس کی یونیفارم پر ایک دھبہ ہے۔ ایک ایسا دھبہ جو صرف آپ ہی مٹا سکتے ہیں جناب صدر اس دھبہ کو مٹائیے۔ اپنی خاطر، ہماری خاطر اور اس ملک کی خاطر۔ آپ کے لئے یہ آخری موقع ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ)

ڈاکٹر فیروز عالم (یو ایس اے)

''شاہ دولہ کا چوہا''

مامون ایمن (نیویارک)

''شاہ دولہ کا چوہا'' کیفیت سازی اور منظر نگاری سے معمور زبان و بیان کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں استعمال ہونے والے بیشتر اساسی الفاظ اور اشاراتی متون عام نہیں۔ ساقی کا روتی یہ اعلان کرنے میں حق بجانب ہے کہ وہ معاشرے کے لیے جنگ کر رہا ہے۔ ہمیشہ جاری رہنے والی اس جنگ کا تماشائی بن کر بیٹھنا اور تماشے میں شامل نہ ہونا اس کے اختیار میں نہیں۔ اس کے نزدیک ''ذہنی بیداری ایک طرح کا جبر ہے''۔ منطقی طور پر ذہنی بیداری کو جبر نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں ذہنی نیند جبر کی رہین ہو سکتی ہے۔ نیز ساقی کا یہ اعلان بھی پوری طرح درست ثابت نظر نہیں آتا کہ عوام سے گفتگو کے لیے فن کار کا میلان طبع بائیں بازو کی جانب ہونا ضروری ہے۔ دائیں بازو کا میلان طبع رکھنے والا فن کار بھی عوام سے گفتگو کرنے کا اہل ہو سکتا ہے۔ ہاں اس کے اس خیال سے پوری طرح اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ خدا کا معاملہ ایک ذاتی معاملہ ہے۔ اس ذاتی معاملہ سے کٹ کر بھی عوام سے گفتگو کی جا سکتی ہے۔ نباتات و حیوانات سے محبت کی جا سکتی ہے اور اس دنیا کو خوب صورت بنایا جا سکتا ہے۔ اس دنیا کو خوبصورت رکھا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں ساقی کی حیثیت مجبر نہیں۔ اپنے افکار و تخلیقات کے باعث وہ معاشرہ کے عام فرد سے زیادہ فعال ضرور ہے۔ اس کی آواز ترغیب، تجزیے اور تعمیر اپنانے کی دعوت دیتی ہے۔ یہ آواز ''تعمیر و ترغیب'' اور ''ترغیب و تعمیر'' کی ایک دہری روش کا احاطہ کرتے ہوئے حال کی ضروریات کی جانب اس طرح نشان دہی کرتی ہے کہ مستقبل بھی کار ہائے زیاں سے محفوظ ہے۔ یہ بھی فطرت کا قوانین برقرار رکھنے کی تمنائی ہے۔ عالمی طور پر یہ بھی عام نہیں کہ ہر فرد اس آواز سے واقف نہیں یا وہ اس آواز میں پنہاں پیام کی اہمیت سے آگاہ نہیں یا وہ اپنی ذاتی ضروریات اور معاشرتی مسائل کے باعث اس پیام کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہے۔ یہ مجبوری بہر حال ایسی مجبوری ہے جسے حل کرنے کے لیے مزید آگاہی اور علم کی فراہمی ضروری ہے۔ فرد کو تحفظ حیات کے لیے تخریبی اعمال کو بھی تعمیری اعمال کے سانچوں میں ڈھالنے کا ہنر سیکھنا ہوگا۔ یہ امر ناممکن تو نہیں، مشکل اور وقت طلب ضرور ہے۔

آج ''گلوبل وارمنگ'' اور ''گرین ورلڈ'' جیسے الفاظ سنائی دینے لگے ہیں۔ ہر جگہ ''سبز'' کہیں کہیں ہی سہی۔ لفظ ''گرین'' کے حوالے سے ساقی اپنے پیام کو بامعنی بنانے کے لیے ''سبز پانی، سبز شب، سبز پانی، سبز مٹی، سبز دروازہ، سبز آنکھیں'' جیسے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اس ضمن میں وہ ایک اختراعی ترکیب ''سبز حیرت'' بھی پیش کرتا ہے۔ الفاظ کے ضمن میں ''نیلا زہر پیالہ، تالاب، کچی پہاڑی، منحوس کنویں'' روایت سے جڑے ہیں۔ دوسری جانب ''مردہ پانی، ہوا کا دوشالہ، ہجرت کے ٹوٹے پر'' اختراعات ہیں۔ لفظیات کے باب میں ''بماء، نتھنے، کھردری، کھیتوں، پاس، جھاگ، کیلا، جوتا، کولھوں'' کا شعر میں استعمال عام نہیں۔ پوربی زبان میں ''اکوا، پکوا، دھنیا'' عام بول چال میں شامل ہیں۔ اضافی تراکیب کے ضمن میں ساقی روایت کا سہارا لیتا ہے مثلاً ''متاعِ جسم، بندۂ موسم، دنیائے خوں، بازگرس، مجلۂ ملال، تحیر، خیال زینہ، بچپاں، کلیۂ سنیاں''۔ اس کا ذہن نئی اضافی تراکیب بھی تراشتا ہے ''ہوائے خوش خبر، عمر کج روش، تو ہے سنگ، بیہودگی، غم'' وغیرہ۔ بعض مفرد الفاظ ''تحت گردانی'' کی دعوت دیتے ہیں مثلاً ''ختم کیا، ساعت دوتا''۔ اس مجموعہ میں ماحول کے حوالے سے الفاظ کی ایک لمبی قطار ہے۔ حیوانات اور کیڑوں مکوڑوں کے ضمن میں ''مکھی، سانپ، شیر، زیبرا، خرگوش، ہاتھی، بچھو، مچھروں، مکھیاں، جھینگر، بکرا، چھپکلی، چیل، تتلی، تتلیاں'' کے نام شامل ہیں۔ علاوہ استعمال کے ضمن میں یہ الفاظ ساقی کی نظر ثانی چاہتے ہیں۔ ''تیرے تعصب، راتوں، اوس کی ترک، کالیں، شانتی، ہمارے دوغم، ہم چلیں، ایک پانی کا سانپ''۔

اس مجموعہ میں بیشتر نظمیں قوافی اور بحور کی پابند نہیں۔ چند نظمیں باقاعدہ بحروں میں ہیں لیکن غیر مقفہ۔ ان غیر مقفہ نظموں کا عروضی جائزہ یوں لیا جا سکتا ہے۔ ''(جنسی بے حدلت کی نیم پری/ فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن/ بحر رمل مسدس سالم محذوف/ ایک جنسی تجربہ، صفحہ ۳۳)'' — ''(دو جسم بھیگے ہوئے بند مرتبانوں میں/ مفاعلن فاعلاتن مفاعلن فعلن/ بحر مجتث مثمن مخبون محذوف/ مردہ خانہ، صفحہ ۴۳)'' — ''(اوس کی گرد سے نجات ملی/ فاعلاتن مفاعلن فعلن/ بحر خفیف مسدس مخبون مشعث محذوف/ صبح، صفحہ ۵۵)'' — ''(ایک لڑکی جال میں دیوانگی/ فاعلاتن فاعلاتن فاعلن/ بحر رمل مسدس سالم محذوف/ جنگ، صفحہ ۷)'' — نظم ''زندہ چپاپائی'' صفحہ ۲'' (جس میں ناخن گاڑ دیے ہیں اب اک آئی جھاڑی نے/ فعلن فعلن، فعل فعولن فعلن فعلن/ فعلن فع) بحر متقارب مثمن اثرم (سولہ رکنی) ہے۔ اس نظم کے بعد مصرعے غور طلب ہیں۔ ایک اور نظم ''مستانہ ہیجڑا'' صفحہ ۳۷-۳۸ بحر مضارع مربع اخرب سالم میں ہے ''(سو وا تیری گلی میں/ مفعول فاعلاتن)''۔ ساقی نے اس نظم کے پہلے پانچ مصرعے اسی بحر میں رکھے لیکن بعد والے چند مصرعوں کو توڑ توڑ کر لکھا مثلاً ''(شیش کے بال/ کستی انگیا میں/ کس کسا کے)''۔ ان مصرعوں کو یوں لکھ کر وزن کی پابندی کی جا سکتی تھی ''(شیش کے بال کستی/ انگیا میں کس کسا کے)''۔ یاد رہے کہ اس نظم کے بیشتر مصرعوں میں وزن کی پابندی نباہی گئی ہے۔ بہرحال ساقی کے پاس توڑے جانے والے مصرعوں کا کوئی معقول جواز تو ہوگا۔ توڑے جانے والے مصرعے غنائیت کی راہ سے کٹ جاتے ہیں۔ اسی مجموعہ میں نظم ''انہدام'' صفحہ ۲۱ میں پانچ اشعار ہیں۔ اس نظم کا ہر مصرع ایک ہی بحر میں ہے یعنی اس میں کوئی مصرع توڑا نہیں گیا مثلاً ''(تو کنار بحر کی وہ چٹان ہے جسے/ فاعلن مفاعلن فاعلن مفاعلن/ بحر رجز مثمن اشتر مطوی مخبون مطوی مخبون)''۔ بعض نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں مختلف بحریں ایک ساتھ استعمال کی گئی ہیں۔ ان نظموں میں غنائیت رستے بدلتی نظر آتی ہے۔ یہ عمل ساقی کے سیمابی مزاج کا ایک انداز ہے۔

شعر کو شاعر سے اور شاعر کو شعر سے جدا کرنا ایک مشکل امر ہے
مجموعہ میں بھی یہ رشتہ کہیں عیاں اور کہیں نہاں نظر آتا ہے۔ اس کتاب میں یہ رشتہ موجود ہے۔ مثلاً ''ایک ذی روح اپنی آواز سے گل سکتا ہے' اس کے شعلہ گر چیخوں میں جان نہیں' اس کے سینے میں نخوت کے پھول کھلے ہیں' موت کی تیز خوشبو نے اسے پاگل کیا ہے' وہ شاید ضمیر عالم کے تنگ مقبرے میں گرتا ہے' وہ پہاڑی کو کسی دیوہیکل فرشتے کا جوتا گردانتا ہے' وہ سمندر میں آگ دیکھتا ہے اور پیاسا رہتا ہے' وہ کسی کی تنہائی سے اپنی تنہائی ملانا چاہتا ہے' وہ یادوں کی ساری شمعیں بجھا کر خوابوں میں چل رہا ہے' وہ جنگل میں کنبل ڈال کے پڑا ہے' وہ شعور کے تشنج کل میں زندہ ہونا چاہتا ہے''۔۔۔۔۔ وغیرہ

مشاہدات اور تجربات کی کوکھ سے جنم لینے والے افکار' عام طور پر' سیدھا نتیجے سے بار ور ہوتے ہیں۔ ساقی کی کاوشات میں یہ روش موجود ہے۔ مثلاً ''آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر ہنسی کھلانے سے روح الجھتی ہے' آن کی کمان ٹوٹنے پر جان چھوٹنے لگتی ہے' بیداری یادوں کی فصد کھولتی ہے' اکھوے پھوٹ پھوٹ کر موسم کی تبدیلی کا احساس دلاتے ہیں''۔

بعض باتیں سیدھا نتیجے کے راستے سے کٹ کر بھی کہی جا سکتی ہیں' کہی جاتی ہے۔ مثلاً ''فرد آنسو اپنے اندر بھی گرا سکتا ہے' فرد کسی کوئی اَنْدا رنگ ہے تو کبھی کوئی ٹھہری کیا ہے' فرد کی تنہائی میں ہم کتنا چھپ سکتا ہے' فرد خود پر ہونے والے ظلم کا بدلہ بھی لے سکتا ہے' روشنی خیال سے ذود بھی ہو سکتی ہے' نفرت کا سہارا لے کر خود اپنا حق مانگ سکتا ہے' زعفن کا پیڑ مشعل بن کر جل سکتا ہے''۔

اس کتاب کی نمائندہ نظم 'امانت' صفحات ۸۲ تا ۸۳' ہے۔ اس نظم میں تین کردار ہیں۔ ''شکی لڑکا' شاعر''۔ اس نظم کے منظر میں ۔۔۔ ''تھا بچہ وحشت' چاقو' ماچس' پنسل' تیس برس' تیلا لے' خون کے دھبے'' ہیں۔ پس منظر میں ''زبانی' زبان' گھٹن' نیند' پاگل پن'' ہیں۔ یہ نظم بچپن کی ایک عام سی' معصوم شرارت کی داستان کہتی ہے۔ اس داستان میں عمل جرم سے نہیں' احساس جرم سے مربوط ہے۔ وہ احساس جرم بچپن سے آگے کے عہد کا رہین ہے۔ وہ عہد شعور اور اعتراف کا عہد ہے۔ اس عہد میں فرد اپنے ماضی کا جائزہ لیتا ہے' غلط کو غلط کہتا ہے' صحیح کو صحیح کہتا ہے اور اپنے ضمیر کی آواز بلند کرتا ہے۔ وہ آواز خودکشی کے باعث تعصبات سے مبرّا اور صداقت پر مبنی ہوتی ہے۔ اس نظم میں وہی آواز شاعر کے دل و دماغ سے سرگوشی کرتی ہے تو وہ کسی غیر کے جرم پر خود کو کفن اور نیند سے پاگل پاتا ہے بلاشبہ یہ تاثر دہرا ہے۔ اس تاثر کا واسطہ ہم سبھوں کے بچپن سے ہے' ہماری ان معصوم شرارتوں سے ہے جو جرم اور ظلم سے واقفی نا آشنا ہوتی ہیں۔ ان شرارتوں کا تجربہ جوانی اور بڑھاپے کے مہ و سال کرتے ہیں۔ یوں کہیے کہ وہ مہ و سال دیانت بن کر ذات کے دریا کو منجمد کرنے کو یکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس عمل میں خوشی' غم' تاسف' فخر اور ندامت کے عناصر نکھر کر اعتراف کے در پر دستک دیتے ہیں۔ یہی دستک اس نظم کی اساس ہے۔ اس اساس میں غم بھی ہے اور غصہ بھی۔ نیز اس نظم میں ایک غیر ملفوظ تمنا بھی ہے۔ ''کاش ایسا نہ ہوتا''۔

ساقی کی اس کتاب کا نام ہے ''شاہ دولہ کا چوہا''۔ یہ عنوان ایک نظم کا بھی ہے۔ اس نظم کے اصلاحی کردار ہیں۔ ''شاہ دولہ' مجاور' سجادہ نشین' گداگر' پالوشی (دست ملا: پہلوٹھی) کے لڑکے' دوشیزہ رضا کا رچوہا''۔

حضرت شاہ دولہ پاک پنجاب کے ایک شہر گجرات میں دفن ہیں۔ موصوف اپنے عہد میں عوام الناس کو روحانی فیض پہنچانے کے سبب احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ ایک عام روایت ہے کہ بانجھ عورتیں ان کے مزار پر آ کر اولاد کی دعا مانگتی ہیں اور پہلوٹھی کا لڑکا مزار کی نذر کر دیتی ہیں (پہلوٹھی کی لڑکیوں کے ضمن میں کوئی روایت نہیں ملتی) یہ لڑکا عام بچوں سے یوں مختلف ہوتا ہے کہ اس کا سر اور دل یا چھوٹا سا اور قد بہت کم ہوتا ہے۔ ایسے لڑکوں کی گفتگو بھی عام فہم نہیں ہوتی۔ ان لڑکوں سے بھیک منگوائی جاتی ہے۔ بظاہر یہ لڑکے حضرت شاہ دولہ کی کرامت سے منسوب ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں کوئی حتمی دستاویز اس لیے نہیں دی جا سکتی کہ زندگی اور موت صرف رب العزت کے ہاتھ میں ہیں۔ حضرت شاہ دولہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ کوئی مرنے والا خود اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتا چہ جائے کہ وہ بانجھ عورتوں کو جسمانی اور ذہنی طور پر معذور لڑکا عطا کرے۔ ساقی کے مشاہدے کے مطابق ان ''چوہوں'' کے اعضا توڑ کر مضبوط رسی سے تنگی کر کے باندھ دیے جاتے ہیں۔ یہ مشاہدہ درست نہیں۔ جن لڑکوں اور لڑکیوں کے اعضا توڑ کر مضبوط رسی سے تنگی کر کے باندھ دیے جاتے ہیں وہ گداگروں کی ایک اور قسم ہے۔ ایسے گداگروں کے بارے میں ایک خیال یہ ہے کہ ان کے والدین ہی یہ جرم پالنے کا کام کرتے ہیں۔ انھیں ریڑھیوں پر بٹھاتے ہیں' گلیوں میں گھماتے ہیں اور لوگوں سے ہمدردی کے جذبے کے تحت بھیک کے طلب گار ہوتے ہیں۔ ایسے بچے اور ان کے والدین زبان سے نہیں آنکھوں سے گفتگو کرتے ہیں۔ اس نظم میں ساقی نے گداگروں کی ان دونوں اقسام کو حضرت شاہ دولہ کے چوہوں کا نام دیا ہے جو درست نہیں۔ اس نظم میں 'صدیوں کے سوگ جگر جگر جگمگاتے ہیں'' بجا۔ یہ بھی بجا ہے کہ اس کے متن سے قاری کے دل میں ہم دردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے لیکن متعلقہ علائم اور ان کے اظہار کے لیے استعمال ہونے والے الفاظ یک جا ہو کر وہ تاثر نہیں پیدا کر پاتے جو تاثر شاعر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ جبر' بے بسی' اسطورہ پائی جانے والی تہہ داری نے رہ و منزل کے درمیان دوری کی وہ خلیج حائل کی ہے جسے قرب کی روش سے پاٹا نہیں جا سکتا۔ بلاشبہ ذہن جدید ان کی بھول بھلیوں میں بھی بھٹک کر بالآخر آگہی کے جذبے سے ہمکنار ہونے کا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس نظم میں متن کے حوالے سے ''دوری'' کا وجود ''قرب'' کی ذات پر غالب نظر آتا ہے۔ یہی غلبہ بہ حیثیت مجموعی' ساقی کے اسلوب کا بنیادی عنصر ہے۔

صمٌ بکمٌ عمیٌ..... ستیہ پال آنند (امریکہ)

مجھ 'ذلت' کا خلق بے آواز تھا
پگھلا ہوا سیسہ مرے کانوں کو بہرا کر چکا تھا
صرف میری کور آنکھیں ہی تھیں
جو گونگی زباں میں بولتی تھیں
جب بھی میں بے نور آنکھوں کو اٹھا کر بات کرتا
مورتی سنتی مگر خاموش رہتی
مورتی مندر میں استھاپت نہیں تھی....
اس کو میں نے اپنے ہاتھوں سے گھڑا تھا
اور پھر اقلیدیہ کی مانند اپنے سامنے رکھ کر

میں اس سے
بات کرتا تھا، جھگڑتا تھا
کبھی روتا، کبھی ہنستا
کبھی درویش سا میں
اس کے چاروں سمت اک پاؤں گھماؤ میں پھنسا کرتا چتا تھا!

خودکشی کی شام میں نے مورتی سے
صاف لفظوں میں کہا: ''معبود میرے!
میرا یہ حرکی تصور ہے کہ میں خود فہم بھی ہوں
اور رکھتا ہوں میں اپنی ذات کے اندر چھپا کر
اپنی افزائش کا سامان
اپنے ہونے یا نہ ہونے کا جواز مستقل بھی
مرد خود آگاہ ہوں
میری یہی تکمیل ہے، میں جانتا ہوں
اندھا، گونگا اور بہرا مر رہا ہوں
خودکشی سے پہلے یہ خواہش ہے میری
اب مرے اگلے جنم، جتنے بھی باقی رہ گئے ہوں
بچ جاتی میں ہوں تو آواگون سے چھوٹ جاؤں!

(ذلت: بہمنی نا چھوت) (مہابھارت کا ایک اچھوت کردار)

رباعیات

مامون ایمن

(یو۔ایس۔اے)

سرسبز کسی دشت میں آہو کوئی
دھند لائی ہوئی آنکھ میں آنسو کوئی
حیرت سے تکا کرتا ہے ایمن ہر پل
زنداں سے رہائی بھی ہے جادو کوئی

بادل سے کسی دشت کا قصہ سن لیں
ماضی کے خیالات سے خلوت بن لیں
اس دہر سے اب ہم کو رہا ہونا ہے
زنجیر کی خاطر کوئی رستہ چن لیں

رستے میں ہو زنجیر' ضروری کب ہے
ہر گام کے پہلو میں انوکھا ڈھب ہے
ڈوبا ہے ہر اک سانس تذبذب میں یوں
احساس کی ناؤ یل میں اب ہے، تب ہے

ناؤ یل کا پیغام شناسائی ہے
پیغام کے دل میں کوئی ہرجائی ہے
ہرجائی زمانے پہ لگی ہے آنکھیں
آنکھوں سے جدا وقت کی بینائی ہے

بینائی کا چرچا ہے زمانے بھر میں
ہر ایک حقیقت میں' فسانے بھر میں
سچ یہ ہے جہاں دار ہر اک منظر کو
اک سکہ ملا کھوٹا خزانے بھر میں

یہ سکہ ہے بھیدوں بھری جھولی' بھیا
تحقیق میں اعلیٰ ہے پہ ادنیٰ دنیا
زنجیر کو زنجیر نہ جانا جگ نے
ہر آن رہائی کا طریقہ سوچا

اے آسماں کے مکیں!

عبدالعزیز خالد
(لاہور)

اے آسماں کے مکیں! اے ملیکِ روزِ جزا!
کر اپنے بندوں پہ آساں مصائبِ دنیا
ہے دائم ان پہ مُسلّط جو قہر کرب و بلا
ہے کیا جواب "اَلَستُ بِرَبِّکُم" کا صلا؟
ہے تنگ دمبدم ان پر فراخنائے جہاں
نہ چین لینے دے دم بھر کو گردشِ دوراں

گُھٹے دم اہلِ جہاں کا جہاں پناہوں سے
کنشت و مسجد و مندر کے کج کلاہوں سے

قرار گر ہے کسی کو تو بے قراری کو
نہ جانے کرتے ہیں کیوں منع بادہ خواری کو؟
ہے بے خودی بھی تو درکار ہوشیاری کو
ہے لوٹ کھوٹ کی سونے کی تاجداری کو
قوامِ کفر کی ایماں کی استواری کو
کہ کچھ تو چاہیے آخر بہانۂ مستی
ہو جب نگاہ سے اوجھل حقیقتِ اشیا

تنے درختوں کے جیسے جڑوں سے اکھڑے ہوئے
ہوا کے رحم و کرم پر پتنگ ڈور کٹے
چکور چاند کے دھوکے میں پھانکے انگارے
بہائے خونِ تمنا کریں طلب کس سے؟

طبیعتیں ہیں قضا وقدر کی کتنی کٹھور
چلے نہ سامنے جھکڑ کے مشتِ خاک کا زور
محل چبارے بسیرے گھروندے کلبۂ گور
ہے کتنی نازک و ناپائدار سانس کی ڈور
کہے حسین سجنا[1]! بھلے اسا تھوں ڈھورا!
نہیں ہے جس کو حساب وعذاب کا دھڑکا!

مآلِ کارِ حیاتِ گریز پا کیا ہے؟
یہ اختلافِ من و تو کا سلسلہ کیا ہے؟
ستیزۂ حق و باطل کا فائدہ کیا ہے؟
اس اہتمامِ خدائی کا مدعا کیا ہے؟
نہ مانے تجھ کو بشر تو مضائقہ کیا ہے؟
یہ عقدہ وہ ہے کسی سے جو حل نہیں ہوتا

سکھائے تو نے جسے ہست و نیست کے اسما
عطا کر اب اسے علمِ حقائقِ اشیا
کہ کب تک اس طرح آفاق میں وہ بھٹکے گا؟
یقیں کے نخل کی شاخِ گماں سے لٹکے گا؟

اتر کے عرشِ بریں کے منارۂ ہُو سے
نکل کے خلوتِ رازِ نہاں کے مُشکو سے
اٹھا کے پردہ تجلی کا روئے نیکو سے
کبھی ہم اہلِ زمیں کا بھی آ کے سن دُکھڑا!

اے آسماں کے مکیں! اے ملیکِ روزِ جزا!

---

[1]: شاہ مادھو لال حسین

کینیڈا کی زندگی تشنہ کی نظر سے

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ

(سی سا گا، کینیڈا)

نظم لکھوں یا کہوں غزل — ہوگا یہی ردِ عمل
حقیقت ہے، یہ نہیں ہزل — اُگتی ہے یاں پُر خار فصل
بنتا تھا جو عالم و عاقل — پر شکستہ ہے اور خجل
کہتے تھے جو زیست کا حاصل — نکلا ہے وہ، زہر ہلاہل
اپنے وطن سے اُڑ کر پنچھی — اس جنت میں ہو گیا داخل
کھینچ رہا ہے دار پہ خود کو — بے خبری میں اپنا ہے قاتل
دیتا ہے وہ خود کو سزائیں — دوجا کوئی نہیں ہے شامل
خود ہی اُٹھاتا ہے دیواریں — اور ہوتا ہے از خود حائل
ڈھو رہا ہے زندگی ایسے — جیسے ہو کوئی بَیل وگھائل
گاہے ہو جاتا ہے گریاں — بن جاتا ہے صورتِ سائل
(۱) نوسوگیارہ سے یوں لرزاں — اصلاحِ طفلاں سے ہوا غافل
نسل مادر پدر آزاد — کیا کہیں اُن کے احوال
فرمانبرداری سے کیا تعلق — دقیانوسی سے کیا حاصل
جن کی خاطر یہ چھٹا تو وطن — رُلاتے ہیں وہ با دل، نا دل
دل کا رشتہ نہ کوئی بندھن — ختم کیا رشتوں کا جنگل

کوئی نہیں اب اُسکی سنتا — سر دھنتا ہے صورت پاگل
رونے کو بھی نہیں ہے فرصت — خوشی کے دو پل نہیں ہے حاصل
نفرت تھی جس قرض سے اسکو — اُس ''دلدل'' میں وہ ہے مسلسل
کون بچی ہے اس لعنت سے — اس سے ملوث معاشرہ و محفل
عنقا، الفت وعشق کے قصے — بوالہوسی کا اک اک قائل
روتا ہے اب لہو کے آنسو — اپنی قدروں کا ہے وہ قاتل
بیتے دنوں کی یاد آجائے — اکھیاں کر لیتا ہے جل تھل
چھیڑ کے ماضی کے افسانے — بھرتا ہے اکھیوں کی چھاگل
کیا سوچ کے دیش اپنایا — کیوں آیا وہ سوئے مقتل
جسے کہتا تھا رشکِ جنت — آج اُسی سے خجل، خجل
جئے جاتا ہے تن تنہا — پشیمان و بوجھل، بوجھل
دیکھ کے وہ زیست کا درپن — رُخ اُس کا ہے سیاہی مائل
اپنی شکست پہ ہے نادم — آتا تک ہے اسکی گھائل
پھیر لیا اولادوں نے منہ — اس ''بہشت'' سے تشنہ لے چل
کہا تو نے ہے کڑوا سچ — اُگتی ہے یاں پُر خار فصل

(۱) نوسوگیارہ (اس کا تعلق ۱۱ ستمبر سے نہیں ہے) ایک فون نمبر ہے۔ جس پر بچے والدین کے خلاف اپنی شکایت کر سکتے ہیں جس پر پولیس والدین کو حراست میں لے جاتی ہے کیونکہ بچوں کو کسی طور سے ذہنی اذیتیں دینا قابلِ جرم ہے اس لئے بچے من مانی کرتے ہیں۔۔

○

خاموشی اور کنارہ

پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی)

یوں تو زباں چپ رہتی ہے
لیکن خامشی اکثر ایک زباں بن جاتی ہے
یہ بھی ہم نے دیکھا ہے
جب ہونٹوں پر پہرے ہوں
آنکھ زباں بن جاتی ہے
اشک بیاں کر دیتے ہیں
دُکھ کے سارے افسانے
یہ بھی ہم نے دیکھا ہے
خامشی کے صحراؤں میں
کتنے طوفاں اُٹھتے ہیں
جانے اُن طوفانوں میں
لہر کہاں سے اُٹھتی ہے
یہ بھی اکثر ہوتا ہے
لفظ، زباں اور آنکھوں میں
گہرا رشتہ ہوتا ہے
اس رشتے کے دامن میں
چپ کا ساگر بہتا ہے
چُپ تو کوہ ندا بھی ہے
جس کی چوٹی پر چڑھ کر لوگ کہیں کھو جاتے ہیں
روحوں کے ہو جاتے ہیں
یہ تم نے بھی دیکھا ہے
چُپ کے اُبلتے لاوے میں
کتنے پیار، سمندر، لہریں جلتے اور مچلتے ہیں
اور
اُبلتے لاوے میں یہ دھرتی بہہ جاتی ہے
انسان ریزہ ریزہ ہو کر ٹکڑوں میں بٹ جاتا ہے

تو کیوں جستجو ہے؟

پروین شیر (کینیڈا)

خلا کے سمندر میں کشتی زمیں کی
رواں ہے سمیٹے ہوئے اپنی مشفق
پناہوں میں سب کو
یہ سیارہ مرکز ہے اک وسعتِ بے کراں کا
مگر اس کے سینے پہ کھینچی
گئیں سرحدوں کی لکیریں ہیں جیسے
خراشیں حسیں نرم و نازک بدن پر
لکیروں کے اندر
سبھی اپنے اقدار و تہذیب کے دائرے میں
مقید ہیں کب سے نہ جانے
اور ان سرحدوں میں بھی اپنے عقائد
کی پتھریلی، مضبوط، اونچی
فصلیں کھڑی کی گئی ہیں!
تو ان پتھروں کا
اُٹھائے ہوئے وزن لرزاں ہراساں
زمیں ہے ہماری
الگ اپنا اپنا جہاں در جہاں ہے
ہیں بیگانہ اک دوسرے سے
جیئے جا رہے ہیں اکیلے اکیلے
کہ اپنی زمیں پر
کسی زندگی کو
کسی زندگی کی خبر ہی نہیں ہے
تو کیوں جستجو ہے
قمر اور مریخ پر زندگی کی؟

قطعات

حسیر نوری (کراچی)

کسی سے ربط نہیں اور واسطہ ہی نہیں
میں اجنبی ہوں مجھے کوئی جانتا ہی نہیں
عجیب رُت ہے، عجب فصلِ زخم کاری ہے
کہ پھول کوئی بھی پہچان کا کھلا ہی نہیں

دھوپ در آئے گی دیوار اٹھا کر رکھو
دل کو تابندہ رکھو ذہن جگا کر رکھو
کیا پتہ راہ میں کب ہونے لگے ہنگامہ
بچ نکلنے کے لئے راہ بنا کر رکھو

قریب رہتے ہوئے دُور ہی رہا ہوں میں
نہ جانے ربط سے کیوں ماورا ہوا ہوں میں
نہ چھاؤں ہے نہ جگہ کوئی سر چھپانے کی
حدودِ کرب سے آگے گزر گیا ہوں میں

تیری خواہش پہ نچھاور ہے مری جانِ عزیز
اپنی مرضی سے کوئی کام کہاں کرتا ہوں
ماند پڑتی ہوئی آنکھوں کی چمک دیکھ ذرا
تیرے برتاؤ، تری بات سے افسردہ ہوں

میں سطحِ آب پہ تنکے کی طرح بہتا ہوں
مقام کوئی بھی ہو سر بلند رہتا ہوں
خود اپنے آپ سے جو بات کہہ نہیں سکتا
بس ایک تم سے ہی وہ دل کی بات کہتا ہوں

میں اگر جسم ہوں تو میرے اندر کون ہے
جس کا پس منظر نہ ہو آخر وہ منظر کون ہے
میرا سایہ بن کے دن بھر جوڑتا ہے حسیر
وہ مرے اندر تھا پہلے اب یہ باہر کون ہے

ہائیکو

صابر عظیم آبادی (کراچی)

آئی ملن کی رات
رنگ حنا کے نکھرے ہیں
چمکے گورا ہاتھ

سونے والے جاگ
کان میں اچھا لگتا ہے
مست ہوا کا راگ

غنچہ ہے نوخیز
ایسے میں آ جاؤ تم
موسم ہے گل ریز

گلہائے صد رنگ
تیر رہا ہے خوشبو میں
تیرا سارا انگ

موسم کے سو رنگ
دھان کے کھیتوں میں اکثر
جب ہوتے ہو سنگ

آتا ہے نایاب
کل اُن کو کیا کھانا ہے
سوچیں کچھ احباب

کیا پوچھو ہو حال
اس دنیا کے گلشن میں
جینا ہے جنجال

زلفیں ہیں بادل
آنکھیں ساگر کی لہریں
چہرہ جھیل کنول

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش
(کوہاٹ)

سکوت

دستکیں
دے رہا ہے دروازہ
''اے مکینو! اٹھو!
کہ گھر سارا
شب زنوں کے ستم کے زد میں ہے''
لیکن اندر سے
خاموشی کے بن
کوئی آواز ----
ادھر نہیں آتی

دست درازی

کچھ لوگ
آسماں کو
پیروں تلے رکھ کر
زمین کی جانب
دست درازی
کررہے ہیں

○

اُن کا لہو ہے بولتا

(شہدائے آپریشن راہِ راست کے نام)

شگفتہ نازلی
(لاہور)

بیشک کہ راہِ حق میں تھے بڑھتے ہوئے جتنے قدم---
اُن کو وطن کی مٹی کا ہر ذرہ بھی عزیز تھا---
اُنہی میں تھے نجم وقمر اور خان' عاصم واسلم بھی---
مقصد عظیم روبرو ایثار مانگتا رہا---
ایثار ہی سے عظمتوں کی انتہا کو پا لیا---
جب ''راہِ راست'' کے لئے نذرانہ جان کا دیا---
شہید انہیں لکھا گیا' پڑھا گیا' کہا گیا---
شہادتوں کی خواہشیں مقدروں کے ساتھ ہیں---
شہید ہوا اس پہ پھر سعادتوں کے ساتھ ہے---
وہ کتنے خوش نصیب تھے جو چاہا اس کو پا لیا---
سلام والدین کو' سلام عزم بے مثال---
جنہیں ہے اطمینان کے بیٹے ہوئے ہیں سرخرو---
سراہتے ہیں بہنوں کو جن کے وہ سارے بھائی تھے---
وہ اپنے پیارے بھائیوں کی باتیں یاد کرتی ہیں---
سراہتے ہیں بھائیوں کو' دوستوں کو جو کہ سب---
اُنہی کی ساری خوبصورت یادوں کو دُہراتے ہیں---
یہ ساری باتیں' یادیں اور دُعائیں اُن کے واسطے---
جنہوں نے جان دی کہ پیارا ملک سلامت رہے---
ہو پاک شرٗ فساد سے اور امن کا گہوارہ ہو---
بے گھر ہوئے جو لوٹ کے اپنے گھروں کو جا سکیں---
اُن کا لہو ہے بولتا' وطن عزیز کی بقا---
کیونکہ شہید کی ہی موت' قوم کی حیات ہے---!

○

رس رابطے

جستجو ترتیب تدوین

وقار جاوید (راولپنڈی)

جناب گلزار جاوید

سلام۔ "چہارسو" کا تازہ شمارہ مل گیا۔۔۔۔ میرے لیے حاصلِ کلام یہ لفظ ہیں جو آپ نے لکھے "چہارسو کے زیرِ نظر شمارے کو وطنِ عزیز میں علاقائی زبانوں سے برتی گئی بے اعتنائی کے ردِعمل میں بارش کا پہلا قطرہ بھی گردانا جا سکتا ہے۔۔۔۔ غور و فکر کے در وا کر کے بہتر مستقبل کی شکل بھی نکالی جا سکتی ہے!! ممکن یہ تبھی ہے جب ہماری سوچ اور فکر کا دائرہ ہر قسم کی قید سے قطعی طور پر آزاد ہو!!!" میں نے شروع میں آپ سے عرض کیا تھا کہ آپ نے میرا انتخاب کر کے اپنے آپ کو امتحان میں ڈال لیا ہے کہ میں نے تو کچھ سنبھال کے رکھا ہے نہ میں نے ایسی دوستیاں نبھائی ہیں جنھیں میں صرف اپنی ذات کے حوالے سے نبھا رہا ہوں۔۔۔۔ میری ذات سے اس لیے بھی کسی کو کوئی دلچسپی نہیں کہ میں جسے زندگی کا مشن بنا چکا ہوں اس سے ان کی وابستگی واجبی سی ہے۔۔۔۔ کچھ تعلقِ خاطر زبانی اور سکالی اختلافات کا ہے۔۔۔۔ میں ان اختلافات کو بھول نہیں سکتا کیونکہ میں اپنے ماضی کو کسی صورت بھلا ہی نہیں سکتا۔۔۔۔ بلکہ میرا اصل مسئلہ ہے پنجاب اور پنجابی کے حوالے سے کھوئے ہوؤں کی جستجو سو ماضی دراصل میرے تصورِ مستقبل کا لازمی اور بہ وتیرہ ہے (مگر اپنی ذات کے حوالے سے ماضی کی وہ تحریریں محفوظ نہ رکھ سکا جو بہت سے دوستوں نے میری کتابوں یا ذات کے حوالے سے انگریزی میں یا پنجابی میں لکھیں اور آپ کو بھجوا نہ سکا)۔ لیکن آپ نے جس صورت میں مجھے پذیرائی دی۔۔۔۔ وہ انوکھی اور منفرد صورت ہے میں نے شمارے میں کئی بار روبی طاہرہ اقبال والا رپورتاژ پڑھا۔۔۔۔ تاہم طاہرہ نے پٹیالہ یونیورسٹی کے آنجہانی ڈاکٹر برکت سنگھ کی "یاداں گئی بار دیاں" نہیں پڑھی۔۔۔۔ پنجابی میں ہے!! اگر پڑھی ہوتی تو بنگلہ دیش والوں کے بارے میں وہ تحریر کسی اور ڈھنگ میں لکھی ہوتی جو زیرِ نظر شمارے میں چھپی ہے۔ تعظیم جلال آبادی کو ان سیاسی قربانیوں کا علم نہیں جو بنگال اور پنجاب، سندھ نے یوپی بہار سی پی وغیرہ کے مسلمانوں کے لیے دیں۔ انھیں کیونکہ پیوارڈ کا علم نہیں انھیں بنگالیوں، بنگالی مسلمانوں کی خودمختاری حاصل کرنے کی جدوجہد کا یا علم نہیں یا دانستہ نظرانداز کرتے ہیں۔۔۔۔ بنگالی مسلمانوں نے یوپی سی پی بہار کے مسلمانوں کے لیے اپنی شرح آبادی 53 سے 49 کروالی پنجاب نے اپنی ۷ فیصد آبادی کی نمائندگی یوپی سی پی بہار کو دے دی نتیجے میں 47 کو دونوں اکثریتی صوبے دو ٹکڑے ہو گئے۔ طاہرہ کو علم نہیں۔ پاکستان بننے کے بعد جب پہلی عید آئی تو بنگالی (ان میں عطاءالرحمٰن جیسی شخصیات شامل تھیں) اپنے چیف سیکرٹری (پنجابی لاہوری جناب عزیز احمد) کو عید مبارک کہنے ان کے بنگلے پر گئے۔ موصوف نے چپڑاسی سے پوچھا یہ پاکستان جمعدار کے دفتر کیوں لگا رہا ہے چپڑاسی نے کہا بنگالی بابو صاحب لوگ آیا ہے۔ کہا پوچھو کیا بات ہے؟ عید مبارک کہنے آیا ہے کو خیر مبارک۔۔۔۔ کہا خیر مبارک مگر کہتا ہے باہر آ کر عید ملو۔۔۔۔ عزیز احمد نے سوچا فرمایا بنگالی۔۔۔۔ سو پچاس روپے کے نوٹوں والی گڈی پکڑ چپڑاسی کو دیا کہا ان میں ایک ایک تقسیم کر دو۔۔۔۔ یہ قصہ عطاءالرحمٰن نے اپنی سوانح عمری میں لکھا جو 1970-71 سے پہلے چھپ چکی تھی تو یہ تھا مغربی پاکستان کا مشرقی پاکستان پر پہلا عکس۔۔۔۔ پھر مغربی پاکستان کی Establishment کی شہ پر بہاریوں نے جو اَت مچائی طاہرہ نہیں جانتیں۔ بنگالیوں نے ساتھ دینے کے لیے پیریٹی مان لی (قومی اسمبلی میں مساوی نمائندگی) اس سے بڑی قربانی آپ بنگالیوں سے کیا توقع کر سکتے تھے۔ کیا آپ آج پنجاب کی دوسری صوبوں سے parity کے لیے تیار ہیں؟ آج بھی جب کوئی بین الاقوامی مسلمانوں کا مسئلہ آتا ہے۔۔۔۔ ہندوستان کے مقابلے میں بنگلہ دیش ہمارے ساتھ کھڑا ہوتا ہے۔ اردو زبان اور اردو کلچر نے ہمیں اتنا تنگ نظر اور محسن کش بنا دیا ہے کہ ہماری سوچ اور اظہار میں توازن نام کی شے ہی نہیں رہی۔ آپ کے افسانے کوئی کی زبان کے حوالے سے کیا وہ گولیاں جو بنگالیوں کے سینے میں پیوست ہوئیں وہ ہم مغربی پاکستان والوں نے آزاد پر امریکہ سے منگوائی تھیں؟ اور جو آج اپنے ملک میں ہو رہا ہے کیا ہے؟ معافی چاہتا ہوں گلزار صاحب! اثر چوہان صاحب نے سچ لکھا کہ "مرزا صاحب گفتگو میں کبھی کبھی تلخ بھی ہو جاتے ہیں"۔ سچ ہے اور یہ تلخی گزشتہ ساٹھ برس کی دین ہے شاید یہی تلخی ان سطور میں بھی آ گئی ہے معذرت چاہتا ہوں۔۔۔۔ آپ کے سارے قارئین سے کہ ان کو بنگالی تو نہیں بہت سی پنجابی دو کھاڑی بھگوان داس اعجاز کی نظم "دلی سے ملتان" اچھی لگی اور ایک پنجابی کی ضرب المثل یاد آئی

کالی کتا چڑھیا   کھادگی ملتان
دتی بھوکاں ماریاں   سڑ گیا ہندوستان

غالب نے کہا تھا

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے

آپ نے پنجابی کو مان دیا ہے۔۔۔۔ بہت شکریہ

شفقت تنویر مرزا (لاہور)

برادر گلزار جاوید صاحب السلام علیکم۔

"چہارسو" کا شمارہ ستمبر اکتوبر ۲۰۰۹ء موصول ہوا۔ بے حد شکریہ
ڈاکٹر کا سوچ کھولتے ہی زیر اشاعت (ذکر "زہرہ نگاہ") کی نمایاں کر

ایڈیٹر قلم نے اصحاب کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ قلم کا اختتام جس کلائمکس پر ہوتا ہے وہ انسانی ضمیر کے منہ پر طمانچہ ہے یعنی ہم سب اس کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ شفقت تنویر مرزا صاحب کا "قرطاسِ اعزاز" ایک وقیع دستاویز ہے حسب سابق آپ کا لیا ہوا انٹرویو اس گوشے کی جان ہے جس سے صاحبِ اعزاز کے فن اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ اس حصے کے تمام مضامین سنجیدہ سوچ کے حامل ہیں۔ تاہم مرزا صاحب کے مضمون "سرائیکی تحریک کی حقیقت اور سیاست" کے حوالے سے مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ مجھے حال ہی میں (24 جولائی تا پہلی اگست) سندھ، بلوچستان اور سرحد کے اہلِ قلم کے ایک وفد کے ہمراہ پنجاب کے مختلف شہروں کے دورے کا موقع ملا جس کا اہتمام اکادمی ادبیات پاکستان نے کیا تھا۔ ہم نے ملتان کے دورے میں دیکھا کہ سرائیکی صوبہ اب وہاں کے دانشوروں، صحافیوں، ماہرینِ تعلیم اور عوام کے دل کی آواز ہے۔ ہم جس علمی و ادبی ادارے میں بھی گئے اس کے حق میں انتہائی جوشیلی اور احتجاج سے بھرپور تقریریں سننے کو ملیں۔ میں اس دورے کی روداد قسط وار ایک انگریزی اخبار کے لیے لکھ رہا ہوں۔ 15 اگست کو شائع شدہ قسط میں، میں نے لکھا تھا "ذاتی طور پر میں نئے صوبوں کے قیام کا مخالف نہیں لیکن صوبے لسانی بنیادوں کے بجائے انتظامی بنیادوں پر بننے چاہئیں۔ اگر لسانی بنیادوں پر صوبے بنے تو کل کلاں کو شمالی علاقہ جات کے بلتی اور شینا زبانیں بولنے والے عوام بھی اپنے لیے نئے صوبے کا مطالبہ کر دیں گے۔" قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اس کالم کی اشاعت کے دو ہفتے بعد ہی حکومت نے از خود شمالی علاقہ جات کو (عملاً) نئے صوبے کا درجہ دے کر وہاں گورنر کا تقرر کر دیا (ظاہر ہے اس پر پہلے سے کام ہو رہا ہوگا)۔ اگر یہ رجحان جاری رہا تو سرائیکی صوبے کے قیام کو کس طرح روکا جا سکتا ہے جبکہ یہ مطالبہ سرائیکی بیلٹ کے لوگوں کے رگ و پے میں سما چکا ہے۔ غالب عرفان صاحب ایک سینئر اور معتبر شاعر ہیں لیکن مذکورہ شمارے میں انہوں نے اپنے خط ("ربطِ باہم") میں ایک مشہور مصرع اس طرح رقم کیا ہے "اے کمال افسوس ہے صد ہا کمال افسوس ہے" یہ صحیح نہیں۔ یہ پورا شعر مولانا آزاد نے ذوق کے ضمن میں اس پس منظر کے ساتھ "آبِ حیات" میں تحریر کیا ہے۔ ان دنوں جب کوئی عالی مضمون چستی اور درستی کے ساتھ موزوں ہوتا تو اس کے پہروں میں (استاد) آسمان کی طرف دیکھتے اور کہتے پھرتے۔

یوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

الغرض "چہارسو" کا زیرِ نظر شمارہ 98 فیصد کامیاب ہے۔ 98 فیصد اس لیے کہ اس میں جناب کرامت بخاری، جناب انجم جاوید اور جناب غالب عرفان پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں لیکن عزیزی اکرام تبسم اور نجمی احمد صغیر صدیقی کو نگاہیں تلاش کرتی ہیں۔

ایس۔ ایم۔ معین قریشی (کراچی)

برادرم گلزار جاوید، اور ہم سب کے گلزار ہرے بھرے رہو خوش رہو

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ سب سے پہلے رمضان المبارک کی ساعات سعید سے فیض یابی کی دعا آپ کے لیے ہم سب کے لیے!

"چہارسو" کا شمارہ ستمبر اکتوبر ۲۰۰۹ء موصول ہوا۔ میں اس وقت اس پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا کیوں کہ اس کام کے لیے مجھ سے بہتر احباب قلم موجود ہیں۔ میں تو اس وقت آپ کو اس حقیقی خدمتِ ادب پر خراجِ محبت پیش کرنا چاہتا ہوں جو آپ خاموشی سے سالہا سال سے انجام دے رہے ہیں۔ مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم نے "غبارِ خاطر" میں یہ شعر نقل فرمایا ہے (معلوم نہیں یہ اُن کا اپنا شعر ہے یا کسی اور شاعر کا؟) کہ:

ہے آج تو سرگزشت اپنی — کل اس کی کہانیاں بنیں گی

یہ آپ کے کارنامۂ ادب پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ آپ جس لگن اور کمال ہنر کے ساتھ جو تاریخِ ادب مرتب کر رہے ہیں وہ آج کے اہلِ قلم کے لیے مظہر رہا تو ہے ہی وہ کل ایک تاریخی سرمایۂ ادب کے طور پر آنے والوں کے لیے قیمتی سامان بنتا جا رہا ہے جو انہیں بہت سی کتابوں سے بے نیاز کر دے گی۔ "چہارسو" مدتوں سے مل رہا ہے لیکن میں ایسا کاہل قلم کار ہوں کہ کبھی آپ کو اس کی رسید بھی نہ بھیج سکا۔ آج "چہارسو" موصول ہوا تو سب کچھ چھوڑ کر اس دیرینہ قرضِ محبت کی ادائی کے لیے قلم تھامے بیٹھ گیا ہوں۔ سو ان روکھے پھیکے الفاظ کو قبول فرمائیے کہ کم از کم ان کے باطن میں خلوص اور اعترافِ کمال کی فضا ضرور موجود ہے۔ آپ کے ساتھ آپ کی "مدیرہ" معاون اور ہمدردانِ کارکن کی خدمت میں بھی یہی جذبات پہنچیں۔

حفیظ الرحمن احسن (لاہور)

محترمی بھائی گلزار جاوید۔ السلام علیکم

تازہ شمارے پر کچھ کہنے سے قبل میں اس میں موجود قرطاسِ اعزاز بنام شفقت تنویر مرزا کے حوالے سے چند جملے ضرور کہنا چاہوں گا ہمیشہ کی طرح اس بار بھی یہ گوشہ آپ کی محنت اور چہارسو کی روایت کا منہ بولتا ثبوت رہا جس کی مبارکباد پیش ہے۔ پھر بھی صاحبِ اعزاز پر مختص کیے گئے کل صفحات میں سے پندرہ صفحات پر محیط مرزا صاحب کی مادری زبان میں (جو ملک کے سب سے بڑے صوبے کی بھی زبان ہے) مضامین/مقالے دیکھ کر یہ توقع بے جا نہ ہوگی کہ چہار سو کے قاری آئندہ سندھ، بلوچستان اور سرحد کے ادیبوں/ شاعروں پر بھی شائع قرطاسِ اعزاز میں تقریباً ۲۰ فیصد مقالات ان کی (قلم کار کی) مادری زبان میں ملاحظہ کریں گے۔ اس طرح ہم اردو بولنے لکھنے اور پڑھنے والوں کو بیرونی ان زبانوں کو پڑھنے کی حد تک ترغیب دے گا بلکہ وہ ان کی سمجھ سے بالاتر ٹھہرے رہیں گی۔ "گم گشتہ" میں طاہرہ اقبال اس بار پھر اپنی کم علمی کا شکار نظر آئیں۔

صفحہ ۱۰ کی دوسری عبارت میں کھانے پینے کی چیزوں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے تیسری سطر میں "دوسا" کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ "ٹاٹا بنگالی پرگر تھا" میں یہاں ان کی اطلاع کے لیے عرض کرتا چلوں کہ یہ ایک South Indian مجبوب پکوان ہے جو ہندوستان کے تقریباً ہر بڑے شہر کے ریستورانوں میں عام طور پر اور یہاں کراچی میں کچھ منتخب ہوٹلوں کے علاوہ لندن، نیویارک، واشنگٹن، ٹاوہ، ٹورنٹو، سنگاپور، ہانگ کانگ اور ساری دنیا کے مشہور ہوٹلوں میں خصوصاً بہ آسانی دستیاب ہے۔ یہ ڈش چاول کے آٹے کے Paste کو فرائی پین یا توے میں "گھی" میں تلا جانے کے بعد حسب خواہش سموسے میں استعمال ہونے والے مرکب یا قیمے کے تیار شدہ مرکب میں لپیٹ کر کھانے کی میز کی زینت بنتی ہے ایک بات اور سادہ کیے ہوئے پیسٹ کو جو چپاتی سے مشابہ ہوتا ہے سادہ دوسا، سبزی ترکاری اور آلو کے ساتھ مسالہ دار مرکب میں لپیٹے ہوئے کو مسالہ دوسا اور قیمے کے تیار شدہ مرکب میں لپیٹے ہوئے کو قیمہ دوسا کہتے ہیں یہ ہرگز ہرگز برائے کے اوپر فٹ کرکے کھایا بنگالی برگر نہیں ہوتا۔

غالب عرفان (کراچی)

جناب گلزار جاوید صاحب! سلام و تحیات

ماہنامہ چہارسو کا شمارہ ستمبر، اکتوبر ملا۔ یہ پہلا شمارہ ہے جو مجھے ملا ہے جس پر جلد نمبر 18 چھپا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ گزشتہ 18 برس سے شائع ہو رہا ہے۔ شفقت تنویر مرزا صاحب کے بارے میں اپنا مضمون "جیون دی کڈی" دیکھ کر حیرت اور خوشی ہوئی۔ حیرت اس بات کی کہ مضمون میں نے ارسال نہیں کیا تھا آپ کو کس نے بھیجا؟ خوشی اس بات کی کہ اتنی عظیم شخصیت کے بارے میں آپ نے "چہارسو" کا جو گوشہ مخصوص کیا اس میں میرا حصہ بھی پڑ گیا۔ "چہارسو" کے بانی مدیر اعلیٰ سید ضمیر جعفری ہیں۔ میں نے سید ضمیر جعفری صاحب کا انٹرویو کیا تھا جو 1992ء میں میری کتاب "دلچسپ ملاقاتیں" میں شائع ہوا۔ آپ کے مطالعہ کے لیے فوٹو کاپی بھیج رہا ہوں۔ گزشتہ 33 برس سے میں اردو، پنجابی رسالہ "جریدہ سانجھاں" شائع کر رہا ہوں۔ تازہ شمارہ آپ کو ارسال کر دیا گیا ہے۔

تنویر ظہور (لاہور)

واجب الاحترام گلزار جاوید صاحب

السلام علیکم (عید مبارک) چہارسو سے ہوئی میں ہر طرف بہار آ گئی۔ کیا عرض کروں کا ہر پرچہ ہے آپ نے تو شفقت تنویر مرزا صاحب کو "شو پیس" بنا دیا ہے۔ میں نے انہیں آج ہی خط لکھا ہے آپ مجھے ہوئی کے سے ویرانے سے فیصل آباد لے گئے۔ آپ مالک ہیں جسے چاہیں ویرانے سے اٹھا کر بڑا شہر بخش دیں۔ "چہارسو" میں چہارسو احباب کے بارے ہیں میں بھی حاضر ہوتا ہوں۔ چہارسو کے چرچے اس گاؤں بھی پہنچے رہے ہیں۔ دیکھا نہیں تھا۔ بھائی یہ تو خاصے کی چیز ہے سبحان اللہ۔ آپ تو ہمیشہ کے گلزار ہیں رسالہ کے احباب سے میرا اسلام کہیں۔ شفقت سے متعلق میرے مضمون کو آپ نے خوب آب و تاب عطا کی ہے مہربانی۔

آصف ثاقب (ایبٹ آباد)

مدیر محترم! سلام و رحمت

ماہنامہ کی مقدس و معطر فضاؤں میں "ستمبر اکتوبر ۲۰۰۹ء" کے قرطاس اعزاز کے لیے آپ نے نہایت ہی ہمہ گیر، موثر و معتبر شخصیت کا انتخاب کیا۔ بلاشبہ وہ اپنے افکار و نظریات سمیت اس کا بھرپور استحقاق رکھتے ہیں۔ "رُو برو دراست" میں مختلف الانواع سوالات سے جس طرح آپ نے کثیر الجہات جوابات کشید کیے ہیں اس کا اعتراف تو آخر آخر میں مرزا صاحب نے خود بھی کیا ہے پھر اس کے بعد بھلا کسی اور کے کہنے کو کیا رہ جاتا ہے محترم شفقت تنویر مرزا صاحب پر "تجھوں رب دیاں رکھاں" سے "قربت حسن" تک تمام تعارف، مضامین اور انتخاب کلام اُن کی متعدد سیاسی و صحافتی، تہذیبی و ثقافتی، علمی و ادبی جہتوں کا احاطہ تمام تر متاثر کے ساتھ بہت ہی پختگی و عمدگی سے کرتی ہیں اور کچھ ایسے حقائق کو بھی قارئین کے مطالعہ کے لئے منظر عام پر لاتے ہیں جن سے اُن کی اعلیٰ ظرفی، بے غرضی، وسیع النظری، منکسر المزاجی اور پنجابی کاز کے فروغ و ارتقاء کے لئے مسلسل جدو جہد کا نہایت سراہا جانے والا پہلو بھی سامنے آتا ہے روزنامہ "ڈان" میں مرزا صاحب "پنجابی کس" اور "پنجابی محور" کے تحت نام سے ایس ٹی ایم کے سلسلے سے اظہار خیال فرماتے ہیں (جو بعد ازاں مزید استفادے کے لئے پنجابی رسائل کے مختلف شماروں کی زینت بھی بنتے ہیں) جن میں پنجابی زبان و ثقافت کی ترقی و ترویج کے موضوعات کے ساتھ کتب پر بھی تاثرات و تبصرے ہوتے ہیں جن سے لکھنے والوں کو بہت حوصلہ افزائی و رہنمائی ملتی ہے میرے شعری و نثری مجموعوں "سوچاں دیاں صوتاں" اور "روپ سروپ" پر اُن کی گرانقدر رائے اُنہی کالموں کا حصہ تھی۔ "کم گو" نفسیاتی امراض کے پس منظر میں بنی ہوئی کہانی جس میں مذکورہ مخفی شعبے کا گہرا مطالعہ و مشاہدہ اُسے حقیقت سے قریب تر بنا رہا ہے اگر ایسے گھٹن سماج پر کہیں میسر ہونے لگیں تو بہت سے امراض میں واضح کمی آ سکتی ہے۔ "اُڑان" کی عمدہ (پیشکاری) نے اداکاری کو فن بلندیوں پر پہنچانے والی دکھائی گئی جہاں کردار کو جاندار بنانے کے لیے جان دینے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ "مرگ ملاقات" انسانی فطرت کا یہ خود فرمانہ رویہ جس زاویہ اجاگر کرتا ہے کہ جہان فانی سے رخصت ہونے والے کیلئے "کلمۂ خیر" کی بجائے اس رویئے کو ابھی پرسش احوال و حالات حاضرہ پہ تبادلۂ خیال کے لئے موزوں سمجھا جاتا ہے تا آنکہ جنازہ گاہ آ جاتی ہے "کوئی کی زبان" محبت و نفرت کے فلسفے سے محمود گی متضاد زاویہ نظر کی ترجمان موثر کہانی ہے جبکہ اس آزمائش پہ اداس سوچ ابھرتی ہے کہ جو کسی جینے کے لیے کوئی

نہیں رکھتے انہی کا سینہ کسی کی گولی کی زد میں کیوں آجاتا ہے؟

شگفتہ نازلی (لاہور)

محترم گلزار جاوید صاحب

چہارسو شمارہ برائے ستمبر اکتوبر وصول ہوا۔

اس کے مشمولات توجہ کے قابل ہیں اور کئی پہلوؤں سے قاری کو دعوت فکر دیتے ہیں۔ کسی بھی مہذب معاشرے اور جمہوری نظام کی یہ شرط اول ہے کہ اختلاف رائے کا احترام کیا جائے اور ہر شخص کو اپنی بات مکمل کرنے کا موقع دیا جائے۔ آپ نے شگفتہ تنویر مرزا صاحب کے ساتھ طویل میں انکا گوشہ اور انکا انٹرویو شائع کر کے اسکا عملی ثبوت دیا ہے۔ انکی باتیں چونکا دینے والی تھیں۔ میں ایک عرصے سے ملک سے باہر ہوں اور پاکستان کی اندرونی سیاست میں بہت زیادہ ملوث نہیں مگر پھر بھی انہوں نے ایسی باتیں کہیں جو بڑی حد تک سچ اور ملک و قوم کے وسیع تر مفاد میں نہیں تھیں۔ مجھے ان کے پنجابی ہونے اور پنجابی زبان سے انکی محبت کے حوالے سے کوئی شکایت نہیں مگر انہوں نے بڑی حد تک اس علاقائی سوچ کا مظاہرہ کیا ہے جس کی وجہ سے مشرقی پاکستان الگ ہوا۔ ایسی تحریکیں سندھ اور بلوچستان اور کسی حد تک صوبہ سرحد میں بھی وقتاً فوقتاً اٹھتی رہتی ہیں۔ اردو پاکستان کے اتفاق کی نشانی ہے۔ علاقائی زبانوں کی ترقی اور ترویج کو یقیناً اولیت دینی ضروری ہے مگر اس کے لئے اردو کی قربانی کے دور رس منفی نتائج نکل سکتے ہیں جو شاید ہمارے قومی تشخص اور اتحاد کے لئے بہتر نہ ہوں۔

دوسری چونکا دینے والی تحریر محترمہ طاہرہ اقبال کا "بنگلہ دیش" کا سفرنامہ ہے۔ انکی تحریر بہت دلکش، انداز بیان دل کو تھام لینے والا اور انکا مشاہدہ بہت گہرا ہے۔ انکا سفرنامہ پڑھ کر میرے دل میں ایک ٹیس اٹھی، درد کی ایک ٹیس۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ بنگلہ دیش میں پاکستان، ہمارے مشترکہ کلچر اور تقسیم سے قبل برصغیر کے مسلم معاشرے اور انکی نشانی "اردو" سے اس قدر نفرت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ میں تو "بیوقوفوں کی جنت" میں جیتا تھا کہ "اگرچہ اب محبت کا زمزم" تو نہیں بہہ رہا مگر کہیں نہ کہیں اس پرانے رشتے کی ہلکی سی گرماہٹ تو اب بھی موجود ہوگی کہ ان دونوں ملکوں نے بہر حال "ایک ماں کے پیٹ میں پاؤں پھیلائے تھے" کبھی کراچی اور لاہور اسکے تھے اور ڈھاکہ اور چٹاگانگ ہمارے تھے۔ بنگلہ دیش میں اردو پر پابندی اور لوگوں کا وہاں اردو بولنے سے خوف کھانا۔۔۔ یہ تو ناقابل فہم صورتحال ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب دوسری جنگ عظیم میں برطانیہ نازی جرمنی سے برسرپیکار تھا تو اس نے بھی انگلینڈ میں جرمن زبان پر پابندی نہیں لگائی ہوگی۔ پھر فرحت افشاں کا خود کو شگفتلا کہلانا، یہ کس ذہنیت کا مظاہرہ ہے۔ میں بنگلہ دیش کے سلسلے میں اس خوش فہمی میں اس لئے بھی مبتلا تھا کہ امریکہ میں جو بنگالی کمیونٹی ہے وہ ہم سے بہت پیار اور اپنائیت سے ملتی ہے اور اسی طرح اپنے سعودی عرب کے سفر کے دوران میں نے دیکھا کہ وہاں موجود بنگالی بہت ہی محبت سے پیش آتے ہیں۔ اب یہ غلط فہمی رفع ہوئی کہ بنگلہ دیشیوں کے دل سے کدورت اب بھی نہیں گئی۔ جہاں تک بنگال میں اردو کا تعلق ہے شاید بنگالیوں کو بتانے والا اب کوئی نہیں کہ تقسیم سے پہلے تمام بنگالی مسلم سیاست دان، ممتاز شہری اور مشہور خاندان اردو ہی بولتے تھے۔ ان میں سہروردی، اصفہانی، نورالامین، بھاشانی اور فضل الحق بھی شامل ہیں۔ بہر حال اب وقت بہت آگے نکل چکا ہے اور جو کھو گیا اس کا اب مداوا نہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ ہمارے موجودہ رہنماؤں کے لئے ایک لمحہ فکریہ ضرور ہے۔

فیروز عالم (یو۔ایس۔اے)

برادر عزیز گلزار جاوید صاحب! السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ حسب روایت دلچسپ اور فکر انگیز تخلیقات کا حامل ہے۔ آپ کے براہ راست کے تحت تیکھے اور تیز سوالات سے محترم شگفتہ تنویر مرزا کی بطور شاعر، ادیب، سیاسی اور صحافی شخصیت ابھر کر مکمل طور پر سامنے آئی۔ سب سے بڑی خوبی مرزا صاحب کی ہر شعبے میں کردار کی توانائی نظر آتی ہے۔ مرزا صاحب میرے ہم عمر ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے اور موجودہ زمانے تک کی تاریخ کے ہم دونوں چشم دید گواہ ہیں۔ مرزا صاحب نے اس سارے زمانے کی مختصر سیاسی، صحافتی، لسانی اور ادبی تاریخ صاف گوئی سے بیان کر دی ہے۔ اضافی سوغات کے طور پر رضا جبار رسالی، تنویر ظہور، کلیم اختر، آصف ثاقب، فرخ چوہان اور محمد عامر خاکوانی نے اپنے مضامین میں مرزا صاحب کی شخصیت و فن پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ مرزا صاحب کی اردو و پنجابی شاعری پر مشتمل پروین ملک کا انتخاب بھی عمدہ ہے۔ مرزا صاحب کا مضمون "سرائیکی تحریک" ان کی تحقیقی صلاحیت کا آئینہ دار ہے اور مرزا صاحب کا ڈرامہ "محترم ملک" بھی مرزا صاحب کی اپنی مٹی سے محبت کا آئینہ دار ہے۔ زیر نظر شمارے میں افسانوی حصہ بھی بہت بھرپور ہے۔ جوگندر پال کا تیسرا شخص، شاہد رحمن کا مرگ ملاقات، عمران مشتاق کا مسیحے کا ذکر کیا، خورشید احمد کے افسانے، فیروز عالم کا لحد گم گشتہ، سیما پیروز کا گڈ لڈ ریڈ ہوکل کا سفر در سفر، نعیم کوثر کا چڑے کا سکہ، مشتاق انجم کی کا لندن، دیپک کنول کا اول بندی اور گلزار جاوید کا گولی کی زبان موضوع کی تازگی اور ٹریٹمنٹ کی عمدگی کے باعث مجھے عمدہ لگے۔ خاص کر نعیم کوثر نے جس طور کربلا و غارت کی کیفیات کا ذکر کر کے آغاز بنگلہ دیش کی کشش کے حوالے سے جہاں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی جذر کے ساتھ گہرائی بھی پیدا کر دی ہے۔ گولی کی زبان کے مکالماتی اسلوب نے افسانے کے اندر ڈرامے کا لطف بھی پیدا کر دیا ہے۔ اگر دیپک کنول "کنول بندی" میں بندیا کی موت گولی کے بجائے کسی اور طریقے سے دکھاتے تو گل بانو کی انا کا تاثر گہرا ہو کر افسانہ یادگار بن جاتا۔

سجاد نقوی (لاہور)

"انجلی"

ڈاکٹر صفات علوی صاحب علم کیمیا یعنی "زہریلے پودوں کی تقسیم و درجہ بندی" پر لیوڈ پول یونیورسٹی آف برطانیہ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے حامل اردو زبان و ادب کے انتہائی سچے، بے لوث اور بے پناہ محنتی قلم کار ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنی تخلیقات کی نسبت دیگر اہل قلم کی کاوشات کو منظر عام پر لانا اور انھیں مثبت انداز میں تنقیدی نظر سے گزار کر قاری کو متوجہ کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ "انجلی" میں بھی ڈاکٹر صفات علوی صاحب نے "تخزن" میں اشاعت پذیر آغا سعید کے دو افسانے، اطہر رضوی کی تازہ تصنیف "کون عبث بدنام ہوا"، ڈاکٹر افتخار نسیم کی "شہری دنیا سا گر آ تندگی" "سے آ تند" عفت زرین کا تازہ شعری مجموعہ "بے ساحل دریا" سلطانہ مہر بطور فکشن نگار اور فرخ صابری کے دس افسانوں کے تجزیے کے ساتھ ساتھ مغرب میں مقیم اردو کے قلم کاروں کے مسائل، اقبال اور دو قومی نظریہ، مرزا محمد ہادی رسوا کی "امراؤ جان ادا" اور برطانیہ میں اقلیتی کلچر کے حوالے سے اپنے مقالوں میں اس قدر جاں فشانی اور ژرف نگاہی کا ثبوت دیا ہے کہ قاری ان مضامین کو پڑھتے ہوئے خود کو ان کے ساتھ بندھا بلکہ جکڑا ہوا محسوس کرتا ہے۔

کتاب برطانیہ میں تین مختلف مقامات پر چار صد پاکستانی روپوں کے عوض دستیاب ہے آپ کی سہولت کے لئے ہم مصنف کا پتہ درج کر رہے ہیں۔

Dr: Sifat Alvi 21, wimborn drive, allerton, bradford, bd15 7Ah (U.K)

"مٹی کی سانجھ"

طاہرہ اقبال جدید اردو فکشن میں ایک مخصوص کلچر زبان اور اسلوب حیات کی ترجمان بن کر سامنے آئی ہیں۔ ان کی کہانیاں پنجاب کی آب و ہوا، یہاں کی مٹی کی بو باس، موسموں کے رنگ ڈھنگ اور سماجی اتار چڑھاؤ کی بہت قریب سے کھینچی ہوئی تصویریں ہیں ـــــ ڈاکٹر رشید امجد

"جدید فکشن میں طاہرہ اقبال کی شناخت اور انفرادیت مستحکم ہو چکی ہے۔ وہ اردو کے افسانوی ادب کو خوبصورت کہانیوں کے تین مجموعے سنگ بستہ، ریخت اور گنجی بار دے چکی ہیں اور اب "مٹی کی سانجھ" اور رئیس اعظم جیسے دو بھرپور ناولٹ ایک جلد میں پیش کر کے اپنے پھیلتے اور وسیع تر ہوتے فنی اور فکری آفاق کی نشان دہی کر رہی ہیں۔" ـــــ محمد منشا یاد

قیمت: دو صد پچاس روپے دستیابی: دوست پبلی کیشنز پلاٹ ۱۱۰ گلی ۱۵ ، ایکسٹینشن آئی ـ ۹ ـ ٹو اسلام آباد

"نظم اکیسویں صدی"

"بیسویں صدی کے ہمارے بہت سے پیش رو جا چکے ہیں یا جانے والے ہیں۔ ہم اور ہمارے ہم عصر بھی اکیسویں صدی میں بہت دور تک نہ جا سکیں گے۔ اس لئے میں اپنی یہ نظمیں اکیسویں صدی کی اگلی دہائیوں پر محیط قارئین و ناقدین کی نذر اس امید کے ساتھ کرتا ہوں کہ وہ اپنی تمام تر نئی سوچ و وسیع سائنسی نقطۂ نظر اور اپنے عہد کے غیر جانبدار پیمانوں کی کسوٹی پر ان نظموں کو جانچیں اور پرکھیں گے اور ایسا کرتے ہوئے بیسویں صدی میں پیدا ہونے والے میری اس سوچ کا احاطہ کریں گے کہ مجھے یہ نظمیں آج سے سو سال بعد لکھنی چاہیے تھیں۔ کچھ نظمیں بیسویں صدی میں سیلاب آمد کے دوران میں نے بلا عنوان رہنے دی تھیں لیکن اب انھیں بھی عنوانات کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔ شاید اس خیال سے کہ کہیں ان کے لئے ایک اور صدی کا انتظار کرنا نہ ہو" ـــــ پرتپال سنگھ بیتاب

لیجیے صاحب! کسی ادیب ناقد یا مبصر کو زحمت سے دوچار کئے بغیر جناب پرتپال سنگھ بیتاب نے اپنی تازہ تخلیق "نظم اکیسویں صدی" سے اپنے قاری کو کلی طور پر متعارف کرا دیا ہے۔ جناب پرتپال سنگھ بیتاب کی زیر نظر کتاب "کرینٹ ہاؤس پبلی کیشنز ۳۶۷ ـ جوگی گیٹ جموں کشمیر یا ان کے ماسوا تقسیم کنندگان سے تین صد پچاس ہندوستانی روپے کے عوض حاصل ہو سکتی ہے۔